الاصلاح
ہفتہ وار
بمبئی
અઠવાડિક અલ-ઇસલાહ, મુંબઈ

Brilliantly New
FRIGIDAIRE

خانۂ کعبہ میں جشن عیدالفطر!

اقصائے عالم کے مسلمانوں کا اجتماع عظیم خانۂ کعبہ میں عیدالفطر کے دن ایک دوسرے سے گلے مل کر باہمی اخوت و مساوات اور اخلاص و محبت کا اظہار کر رہا ہے

ISMAILI P. PRESS, BOMBAY, 9.

We feel great pleasure to introduce our young artist Mr. Ikbal. All the three colour plates relating to the history of the Moghuls in India and other pictures, printed in the AL-ISLAH I'D SPECIAL show the ability of this young artist.

Mr. Ikbal has inherited the art from his ancestors. His father and Grand-fathers were in touch with the Royal house of Muslim India. His father himself gave him personal training in this art.

Mr. Ikbal intends to give benefit of his work to the public of Bombay and has opened an art gallery at Mahomedali Road. We can say with confidence that he would give every satisfaction in the execution of the work entrusted to him.

(EDITOR)

الاصلاح کے معزز معاونین اور ناظرین سے ہم اپنے نوجوان آرٹسٹ مسٹر اقبال کو متعارف کرانے میں انتہائی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس عید نمبر میں شائع شدہ شاہانِ مغلیہ کی ہر سہ رنگی تصویر مسٹر اقبال ہی کے جنبش قلم کا اعلیٰ..... شاہکار اور فن مصوری کا بہترین کمال ہے۔

مسٹر اقبال پیدائشی مصور ہیں۔ آپ کے والد اور دادا و پردادا کو شاہی مصور ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے ان تجربہ کار اور باکمال مصوروں کے خاندان سے علاقہ اور شرف تلمذ حاصل ہونے کی وجہ سے مسٹر اقبال میں ایک کامیاب مصور کے تمام صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مسٹر اقبال نے حال ہی میں بمبئی میں مستقل سکونت کے خیال سے محمد علی روڈ پر آرٹ گیلری قائم کی ہے۔ مسٹر اقبال سے بسلسلۂ مصوری خدمات لینے والوں کو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مسٹر اقبال مطمئن اور شاد فرمائیں گے۔

ایڈیٹر الاصلاح۔ بمبئی

لائن اور ہاف ٹون بلاک
ڈزائن
فوٹوگراف
اشتہارات
سنیما سلائیڈ
لیبل
لیٹرہیڈ
سرورق

CABLE MESSAGE

TO THE MOSLEM WORLD

FROM

HIS HIGHNESS THE RT. HON'BLE

SIR SULTAN MAHOMED SHAH, THE AGA KHAN

P.C., G.C.V.O., G.C.S.I., G.C.I.E., LL.D., ETC.

CHIEF OF BOMBAY PRESIDENCY

Geneva (Swiss) 25th Aug. 1941 — Time: 9-23 A.M.

Received at Bombay, 27th Aug. 1941 — Time: 8-23 P.M.

EDITOR, AL-ISLAH,
CARE ISMAILI PRINTING PRESS,
BOMBAY, 9.

Convey my message to Moslems on the auspicious occasion of the I'd festival to consider the problem of child welfare and save millions of lives for Islam.

The Prophet has said that all Moslems are his children and therefore let none die by ignorance.

AGA KHAN

جنیوا (سوئٹزرلینڈ)
تاریخ ترسیل ۲۵ اگست سنہ ۱۹۴۱ء ۹/۲۳ (ساعت صبح)
" تحصیل ۲۷ اگست " ۸/۲۳ (ساعت شب)

بنام
ایڈیٹر "الاصلاح"
اسمٰعیلی پریس۔ بمبئی ۹

ہز ہائی نس سر آغا خان

پی، سی، جی، سی، وی، او، جی، سی۔ ایس، آئی، جی، سی۔ آئی، ای، ایل، ایل، ڈی وغیرہ چیف آف بمبئی پریسیڈنسی،

برقیہ پیغام مسلمانانِ عالم کے نام!

عامۃ المسلمین کو عید الفطر کی مبارک و مسعود تقریب پر میرا پیغام پہنچاؤ۔ کہ بچوں کی نگہداشت کا خاص طور پر خیال رکھیں، اسلام کے لیئے لاکھوں جانوں کی حفاظت کریں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے تمام مسلمان میرے بچے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی لاعلمی کی موت نہ مرنے دو۔

آغا خان

سر آغا خان اور ملکۂ معظمہ

ہز ہائی نس سر آغا خاں بالقابہٗ ۲۵ شوال المکرم ۱۲۹۴ھ میں بمقام کراچی پیدا ہوئے آپ کی والدۂ مکرمہ نے آپکا نام احمد رکھا آپکے والد بزرگوار نے آپکو محمد کے پیارے نام سے بلایا اور آپکے دادا نے محمد کیساتھ سلطان کا اضافہ کر کے فرمایا کہ سلطان محمد کو دنیا میں ایک عظیم المرتبت سلطان کی حیثیت و عزت حاصل رہیگی آپ ۶ ذی القعدہ ۱۳۰۲ھ میں اپنے والد بزرگوار کے جانشین کی حیثیت سے اسمٰعیلی گروہ کے امام مقرر ہوئے اور آپکو تخت امامت پر متمکن ہوئے جب ۵۰ سال پورے ہو گئے تو آپکے مریدین نے ہندوستان، برما، سیلون، ایران، افغانستان، عربیہ، شام، سیریا، افریقہ اور جس جس جگہ موجود تھے بصد تزک و احتشام آپکی گولڈن جوبلی منائی، بمبئی اور افریقہ کے شہر نیروبی ان دو مقامات پر آپ کی مریدوں کی جماعتوں نے آپکو سونے میں تولا اور آپکو تولنے کے لئے جو لاکھوں روپیہ کا سونا لتصرف میں لایا گیا وہ آپنے اپنی جماعتوں کو بخشدیا جسے آج بھی تعلیم، زراعت، نوآبادی اور تجارت وغیرہ پر صرف کیا جا رہا ہے۔ اب اسماعیلی جماعتیں آپ کی ۶۰ سالہ ڈائمنڈ جوبلی کیلئے کوشاں ہیں اور ہندوستان، برما اور سیلون کے مریدین ہندوستان اور افریقہ میں گولڈن جوبلی کی طرح ہیروں سے تولنے کی تجاویز پر غور و خوض کر رہے ہیں۔

ہز ہائی نس سر آغا خاں بالقابہٗ کی شخصیت وہ شخصیت ہے جسے ہر حکومت عزت و وقعت کیساتھ پیش آتی ہے اور اقطاع عالم کی تمام سلطنتوں سے آپکے خوشگوار تعلقات ہیں، بالخصوص برطانیہ عظمےٰ کی حکومت میں آپکو جو ارفع و اعلیٰ درجہ اور اعزاز حاصل ہے وہ اس تصویر سے بخوبی ظاہر ہو رہا ہے آپ ملکۂ معظمہ سے انتہائی بے تکلفی کیساتھ گفتگو کر رہے ہیں اور شہنشاہ آپ کی گفتگو کو دلچسپی سے سن رہے ہیں آپ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں اور آج بھی کوشاں ہیں آپ غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام بنانے کے لئے بہ سلسلۂ تبلیغ خطیر رقمیں صرف کر رہے ہیں آپ اپنے اصول کے تحت مسلمانوں کے فرقوں میں تبلیغ سے ہمیشہ محترز رہے ہیں۔ بنا بریں مسلمانوں میں آپ ایک، مقتدر لیڈر جلیل القدر قائد اور رہنمائے اعظم تصور کئے جاتے ہیں۔

ہز ہائی نس سر آغا خاں بالقابہٗ خاندان بنی فاطمی سے متعلق ہیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ۴۸ ویں نسل سے فرزند ہیں آپ کو اہل عالم ایک بہترین انٹرنیشنلسٹ، مدبر، مفکر اور سیاستداں تسلیم کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں واقع شدہ آزاد حکومتوں کی لیگ آف نیشن کے آپ صدر بھی رہ چکے ہیں۔
غرض کہ ہز ہائی نس کی ہمہ صفت موصوف شخصیت کے متعلق بجائے یہ کہنے کے کہ "آپ کیا ہیں"! یہ کہنا یا ثابت کرنا انتہائی مشکل اور دقت طلب ہے کہ "آپ کیا نہیں ہیں"؟

ISMAILI P. PRESS BOMBAY, 9

معز دین اللہ خلیفہ بنی فاطمی اور باشندگان مصر

خلیفہ بنی فاطمی معز دین اللہ کا اصلی نام ابو تمیم معاد ہے اور آپکا لقب معز دین اللہ ہے آپ ۱۱ رمضان المبارک ۳۱۹ھ میں افریقہ میں واقع شدہ شہر قیروان کے قلعہ مہدیہ میں تولد ہوئے اور شوال المکرم ۳۴۱ھ کی چاند رات کو فرقہ اسماعیلیہ کے تحت امامت پر متمکن ہوئے، مورخ مقریزی رقمطراز ہے کہ حکومت مصر کے آئے دن کے مظالم سے رعایا نے تنگ آکر شیخوں کا ایک وفد معز دین اللہ کی خدمت اقدس میں بھیجا اور اس وفد نے باشندگان مصر کی نمائندگی کرتے ہوئے معز دین اللہ کو حکام سلطنت کے مظالم کی داستان سناتے ہوئے درخواست کی کہ ازراہ کرم باشندگان مصر کو اس جابر اور ظالم حکومت کے پنجہ تظلم سے بچالیں جسکے آئے دن کے مظالم رعایا پر عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے ہیں آپنے اس وفد کی درخواست مسترد نہ فرماتے ہوئے غازی جوہر کو ایک لشکر جرار کیساتھ مصر کیطرف روانہ کیا اور جب غازی جوہر نے مصر کا معرکہ سر کیا تو آپ بذات خود مراجعت فرمائے مصر ہوئے، آپ سلسلۂ مسافت جب قابوس، طرابلس، اجدابیہ اور برقہ سے گذرے تو وہاں کی رعایا نے خندہ پیشانی آپکو خوش آمدید کہا، اور آپنے جواباً اظہار مسرت کیا تھا اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے بمقام غیزہ مسافت ختم کی آپ جب غیزہ میں قدم رنجہ ہوئے تو فسطاط کے قاضی، زعمائے شہر اور حکومت کے اعلیٰ حکام نے آپکا شاہانہ استقبال کیا اور انتہائی شان و شوکت کیساتھ آپکو دار الخلافہ کی طرف لیگئے، آپ ابھی شہر میں پورے طور پر داخل بھی ہونے پائے تھے کہ باشندگان شہر نے پاس ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے نعرہ ہائے تحسین و آفرین کی گونج سے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا اور جوں جوں آپ شہر میں داخل ہوتے شہریوں کا ایک انبوہ کثیر جوش اظہار عقیدت و مودت میں آنکھیں بچھاتا رہا لیکن جب آپ بازار میں پہونچے تو درویشوں اور شرفاء کا ایک وفد ایستادہ اور دست بستہ عرض پرداز ہوا کہ ہم آپکی تشریف آوری پر انتہائی مسرور اور محظوظ ہیں بعدہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپکی حکومت کا اصل مدعا کیا ہے؟ آپنے وفد کے اس استفسار کے جواب میں میان سے تلوار نکالتے ہوئے فرمایا کہ جو بدطینت غدار اور بیوفا لوگ ہیں انھیں اس تیغ جوہر دار سے انکے کیفر کردار کو پہنچا دونگا اور جو لوگ وفادار نیک طینت اور خیر خواہ ہیں انھیں (اشرفیوں کو لٹاتے ہوئے فرمایا) ہمیشہ کیلئے آسودہ، خوشحال اور مالامال کر دونگا، آپکے اس دلخوش کن حوصلہ افزا اور مشفقانہ جواب سے اراکین وفد انتہائی خوش و خرم ہوئے اور چشم زدن میں یہ بات عوام کے کانوں تک پہونچی کہ ہمارا موجودہ بادشاہ ظالم و جابر نہیں ہے بلکہ انتہائی خلیق، سخی، بہادر اور مخیر ہے جامعہ ازہر جو مصر کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے اور جسکی ہزار سالہ جوبلی منانے کیلئے اقصائے عالم کے مسلمان آمادہ و مستعد ہیں آپ ہی کے عہد حکومت میں اسکی بنیاد ڈالی گئی تھی آپنے اپنی ۴۶ سالہ زندگی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان سے تاریخ بین و تاریخ داں طبقہ بخوبی واقف ہے۔

آپنے ۱۱ ربیع الآخر ۳۶۵ھ میں بمقام مہیس وفات پائی اور آپکو القاہرہ میں دفن کیا گیا۔

ISMAILI P. PRESS BOMBAY, 9

بروقت یاد دہانی
روزمرہ کی زندگی میں اکثر اوقات ہمیں ایسی بیوہ عورتوں اور بچوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جنہیں اپنی زندگی کے لئے سخت جد وجہد کرنا پڑتی ہے اور یہ صرف اس وجہ سے کہ ان لوگوں میں جن پر ان کا بار تھا اتنی پیش بینی نہ تھی کہ موت کی صورت میں جس کا پیش آنا ناگزیر ہے اس کے لئے معقول انتظام رکھتے !!
تقریباً
سوا چوبیس ۲۴¼ کروڑ روپیہ
اورینٹل اپنے ہزاروں بیمہ داروں کے احسانمند ورثاء کو ان کی عین ضرورت کے وقت ادا کر چکی ہے
جاری بیمے :- تراسی ۸۳ کروڑ روپیہ سے زائد
۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء کا سرمایہ
ساڑھے ستائیس ۲۷½ کروڑ روپیہ سے زائد!
کیا آپ نے اس بات کا ٹھیک سے انتظام کر لیا ہے کہ آپ پر جن لوگوں کی کفالت کا بار ہے وہ آپ کے انتقال کے بعد اپنی زندگی آزادی کے ساتھ بسر کر سکیں گے؟
اگر آپ نے ایسا نہیں کیا ہے تو
اورینٹل کا بیمہ
کرانے میں دیر نہ لگایئے اور اس طرح پر اپنے عزیز و اقربا کی مالی آزادی کا سامان فراہم کیجئے
جلد یا بدیر ہر شخص ناقابل بیمہ ہو جاتا ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب! لہذا تاخیر نہ کیجئے اپنی زندگی کا بیمہ اورینٹل میں کرایئے جہاں سال بسال بیمہ داروں کی کثیر تعداد اپنا بیمہ کراتی ہے ہمارے بیمے کی نہایت دلکش اسکیموں کے لئے لکھیے۔
منیجر:- اورینٹل
گورنمنٹ سیکورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹیڈ۔ اورینٹل بلڈنگز۔ بمبئی
ORIENTAL GOVERNMENT SECURITY LIFE
ASSURANCE COMPANY LTD.,
ORIENTAL BUILDINGS. FORT. BOMBAY.
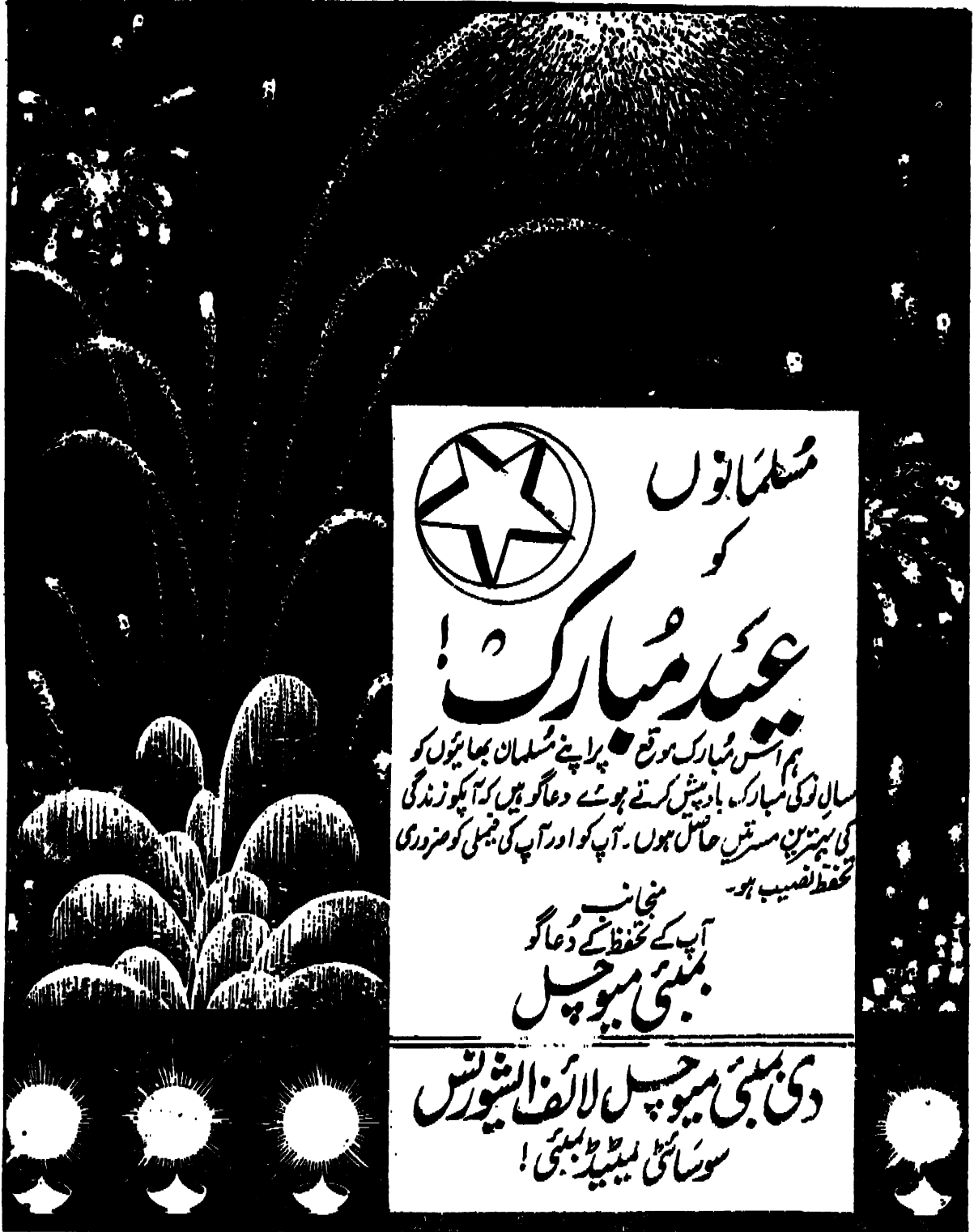
مسلمانوں
کو
عید مبارک!
ہم اس مبارک موقع پر اپنے مسلمان بھائیوں کو
سالِ نو کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعاگو ہیں کہ آپکو زندگی
کی بہترین مسرتیں حاصل ہوں۔ آپ کو اور آپ کی فیملی کو ضروری
تحفظ نصیب ہو۔
منجانب
آپ کے تحفظ کے دعاگو
بمبئی میوچل
دی بمبئی میوچل لائف انشورنس
سوسائٹی لمیٹیڈ بمبئی!
The Bombay Mutual Life Assurance Society, Ltd., Bombay.

قیمت دو روپیہ (عہ)

فہرست مضامین!

قیمت دو روپیہ (عہ)

الاصلاح عید الفطر نمبر

جلد نمبر (۴) — سنہ ۱۹۴۱ء — سنہ ۱۳۶۰ھ — جلد نمبر (۴)

اتحاد بین الملی اور ہندوستان

اس سے قبل کہ ہم محولہ بالاعنوان پر خامہ فرسائی کریں، ناظرین و ناظرات الاصلاح کو عید الفطر کی مبارکباد دیتے ہوئے اپنی اس حقیر پیش کش کو بایں توقع پیش کرتے ہیں کہ ملک کے چپے چپے میں اسے شرف پذیرائی حاصل ہوگا۔ اور ہم نے جس مقصد، غرض و غایت اور مطمح نظر کے تحت عید نمبر کا تاریخی تصاویر پر بیدریغ روپیہ صرف کیا ہے۔ اہل ملک اسے سمجھنے کی سعی فرماتے ہوئے اسی اخوت لعدو واداری، اتحاد و اتفاق اور بھائی چارہ کا جذبہ پیدا کرکے اپنی سو سالہ نسل کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھنے کے لئے آئندہ کی سر پھٹول، بغض و عناد، ناچاقی و نااتفاقی اور کدورت تنفر سے احتراز فرمائیں گے۔

زیر نظر عید نمبر میں ادارۂ الاصلاح نے شاہان مغلیہ کی تصاویر شائع کرکے سلطنت مغلیہ کے ..... وہ نقوش کہنہ پیش کئے ہیں کہ جب ہندوستان کی دو معزز قومیں بحیثیت حاکم و محکوم ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و یگانگت سے پیش آتی تھیں اور نہ صرف یک جہتی و یگانگت ان کا شیوہ تھا بلکہ وہ باہمگر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھیں اور تمدنی و معاشرتی اور مذہبی اعتبار سے بھی ان میں کوئی بھید بھاؤ یا چھوت چھات وغیرہ کا جھگڑا نہ تھا ان میں کا ہر فرد انسانی ہمدردی اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اور بدمست تھا اور ان کی زندگی کا نصب العین یا نظریہ بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ہنسی خوشی ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر زندگی کے دن گذارے جائیں اور اپنے وطن کی آن پر حرف نہ آنے دیں۔ اگر ہم سرسری طور پر شائع شدہ تصاویر پر ہی نظر ڈالیں گے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مادی ضروریات، مذہبی رسومات اور زندگی کے وہ تمام جھگڑے اور بکھیڑے اس زمانہ میں بھی موجود تھے۔ جو فی زمانہ ہمارے لئے باعث ہزیمت اسباب نفاق بنے ہوئے ہیں اور جو ہر ہر قدم پر ہمیں زک پہنچا رہے ہیں۔ شہنشاہ اکبر، جہانگیر، ہندو خواتین کو اپنے حرم سرا میں داخل کیا خواہ سیاسی اعتبار سے کچھ بھی اہمیت کیوں نہ رکھتا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اتحاد و یگانگت کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا اور نہ تمدن و معاشرت اور مذہب کے اختلافات بجز اس کے دور کئے جا سکتے تھے اکبر کے بعد جہانگیر کا کنور کرن سنگھ سے بزرگانہ اور مشفقانہ برتاؤ کہ حرم سرا میں شہنشاہ بیگم سے مشرف بہ ملاقات کراتے ہوئے اسے خلعت فاخرہ سے سرفراز فرمایا، یقیناً تمدن و معاشرت کی ان تمام پابندیوں اور قیود کو توڑ دیتا ہے جو آج کل ہمارے لئے انتہائی مشکلات پیدا کئے ہوئے ہیں اور جن کی موجودگی سے قومی عصبیت و تنگ نظری ہم میں نشوونما پا رہی ہے اسی طرح عالمگیر کا سیوا جیسے کٹر دشمن سے رحم و کرم کا سلوک اس امر پر کافی روشنی ڈالتا ہے کہ یقیناً ان لوگوں کا نظریۂ حیات بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ زندگی کو باہمگر شیر و شکر رہ کر گذارنا ہے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا اور ایک دوسرے کا غم بٹانا فریضۂ انسانی میں شامل ہے۔

ازمنۂ قدیم کے ہندوستان یا عہد سلطنت مغلیہ کے ان دھندلے نقوش کے پیش نظر جب ہم عصر حاضر کے ہندوستان یا موجودہ اقوام ہند کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں حیرت کیساتھ انتہائی رنج اور تاسف بھی ہوتا ہے کہ آخر ان قوموں کے افراد کو کہ جو اپنا نظریۂ حیات باہمدگیے شیر و شکر بتاتے تھے۔ اور جو تمدن و معاشرت، مذہب و ملت اور ذات پات کے اختلافات سے کوسوں دور رہتے تھے۔ آج یہ کیا ہو گیا ہے۔ کہ ایک دوسرے کے خون

کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ نفاق و افتراق کو معیوب نہیں سمجھتے اور اپنے ہموطنوں کو حقارت و نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ یہی قومیں جو آج ایکدوسرے کو ہندو مسلم یا سکھ و پوتر قوم کہہ کر تخاطب کرتی ہیں اس زمانے میں بھی ہندوستان کی مالک و مختار نہیں۔ مگر اس زمانہ میں اگر وہ آپس میں بیر یا نااتفاقی سے پیش آئیں تو بہت ممکن تھا کہ ان کا یہ فعل کسی حد تک مناسب سمجھا جاتا۔ کیونکہ اسوقت ان کی حالت بحیثیت حاکم و محکوم کی سی تھی اور حاکم و محکوم میں رنجش یا اختلاف کا ہونا یقینی ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ جبکہ دونوں میں سے کسیکو بھی حاکم ہونے کا اعزاز حاصل نہیں ہے اور ایک تیسری ہی قوم ہم پر حکمراں ہے تو ہمارا بیر، ہماری نااتفاقی اور ہمارے ایکدوسرے کے خلاف اشتعال انگیز مظاہرے کیا معنی و حقیقت رکھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ آخر کس لئے کیا جارہا ہے؟

موجودہ زمانہ جسقدر نازک اور مصلحت آفریں دور سے گذر رہا ہے اس کا اقتضاء یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی طاقت اور اپنا شیرازہ آپس ہی میں لڑ بھڑ کر منتشر کردیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے محکوم و غلام بنائے رکھیں وقت کا اقتضاء تو یہ ہے کہ ہم اپنے غیر متحد نظام اور اپنی منتشر طاقت کو سمیٹ کر ایک متحدہ مرکز پر لانے کی سعی کریں اور ان ہولناک زمانہ کے مقابلہ کے لئے تیار رہیں جو ہماری زندگیوں کو موت کی نیند سلا سکتے ہیں، اور جن کی زد سے محفوظ رہنا ہمارے لئے ناممکن ہے اگر ہم اب بھی اپنی جبلت و عادت کے مطابق ان مخمصوں میں پڑے رہیں گے اور اقتضائے وقت سے روگردانی کرتے ہوئے قومی عصبیت اور باہمی منافرت کو خیرباد نہ کہیں گے تو نہ صرف ہم میں سے ہر ایک تباہ و برباد ہوجائے گا۔ بلکہ ہمارا مقدس و پیارا وطن جسے جنت نشان کہا جاتا ہے ہمیشہ کے لئے آماجگاہ شر و فساد بن کر رہ جائے گا اور پھر شاید زمانہ ہمیں اتنا موقع یا مہلت نہ دے گا کہ ہم ابھر سکیں یا اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور اپنا گم گشتہ وقار حاصل کرسکیں۔

ہز ہائی نس سر آغا خاں بالقابہ یہ ہزار تیقن یہ تسلیم کر چکے ہیں اور ان کا یہ فرمان ہے کہ "دیر یا سویر بوقت ضرورت بہ شدید ضرورت ہندو مسلمانوں کو اپنے باہمی اختلافات دور کرنے ہوں گے اور دونوں قوموں کو متحد طور پر سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔ کیونکہ وہ ایک ہی سفینہ پر سوار ہیں۔ ایک ہی کشتی کے کھویا ہیں لہذا ان کا بیک وقت اور ایک ساتھ تیرنا اور ڈوبنا لازمی اور لابدی ہے۔ اور بجز اس کے ان کے لئے کوئی اور چارہ کار بھی نہیں ہے۔"

ہز ہائی نس سر آغا خاں بالقابہ کا یہ فرمان سیاسی اعتبار سے کس قدر وقیع اور دور اندیشی پر مبنی ہے اسے کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو سیاسی فضا میں پرورش پاتے پاتے ہر باریک سے باریک نکتہ کو سمجھنے کے عادی ہوچکے ہیں ہز ہائی نس نے ہندو مسلم کو ایک ہی ناؤ کے سیاح کہہ کر جس لطیف اور پاکیزہ اشارہ آمیز کنایہ سے کام لیا ہے اسے بھی صرف وہی ہستیاں زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں کہ جن میں صحیح شاعرانہ وجدان بذوق لطیف اور اس قسم کے اشارات و کنایات سمجھنے کی صلاحیت و استطاعت بدرجہ اتم موجود ہے اور جن کے گوش اس قسم کے اشارات سے آشنا ہیں، تاہم ہم یہاں مختصراً اتنا ضرور عرض کریں گے کہ موصوف نے موجودہ ہندو مسلم تنازعات کے انسداد کا ایک ایسا عمدہ اور بہترین حل بتایا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی حل مفید اور کارآمد نہیں ہوسکتا اور نہ کسی دوسرے طریق کار سے موجودہ الجھی ہوئی گتھی سلجھ سکتی ہے۔

از منۂ قدیم اور عصر حاضر کے تفاوت و اختلافات کے موازنہ کے بعد ہندوستانی عوام سے یہ ہندو اپیل کرتے ہیں کہ اقتضائے وقت اور موجودہ جنگ کی شعلہ سامانیوں کے پیش نظر جو نہ صرف ایشیا میں داخل ہوچکی ہیں بلکہ ہندوستان بھی ان کی آنچ سے جھلس رہا ہے اپنے باہمی اختلافات دور کرتے ہوئے اپنی تمام توجہات ایک ہی مرکز کی طرف مبذول کریں اور متحدہ نظام عمل کے تحت اندرونی و خارجی مسائل کا حل تلاش کرکے نہ صرف اپنے وطن کی بلکہ اپنی جان و مال کی حفاظت کریں جو بغیر اتحاد باہمی کے ناممکن ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہندوستانی عوام ہماری یہ اپیل رائیگاں نہ جانے دیں گے۔ اور اس نمبر میں جو تصاویر شائع کی گئی ہیں ان کے حسن و قبح سے سبق حاصل کرکے اپنے مابین اتحاد و اخوت اور رواداری و مساوات کا ایسا مضبوط رابطہ پیدا کریں گے کہ جسے ہم اپنی محنت و جانفشانی کا صلہ سمجھیں اور دنیا کو ہندوستانیوں کا تمسخر اڑانے کا موقع نہ رہے۔

سہارا! محترمہ شفیق بانو صاحبہ شفق مدیرہ خاتون مشرق دہلی کے اکیس افسانوں کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے جس کا دیباچہ مسٹر آصف علی بیرسٹر ممبر اسمبلی نے لکھا ہے۔

محترمہ موصوف کے افسانوں کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ ان کے زور قلم اور اسلوب بیان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ کو جو شہرت مختصر افسانہ نویسی میں حاصل ہے وہ بھی محتاج بیان نہیں۔

کتاب بہت عمدہ چھپی ہے۔ ضخامت (۱۴۸) صفحے اور قیمت صرف ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: شفیق بانو شفق مسجد جامع۔ نجیب آباد

نوٹ۔ ہمیں سہارا کی جلد بہت ہی تاخیر سے موصول ہوئی اس لئے وقت کی کمی اور عدم گنجائش کی وجہ سے ہم زیر نظر اشاعت میں ان پر سیر حاصل تبصرہ نہ کرسکے جس کا ہمیں انتہائی افسوس ہے۔ لیکن انشاء اللہ تعالے آئندہ اشاعت میں ہم اس کی تلافی کردیں گے۔

سکندر! ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۱ء کو دسہرہ کے مبارک دن منروا مووی ٹون کے تاریخی شاہکار فلم "سکندر" کا بیک وقت تین سینماؤں میں افتتاح ہوا اور جس پر جوش طریقہ سے بمبئی کی پبلک نے اس فلم کا خیر مقدم کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

فلم بین اصحاب نے سکندر کو بہترین فلم قرار دیا ہے۔ فلمی فضا اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور ہندوستان کی فلمی صنعت اس پر بجا طور پر فخر کر رہی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ سکندر نے یہ ثابت کردیا ہے۔ کہ قدیم ہندوستان بڑی عظمت اور شوکت کا مالک تھا اور ہندوستان کی فلمی صنعت اس قدر بلند رکھتی ہے کہ وہ اس عظمت کو پردۂ سیمین پر پورے جاہ و جلال کے ساتھ پیش کرسکے۔

سکندر دیکھنے کے بعد بمبئی کے انگریزی اور اردو نیکلر پریس کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ سہراب مودی نے یہ فلم بنا کر فلمی صنعت میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے سکندر کا افسانہ قومی اور ملکی جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے مکالمے حب الوطنی کے خوابیدہ احساسات کو بیدار کرنے کے لئے تیر و نشتر کا کام دیتے ہیں فلم کے گانے وجد آفریں۔ نغمے دلربا۔ سنانظر فوٹوگرافی اور سٹینگ اپنی مثال آپ ہیں۔

ترانۂ معرفت!

(از حضرت ایچ کے غضنفر امروہوی ایم، اے، گولڈ میڈلسٹ ۔ ۔ ۔ ۔)

کون و فساد دہر ہے مجموعۂ علل ॥ یعنی ابد ہے لمحۂ زائیدۂ ازل!

ماضی کا نقش ہے آئینۂ حال میں ○ تقسیم جزو لایتجزیٰ خیال میں!

کون و مکاں میں روح رواں شعور ہے ॥ اک عقل کل مدبر عالم ضرور ہے!

ہے علت العلل وہی اک واجب الوجود ॥ نیرنگ آب و گل چمنستان ہست و بود!

سر چشمۂ حیات کا فیضان بے پناہ ○ ہر ایک موج زندگی عرش پائگاہ

کثرت گہ شہود میں وحدت ہے جلوہ گر ॥ نیرنگی صفات کا مظہر ہیں بحر و بر

خوف غضب ہے مدغم امید مغفرت ॥ گرداب میں ہے کشتیٔ تمہید معرفت

عرفان عین ذات کچھ اسکے سوا نہیں ○ یعنی خدا ہے اسم مسمیٰ خدا نہیں!

معلوم اس کی ذات ہے عالم بھی خود وہی ॥ خارج نہیں ہے ذات مقدس سے علم بھی

بیدار زندگی ہے غضنفر کی رائے میں!

اک آفتاب ہستی مطلق کے سائے میں!

سر آغا خان بالقابہ

از جناب آغا محشر صاحب شیرازی مدیر برق بمبئی

مشرق کی کائنات تمدن کا شاہکار ○ مغرب کی کائنات سیاست کا رازدار
دنیائے علم وفہم وفراست میں نامدار ○ اقلیم خلق وجود وکرامت کا تاجدار

آنکھوں سے اپنی دیکھ رہا ہے جہاں کے رنگ
انسانیت کی خون میں اپنے لئے اُمنگ

خاموشی لفظ صبر کی تفسیر کی طرح ○ پرجوش انتقام کی شمشیر کی طرح
اک منزل سکون میں تصویر کی طرح ○ روشن شعاع مہر کی تنویر کی طرح

زیر نظر مناظر ہستی لئے ہوئے
کونین کی بلندی و پستی لئے ہوئے

جنبش یہ ہے لبوں کی مسلسل کوئی دعا ○ یا بارگاہ قدس میں مخصوص التجا
حل کر رہا ہے حمد کی صورت میں مدعا ○ اک باسپاس قوم کی کشتی کا ناخدا

وہ جس کی ہر دعا میں اثر ہی بھرا ہوا
وہ آج تک جو حاصل ہر مدعا ہوا

ہے جس کا نام نام محمد سے ضوفشاں ○ اس طرح جیسے چاند ستاروں میں ہو عیاں
ہے شاہ فاطمیوں کا دنیا میں بیگماں ○ رہبر وہ اپنی قوم کا یعنی سر آغا خاں

جو کچھ کہ اُس کے دل میں ہے پوری امید ہو
محشر مبارک اُسکو یہ عید سعید ہو

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید!

خاص الاصلاح عید الفطر نمبر کے لئے

از جناب آغا محشر صاحب شیرازی مدیر برق بمبئی

مذکورۂ بالا عنوان کو خاص طور سے منتخب کرتے ہوئے اس پر اظہار خیال اور خامہ فرسائی سے میرا کیا مقصد ہے۔ یہ کسی مل طلب عنوان کو سرسری نظر سے دیکھنے کے عادی حضرات جب تک میرے مضمون کو سرتاپا بغور و خوض ملاحظہ کرنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں گے ان کو اس کا مفہوم نظر آسکے یہ ایک بڑی حد تک دشوار ہوگا۔ انقلاب کی وہ گزشتہ فتنہ آرائی جس سے دنیا کی کوئی حکومت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جنگ عظیم کے قاتل عالم روپ میں جب اس نے جرمنی کے جنگی دیوتا کی شکل و صورت میں جنم لے کر فرزندان نبی آدم اور مسیح کو تہذیب و تمدن امن و انسانیت، عدل و انصاف کی نعمت عظمیٰ سے منہ موڑنے پر مجبور کیا تھا۔ اس وقت مشرق و مغرب کے سیاستدان جنگ عظیم کی شطرنج پر جو بازی لگائے ہوئے تھے وہ تاریخ جنگ عظیم کے ان خونی اوراق سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ جنھیں فاتح اور مفتوح اقوام اور حکومتوں کے مدبر رہنماؤں نے امن عالم کو برقرار رکھنے کے لئے انسانی خون کے دریاؤں نہیں سمندروں کی بھینٹ چڑھا کر اپنے دستخطوں سے سرخروئی کا شرف بخشا تھا۔

جرمنی کی وحشی اور درندہ قوم کے تاجدار قیصر ولیم نے جنگ عظیم کی بنیاد دنیا میں اپنی بربریت و وحشت کا ثبوت پیش کرنے کے لئے ضرور ڈالی تھی مگر اس کا نتیجہ بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی آفتاب کی نورانی وسعتوں پر حکمراں امن عالم کی طالب انگلستان کی مہذب و متمدن ملت کا تاجدار شہنشاہ جارج پنجم آنجہانی کا لشکر جرار جرمن کے وحشی انسانوں کے بے شمار لشکر پر غالب ہوا۔ اور قیصر جرمنی کو جو فاتح عالم بننا چاہتا تھا برطانیہ کے فاتح اعظم حکمراں کے آگے اپنا سر پر سرکشی سر صلح کے لئے جھکانا پڑا اور جنگ عظیم برطانیہ عظمیٰ کے تاجدار کی صلح پسندی کو تاریخ کے صفحہ پر ایک غیر فانی یادگار کی صورت میں چھوڑ کر ختم ہوئی۔ اسی عالمگیر جنگ میں جہاں مشرق و مغرب کے بڑے بڑے سیاست داں اپنی سیاست و فراست کے بیش بہا جوہر دکھاتے ہوئے پیش کئے گئے ہیں۔ تاریخ ہندوستان کے اس ایرانی نژاد سیاست داں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ جس کا نام نامی و اسم گرامی سر سلطان محمد شاہ آغا خان کے نام سے صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" بلاد مشرق اور یورپ میں بھی آفتابی شہرت و عظمت کا حامل تھا۔ جس کی پاک رگوں میں فاطمی خون کی پرجوش لہریں موجزن تھیں۔ جس کے افکار بلند میں اس سیاست کا جوہر جلوہ افروز تھا جسے نبی فاطمی تاجداروں کی عظیم الشان سیاستدانی کا غالب کل غالب جوہر کہہ سکتے ہیں۔

فرزندان اسمٰعیل میں فخر روزگار دنیا کے لاکھوں نہیں کروڑوں.. اسمٰعیلیوں کا روحانی تاجدار دولت انگلیشیہ کا بہی خواہ ہی نہیں بلکہ یار غار، دول خارجہ اسلامیہ کا معین و مددگار برطانوی تاجدار کی بہی خواہی دوستی اور رفاقت میں لائق صد آفریں و ستائش خدمات کے ساتھ ساتھ جب اور جہاں کہیں اسے موقع ملا ہے۔ خواہ وہ حجاز و عرب کی مقدس سرزمین میں بسنے والے غیور عربوں کے لئے ہو، خواہ یورپ میں آباد شجیع و بہادر ترکوں کے لئے ہو۔

حیدر کرار چوں بشگافت قلب کارزار　　آمدہ روح الامیں گویا بحکم کردگار
اے زہے فتحے کہ از دست خدا شد آشکار　　لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار

کہتے ہوئے اس نے ان کی رہنمائی و رہبری آڑے وقت میں اپنا فریضہ اخوت اسلامی سمجھ کر کی اور انہیں آناً فاناً اپنی سیاست فراست سے تباہی و بربادی کی خوفناک زندگی کو مجبوراً اختیار کرنے سے بچا لیا ہے۔ چنانچہ مصنف حبل اللہ المتین ملی محمد جان محمد چنارا صاحب کی تحریر سے جو مذکورہ تصنیف بلیغ کے صفحہ ۶۸۵ پر جلی حروف میں شائع کی گئی ہے یہ واضح ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں ہز ہائنس سر آغا خان نے ترکی صلح نامہ کی شرائط پر اپنا پورا وقت صرف کرکے ترکی قوم کو ذلت سے بچاتے ہوئے اس صلح نامہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر ایک عظیم الشان تاریخی کارنامہ پیش کیا تھا جس کو دیکھ کر مشرق و مغرب کے مشہور سیاست داں اور ساکن وانگشت بدنداں ہو گئے تھے۔ اس صلح نامہ کی تکمیل کے ساتھ

حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر　　خار وطن از سنبل ریحاں خوشتر
یوسف کہ بمصر بادشاہی میکرد　　میگفت گدا بودن کنعاں خوشتر

ہندوستان اور ہندوستان کے حقوق کی ضمانت آپ نے جس شان سے کی وہ اظہر من الشمس ہے۔ بقول مصنف حبل اللہ المتین آپ نے ایشیا مائنر کی برطانوی حکومت کے بارے میں اپنا قیمتی خیال ظاہر کرتے ہوئے ایشر رپورٹ کے مدنظر جو کچھ فرمایا تھا کہ حکومت موجودہ کا مسلک تنظیم و سیاست بالآخر ہندوستان کو نوآبادیات کا درجہ دلاکر رہے گا اور اس ملک کے بارے میں حکومت برطانیہ عظمیٰ کے وزرائے محترم نے جو وعدہ وعید کئے ہیں۔ ان کا اس ملک میں اعتبار کیا جائے گا۔ وہ "قیاس کن ز گلستان من بہار مرا" ایک بڑی حد تک کامیابی کے اعلیٰ مدارج طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس کے ثبوت میں صوبہ جاتی وزارتوں کی تشکیل پیش کی جا سکتی ہے۔ رہا۔ میسوپوٹامیا (عراق) کا سوال اس کے بارے میں آپ نے حکومت برطانیہ کے ارباب حل و عقد کو مخاطب کرتے ہوئے یہی فرمایا تھا کہ برطانیہ عظمیٰ کو اس سے غیر جانبداری کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اور ان ملکوں پر

برٹش اور ہندی لشکروں نے جو قبضہ حاصل کیا ہے اُس سے انہیں نجات ملنا چاہئے۔ ایران کی نسبت بھی جو آپ کے مقدس و محترم آبا ؤ اجداد کا پیدائشی مرکز ہے۔ اس میں برطانیہ ہندوستانی لشکر کی کارروائی سے جو کچھ مداخلت کرتا ہے اس طرح نہ ہونا چاہئے۔ مگر وہ گذشتہ جنگ عظیم کا وہ زمانہ تھا جب یہ قیمتی اور مخلصانہ خیالات آپ نے اپنی رفیق حیات حکومت کے روبرو مصلحتاً پیش کئے تھے۔ اور ایران و عرب کے مسلمان حکمرانوں کی انتہائی ہمدردی میں اور اس دور کی سیاست کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اگر موصوف اس جنگ کے دور میں جو جرمنی نازیوں کے وحشی قائد ہر ہٹلر کی ہوس عالمگیری کا خوفناک نتیجہ ثابت ہو رہی ہے۔ کبھی حسن اتفاق سے لب کشائی کرتے اور ان کی یہ طویل خاموشی جوان کی زندگی بھر کی دوست حکومت برطانیہ کی بالآخر فتح کا عظیم الشان راز لئے ہوئے ہے۔ کہیں سیاسی تدبیر و تقریر میں منتقل ہوتی تو وہ یقیناً جرمنوں کی وحشت و بربریت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر حکومت برطانیہ عظمٰی کو جس طرح اس نے مصلحتاً سیریا اور عراق پر عربی ممالک کو جرمنوں کے حملے سے بچانے کے لئے قبضہ کیا ہے۔ اور نازیوں کے ایجنٹ رشید علی کے فریب سے انہیں نجات دلائی ہے۔

ایران کی اُن مفید مطلب حدود پر بھی عارضی قبضہ کا مشورہ دینے میں کبھی تامل نہ کرتے جن سے حکومت برطانیہ اپنی رفیق جنگ روسی حکومت کی جرمن نازیوں کے مقابلہ میں آلات حرب و رسد کی فرستادگی سے حسب وعدہ اعانت کا فریضہ ادا کر سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کو بھی جرمن نازیوں کے بربریت و ہوس حملے سے بچا سکتی ہے۔ جہاں تک ضرورت حال کے مدِّنظر روسی حکومت سے تعاون کے سلسلے میں ایران کی بعض مفید مطلب حدود پر برطانیہ عظمٰی کے عارضی قبضہ کا تعلق ہے اگر یہ کہا جائے کہ حکومت برطانیہ کے مدبرین اور سیاستدانوں نے یہ سب کچھ اپنے دوست حکومت جمہوریہ ترکی کے قائد اعظم جنرل غازی عصمت انونو کے مشورہ سے کیا ہوگا جو ایران سے بھی گہرے تعلقات رکھتے ہیں۔ اور اس کے بہی خواہ ہیں تو اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اور اسلامی عرب ممالک کے ساتھ ہندوستان کی بہترین طریقہ پر مدافعت کے سوال کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بھی ہر کس و ناکس کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ واقعی ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اس حاصل مطلب اور وقتی قبضہ پر جس میں حکومت ایران و ملت ایران کا مفاد بھی مضمر ہے۔ ایران کے تاجدار نے صلح کو بیکار کی خونریزی پر ترجیح دے کر جس صبر و استقلال اور صلح پسندی کا ثبوت دیا ہے وہ اس کا تاریخی کارنامہ کہا جائے گا۔ حکومت و ملت ایران کے لئے غور کیا جائے تو نازی جرمنی وحشیوں سے سو فیصدی بہتر برطانوی حکومت کا دوستانہ تعلق کہا جا سکتا ہے۔ جسے قدرت نے پیدائشی تدبر و تنظیم کی بیش بہا قوت.. عنایت کی ہے۔

ایران سے جو کچھ صلح کی شرائط طے ہوئی ہیں۔ ان سے بھی صاف ظاہر ہے کہ حکومت برطانیہ اس کی مملکت اس کے وقار سلطنتی اور نظام عمل میں بیجا مداخلت کی طالب نہیں ہے۔ نہ اسے اُس کی مفید مطلب حدود پر ابدی قبضہ جمانے کی خواہش ہے۔ روسیوں کو سامان رسد پہنچانے اور ہندوستانی و عربی ممالک کو بچانے کے لئے یہ وقتی مداخلت و کارروائی مناسب وقت اور ضروری سمجھ کر کی گئی ہے۔ جب یہ جنگ عظیم برطانیہ کی فتح سے پھر امن و آزادی میں بدل جائے گی۔ ایران کو جو آزادی حاصل تھی۔ وہ پھر حاصل ہو جائے گی۔

گذشتہ جنگ عظیم کی ابتداء
اور انگریزی اخبارات میں سر آغا خان کی مدح سرائی

سنہ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ میں جنگ عظیم کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہٗ افریقہ کے مشہور شہر زنگبار میں اقامت پذیر تھے۔ یورپ کے اس موقع پر پیمانگی بیمار ہوتے ہی آپ حکومت برطانیہ عظمٰی کی معاونت کے لئے فوراً یورپ روانہ ہو گئے تھے۔ لندن میں پہونچکر آپ نے دوران جنگ میں اپنے خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ میں سپاہیانہ تعلیم حاصل نہ کر سکا تاہم ادارہ جنگ یعنی (وار آفس) اگر میری عملی خدمات کو منظور کرے تو میں خوشی سے جنگ کے مورچہ پر جا کر دشمن پر فتح حاصل کرنے کیلئے برطانیہ عظمٰی کے حق میں اپنا آخری خون کا خطرہ تک بہانے کے لئے تیار ہوں چنانچہ لندن کے مل رہا می انگریزی روزنامے نے آپ کے اس دوستانہ جذبہ کی قدر کرتے ہوئے آپکے بارے میں خاص طور سے لکھا تھا کہ آپ برطانیہ عظمٰی کے سچے دوست اور وفادار ہیں۔ جو شخص آنکھ کے اشارے پر دو کروڑ نفوس بنی آدم کو اپنے زیر اثر رکھ سکتا ہو اس کے احساس مہمانہ اور جذبۂ وفاداری کے اظہار سے یہ اندازہ فوری لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنا بڑا دوست اور کتنا وفادار انسان ہو سکتا ہے

ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہٗ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی نسلاً بعد نسلاً اولادیں سے ہیں۔ ہندوستان۔ افغانستان۔ ایران۔ عراق و عرب۔ ملک شام اور افریقہ میں ہزاروں کیا لاکھوں آدمی آپ کو اپنے ایک روحانی پیشوا اور مظہر اقدس کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہٗ نے اگر حقیقت سے چشم پوشی نہ کی جائے تو گذشتہ جنگ عظیم کے موقعہ پر حکومت برطانیہ عظمٰی کی جو کچھ درمے قدمے سخنے خدمات کے بیش بہا فرائض انجام دیتے ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ علٰی ہذا القیاس اس جنگ میں بھی آپ اسی طرح اپنی جان و مال اور اولاد سے برطانیہ عظمٰی کی خدمت میں ایک عزیز ترین دوست کی حیثیت سے ہمہ تن مصروف ہیں۔

آپ نے اس جنگ میں ایک طولانی خموشی کیوں اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے بارے میں ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں۔ "خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید" آپ کی اس خموشی میں بھی کوئی ایسا راز پنہاں ہے جو آپ کی دوست حکومت برطانیہ عظمٰی کے لئے بالآخر فتح و نصرت کا پیغام ثابت ہوگا۔ اور آپ کی اس خاموشی کو ایک وسیع الخلقت قوم کے روحانی پیشوائے اعظم کی حیثیت سے ہمیں آپ کی ایک خاموش اور پُر خشوع عبادت تصور کرنا چاہئے:

ہراساں ہونے کی بات نہیں۔ آپ اپنے شہر کے مندرجۂ ذیل ہر دلعزیز اور مشہور ہوٹل میں تشریف لائیے۔ جہاں خالص گھی کے مختلف النوع طعام مثلاً مرغی روسٹ۔ مرغی فرائی۔ مرغی بریانی۔ مسالہ دار پلاؤ۔ مٹن روسٹ۔ دودھ کا پایا۔ شامی کباب۔ کٹلیس اور سموسے وغیرہ لذیذ اور تازہ بتازہ آپ کی مرضی کے مطابق دستیاب ہوں گے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ ایکبار ان چیزوں کا ذائقہ چکھنے کے بعد کبھی بھولے سے بھی دوسرے ہوٹل کا رُخ نہ کرینگے علاوہ ازیں افطاری کے وقت روزہ کی خشکی کے پیش نظر مفرح قلب و دماغ ہمارا اسپیشل فالودہ نوش فرمائیے جو آپ کے دماغ میں تر و تازگی پیدا کر دے گا۔ عیش و مسرت کی پارٹیوں، جلسوں، مجلسوں اور شادیوں کی تقاریب پر لذیذ اور خوش ذائقہ طعام کے خوان صرف ہم سے طلب فرمائیے۔ ہم یقیناً بہترین خوان مہیا کر کے آپ کی سرخروئی و اطمینان کا باعث ہوں گے (اہل و عیال کے لئے مخصوص اور جداگانہ کمرہ کا انتظام ہے)

(نیو برٹش انڈیا ہوٹل کو یاد رکھیے اور نام دیکھ کر ہوٹل میں تشریف لائیے)

پروپرائٹر:-
ایس، ایم، رسول جی

نیو برٹش انڈیا ہوٹل!
گرانٹ روڈ۔ ٹرام ٹرمینس

مینیجر
سجّاد حسین بھائی

ٹیلیفون نمبر ۴۰۱۰۸

NEW BRITISH INDIA HOTEL
GRANT ROAD, TRAM TERMINUS, BOMBAY.
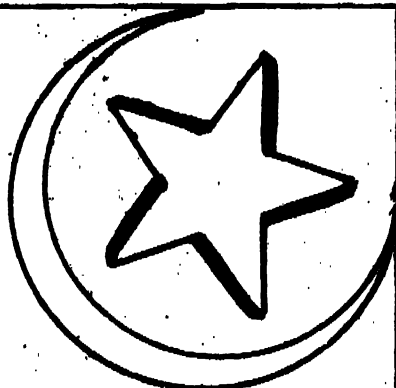
عید مبارک

OPP NATIONAL CITY BANK OF NEW YORK
P. MEHTA ROAD FORT BOMBAY
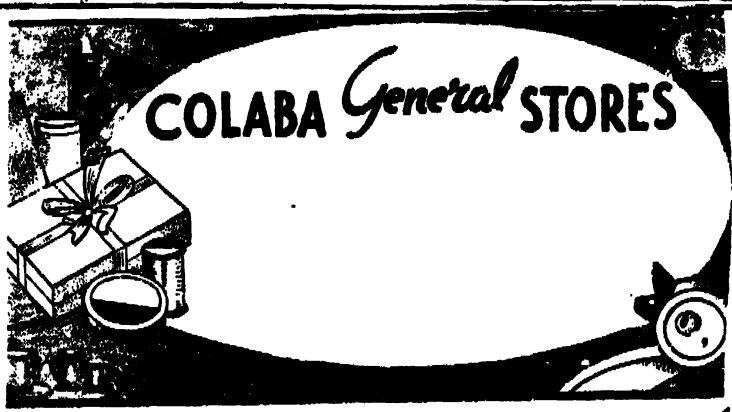
COLABA General STORES

گھر میں استعمال ہونیوالی چھوٹی یا بڑی ہر گھریلو چیز اچھی اور بکفایت حاصل کرنے کے لئے
یہ پتہ یاد رکھیے:-

قلابہ جنرل اسٹورس

پروپرائٹر:- قاسم علی وسرام پونجا
۹-اے، قلابہ کاز وے، متصل میجسٹک ہوٹل بمبئی

عید مبارک
KALVERT'S
عید مبارک
PRUMTO. CHUTNEY. CURRY-POWDER.
SAUCE. PICKLE. VINEGAR.
کیلورٹ کا پرمٹو، چٹنی، کری پاؤڈر، ساس، اچار، سرکہ وغیرہ
کیلورٹ کے مصالحوں کی قسم اعلیٰ ہونے کی وجہ سے یہ دنیا بھر میں مشہور ہیں اور مقبولِ عام ہیں ماہِ رمضان میں کیلورٹ
کی اچار چٹنیاں، نہایت لذیذ اور بھوک آور ثابت ہوتی ہیں ان کے استعمال سے بھوک بڑھتی ہے اور کھایا ہوا کھانا ٹھیک طرح
ہضم ہوتا ہے۔ کیلورٹ کے مصالحے اور کری پاؤڈر سے مزیدار کھانے تیار ہوتے ہیں اور یہ دیگر کری پاؤڈروں سے
اچھے ہوتے ہیں آپ ضرور لذت دار پرمٹو پی کر فرحت حاصل کریں۔ روزہ کی افطاری کے بعد اس کا استعمال دن
بھر کی تھکاوٹ دور کر دیتا ہے۔ یہ شربت قدرتی پھلوں سے تیار کیا گیا ہے اس میں نہ تو کوئی
اسینس ہے اور نہ ہی کوئی رنگ ڈالا گیا ہے۔ پرمٹو کے استعمال سے صحت حاصل ہوتی ہے اگر
عمدہ اور صحتمند مال خریدنا منظور ہو تو ہمیشہ کیلورٹ کا پرل بار لے خریدا کریں
یہ مال سب بڑے بڑے سٹوروں سے مل سکتا ہے!
ٹیلیفون نمبر ۲۰۱۳۲
ٹیلیفون نمبر ۲۰۱۳۲
PRUMTO
A. KALVERT'S PURE TABLE VINEGAR
A. KALVERT & Co
اے کیلورٹ اینڈ کمپنی ۱۲۳، اپر ڈنکن روڈ بمبئی نمبر (۸)

میری (مریم) دربار اکبری میں

میری یا مریم کا باپ ولیم نامی پرتگیزی تھا جو گوا کے معزز باشندوں میں شمار کیا جاتا تھا، اور کیتھولک مذہب کا بہت بڑا رہنما تھا، میری انتہائی خوبصورت اور نازک اندام دوشیزہ تھی، اور اپنے مذہب کی ہمیشہ پاسداری اور پچ کیا کرتی تھی۔ اسے ہر وقت اور ہر گھڑی یہی خیال رہتا تھا کہ ہمارا مذہب پروٹسٹنٹ فرقہ تک محدود نہ رہے، بارہ برس کی عمر میں میری نے اپنے مذہب کے متعلق مکمل معلومات اور تعلیم حاصل کی تھی اور گوا کے زنانہ مدرسہ میں جہاں مسیحوں کے یتیم بچے پڑھا کرتے تھے، معلمہ کے فرائض انجام دیتی تھی۔

جب اس کے باپ اور دیگر مبلغین مسیحی مذہب کو مغلوں میں اپنے مذہب کی اشاعت کا شوق پیدا ہوا تو انھوں نے میری کو اپنا آلہ کار بنایا اور میری جو اپنے مذہب کی دالہ و شیدا تھی، مغل بادشاہ اکبر کو اپنے دام تزویر میں لانے کی تدبیریں سوچنے لگی، قصہ کوتاہ اس کا یہ شوق جنون کی حد تک پہنچا اور باوجودیکہ میری کے معمر چچا نے اسے اس حرکت سے باز رکھنا چاہا، وہ اپنے ارادہ میں متزلزل نہ ہوئی اور ہمت کر کے معہ چند عیسائی مبلغین کے دربارِ اکبری میں باریاب ہوئی۔

شہنشاہِ اکبر نے شرف باریابی عطا کرنے کے بعد جب میری سے وجہ دریافت کی تو اُس نے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی طلب کرتے ہوئے مناظرہ کی خواہش ظاہر کی۔ اس کی اس استدعا پر نہ صرف اکبر بلکہ تمام درباری متعجب و دم بخود تھے۔ اور اس کی ذہانت اور حسن خداداد سے متاثر و مسحور ہو رہے تھے۔ شہنشاہ اکبر جو مذہبی معاملات میں قطعی غیر متعصب اور دور اندیش ہستی تھی، میری کی درخواست کو نہ ٹال سکے۔ اور آپ نے فرمایا کہ "میرے لئے یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ مذہب عیسوی جس کا اب تک اسلام سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے "کلہ بکلہ" معرکہ بحث میں آئے اور اپنی صداقت کی دلیلیں پیش کرے۔ غرض پہلے روز تو اسی قسم کی باتیں ہوئیں اور مسیحی خاتون کی حفاظت کیلئے فوراً ایک گارڈ بلائی گئی اور تین چار روز تک سلسلۂ مناظرہ اسے مہمان رکھ کر رخصت کرنے کے بعد شہنشاہ اکبر نے حکیم ہمام گیلانی کے توسل سے مریم یا میری کے پاس شادی کا پیغام بھیجا، میری جو اس امر کی منتظر تھی ہمام گیلانی کی زبانی پیغام سنتے ہی بایں شرط شادی پر رضامند ہو گئی کہ میری کا مذہبی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

شہنشاہِ اکبر نے میری کی یہ شرط منظور کی اور انتہائی کروفر کے ساتھ عقد کر کے میری کو اپنے حرم سرا میں داخل کیا، میری یا مریم باوجودیکہ شہنشاہ اکبر کی تیسری بیگم تھی۔ لیکن شہنشاہ اکبر کی بے پایاں نوازشوں کی بدولت "شہنشاہ بیگم" بنگئی اور اپنی من مانی کارروائیوں میں حد سے سوا آزاد تھی۔

ISMAILI P. PRESS, BOMBAY, 9

رات گذری رات کی تاریکیاں رخصت ہوئیں — آسماں پر ہر طرف پھیلا سفیدۂ صبح کا
جو سحر سوتے تھے وہ انگڑائیاں لینے لگے — گوشے گوشے میں چمن کے چل پڑی ٹھنڈی ہوا
مسجدوں میں جاکے دی بڈھے مؤذن نے اذاں — مندروں سے آئی ناقوسِ برہمن کی صدا
دیویاں گاتی ہوئی اشنان کو جانے لگیں — اور زاہد نے پڑھا اٹھکر فریضہ صبح کا
طائرانِ خوشنوا نے کردئے نغمے شروع — شب کو جو سوتا تھا پھر چلنے لگا وہ راستا
کھلکھلا اٹھے کنول کے پھول رودِ آب میں — شاخ پر پر مست غنچوں نے اڑایا قہقہا
بادہ نوشوں نے سرِ بستر جو لیں انگڑائیاں — دیکھکر پیرِ مغاں نے پھر نیا ساغر بھرا
لیس ہوہو کر چلی پلٹن سوئے میدانِ جنگ — صورِ محشر کی طرح اک دم بگل بجنے لگا
اٹھی گھبرا کر یکایک اک عروسِ نازنیں — اور بیتابانہ یوں بیدار شوہر کو کیا
جس طرح اک ڈال اک پودے کو دیتی ہے لچک — جس طرح اک پھول کو جھولا جھلاتی ہے صبا
اے تمناؤں کے حاصل اے محبت کی مراد — میرا دل تجھ پر نثار اور میری جاں تجھ پر فدا
اٹھ مری گستاخیوں کو دے محبت کا خطاب — اٹھ قبولیت کا دے میری مرادوں کو صلا
تیغِ خوں آشام دشمن چاہئے زیبِ کمر — فوج کی رخصت کا دن ہے کوچ کا وقت آگیا
جا خدا کا قہر بنکر دشمنوں پر ٹوٹ پڑ..... — جا خدا کو سونپ دے گھر بار کو للہ جا
جا کہ تھی بندوق تیری اس گھڑی کی منتظر! — سب سے پہلے فوج پر دشمن کی تو گولی چلا
میں پرستارِ وفا ہوں میں ہوں تیری خادمہ — آج تک بن کر رہی ہوں پیکرِ شرم و حیا
میں نے تیرے حکم سے اک دن بھی سرتابی نہ کی — میں نے اپنی زندگی کو کردیا تجھ پر فدا
میں نے کچھ مانگا نہیں اپنی وفاؤں کا بدل — میں نے کچھ چاہا نہیں ہے اپنی خدمت کا صلا
مجھ میں تیرے ہجر کی طاقت نہیں ہے زینہار، — مجھ میں یہ ہمت نہیں جو رہ سکوں تجھ سے جدا
میں سمجھتی ہوں کہ ویراں ہے یہ گھر تیرے بغیر، — میں سمجھتی ہوں کہ تنہا تو ہے میرا آسرا
ملک پر کرتی ہوں میں لیکن محبت کو نثار — اب بس اتنا چاہتی ہوں میں کہ جا اور جلد جا

یا مٹادے صفحۂ ہستی سے دشمن کا وجود!
یا وہیں پر جان دیدے اور کبھی واپس نہ آ!

خاص برائے الاصلاح عید نمبر

تشطیر!

از جناب حضرت علامہ احمد شبلی

استاد جناب جگر صاحب مرادآبادی کے اشعار پر گوٹ اور کنارا

مطلع غزل:- سودا جواب ہے سر میں، وہ سودا ہی اور ہے ٭ اس کا چمن ہی اور ہے، صحرا ہی اور ہے!

سودا جواب ہے سر میں، وہ سودا ہی اور ہے / میرے دلِ حزیں کی تمنا ہی اور ہے
جس شئی کو ڈھونڈتا ہے میرا مطمحِ نظر / اسکا چمن ہی اور ہے، صحرا ہی اور ہے
یہ حسنِ رنگ رنگ ہی کچھ کم نہ تھا مگر / رعنائی کا اب آنکھوں میں نقشا ہی اور ہے
سمجھا رہا ہوں لاکھ، مگر مانتا نہیں! / کیا کیجیے کہ دل کا تقاضا ہی اور ہے
جو حسن شش جہت سے نہ سیراب ہو سکی / اس میری تشنہ کامی کا دریا ہی اور ہے
جس کے لئے گزاری تھی میں نے تمام عمر / محسوس اب ہوا، وہ تمنا ہی اور ہے
صورت میں یہ فروغ، یہ جذب و کشش کہاں / ناز و ادا سے دل کا لبھانا ہی اور ہے
گو ظاہرا حسینوں کو دل دیدیا تو کیا / در پردہ کوئی شاہدِ معنیٰ ہی اور ہے
بکھری پڑی ہیں یوں تو شرابیں ہزارہا / میرے سرور و کیف کا مینا ہی اور ہے
اس دخترِ رز کے جام سے سیری نہیں ہوئی / پیاسی ہے جسکی روح، وہ صہبا ہی اور ہے
خود حسن استعارہ ہے جس کے جمال کا / اس حسنِ لازوال کا جلوہ ہی اور ہے
اس خاکداں میں جسکو نگاہیں نہ پا سکیں / وہ جانِ حسن، حسنِ سراپا ہی اور ہے
جس سے کہ مطمئن ہو میری فطرتِ بلند / وہ شاہدِ جمالِ تجلی ہی اور ہے
جس میں غمِ فراق کا کھٹکا ہی کچھ نہ ہو / شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے
لیلائے آب و گل تو ہزاروں ہزار ہیں، / ان کی محبتوں کا تو سودا ہی اور ہے
کیا جائے سوئے نجد شبلیِ خستہ دل / مجنوں ہے جسکی روح وہ لیلیٰ ہی اور ہے

اردو ہندی ہندوستانی کے دشوارگزار اور تحقیق طلب نکات کے تجزیہ کے لئے مناسب ہے کہ ہم ان ناموں کی شان نزول سے قبل زبانِ اردو کی تدریجی ترقی کا بھی ضمناً ذکر کردیں تاکہ ادب نواز حضرات پر ان تاریخی شواہد کا انکشاف ہوجائے جو کہ ہمارے اس موضوع سے بطور تاریخی واقعات کے وابستہ کئے جاتے ہیں آیئے تھوڑی دیر کے لئے اردو کے قدیم مورخین اور محققین کی بزم کو بھی دیکھ لیں وہ دیکھئے سامنے ہی میرامن نظر آتے ہیں۔ اپنی سلاست و فصاحت کے کرشمے دکھا رہے ہیں مگر کبھی کبھی حقیقت سے دور جا پڑتے ہیں۔ چنانچہ اپنی مقبولِ عام اور ہر دلعزیز کتاب یعنی "باغ و بہار" کے دیباچہ میں زبانِ اردو کی پیدائش کے متعلق یوں رقمطراز ہیں جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے چاروں طرف کے لوگ حضور میں جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال و جواب کرتے کرتے ایک زبان اردو مقرر ہوئی۔" پاس ہی آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد بیٹھے ہیں جو کہ اپنی شیریں مقالی اور انشاء پردازی سے تمام بزم کو محوِ حیرت بنا رہے ہیں اپنی مشہور و معروف کتاب "نیرنگ خیال" میں کہتے ہیں کہ "زبانِ اردو ایک لاوارث بچہ تھا کہ اردوئے شاہجہانی میں پھرتا ہوا ملا کسی کو اس غریب کے حال کی پرواہ نہیں ہوئی اتفاقاً شعراء نے اٹھالیا اور محبت سے پالنا شروع کیا انجام کار اُن ہی کی زبان سے بولنا سیکھا" قریب ہی میں ایک بلند مقام پر سرسید بیٹھے ہیں جو اپنی قوتِ استدلال اور قدرتِ بیان کی بدولت جدید نثر کے امام کہے جانے کے مستحق ہیں ان کی دقیق اور دوررس نظروں نے دریافت کرلیا کہ زبانِ اردو کے وجود میں آنے کے کچھ اور ہی اسباب ہیں۔ چنانچہ "آثار الصنادید" کے خاتمہ میں زبانِ اردو کی پیدائش کے بارے میں کہتے ہیں کہ "بابر اور جہانگیر کے زمانہ تک ہندی بھاشا میں کچھ تغیر نہیں ہوا تھا مسلمان اپنی گفتگو فارسی میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں نے شہر شاہجہاں آباد" بسایا۔ ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا تو فارسی اور ہندی بھاشا بہت مل گئیں۔ غرض کہ لشکر بادشاہی اور اردوئے معلیٰ میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہوئی جس کا نام زبانِ اردو ہوا" یہی نہیں بلکہ جدید تحقیقات ادب اردو کے مطالعہ سے بھی ہم اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ہمارا ملک ہندوستان مسلمانوں کی آمد سے قبل مختلف اقوام کا ایک مجموعہ تھا۔ زبان کے لحاظ سے بھی اس ملک میں بھانت بھانت کی بولیاں مروج تھیں چنانچہ امیر خسرو مثنوی "ہند سپہر" میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیاں قرار دیتے ہیں۔ مثلاً

سندھی۔ لاہوری۔ کشمیری۔ بنگالی۔ گجراتی۔ تلنگی۔ دہلوی وغیرہ وغیرہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں بھی یہی بولیاں عوام میں رائج تھیں چنانچہ ابوالفضل "آئین اکبری" میں ان زبانوں کے نام یہ گناتے ہیں۔

دہلوی۔ بنگالی۔ ملتانی۔ گجراتی۔ تلنگی۔ کشمیری۔ افغانی۔ بلوچستانی وغیرہم۔ المختصر یہ کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل اس ملک میں بیسیوں بولیاں مستعمل تھیں۔ جب مسلمانوں نے اس سرزمین میں قدم رکھا تو وہ زبانوں کی کثرت کے شاکی نظر آئے وہ قدرتی طور پر اپنی زبان اپنے ساتھ لائے تھے۔ مثلاً عرب عربی۔ ایرانی فارسی۔ اور ترک و مغل ترکی حکمران سب پر فارسی کا رنگ غالب تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی شاہی اور سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔ لیکن ملکی بول چال اور عام زبان کے لئے نہ تو یہ ممکن تھا کہ تمام ہندوستان کی زبان فارسی کردی جائے۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ کسی ایک صوبہ کی زبان تمام ہندوستان کی زبان بنادی جائے اس لئے قدرتی طور پر یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبے میں گئے وہاں کی صوبہ وار زبان اختیار کی اور مذہبی سیاسی و تمدنی ضروریات کے مطابق اپنی زبان کے بہت کچھ الفاظ اس صوبہ کی زبان میں ملاتے رہے۔ ان الفاظ نے انجام کار یہاں سند مقبولیت حاصل کی اور بعد ازیں اسی دیسی زبان کا جزو لاینفک معلوم ہونے لگے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا سب سے پہلا بیڑا ۶۳۶ء میں ہندوستان آیا۔ اسی طرح کچھ اور لوگ یہاں آئے یہاں تک کہ ۷۱۲ء میں محمد قاسم نے سندھ پر قبضہ حاصل کرلیا جس وقت مسلمان کپتانوں کی نظریں سندھ پر پڑ رہی تھیں اس وقت عرب کے سوداگر ہندوستان کے مغربی ساحل پر بس چکے تھے اور ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کرتے تھے بلاذری نے اپنی تاریخ میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ آٹھویں صدی میں مالابار ساحل پر مسلمان پوری طور سے آباد ہوگئے تھے جہاں ان کی بڑی عزت ہوتی تھی۔ کوچین کے راجہ زمورن (Zamorine) نے مسلمان سوداگروں کے لئے منڈیاں کھلوادی تھیں۔ مسعودی ۹۱۶ء میں کہتا ہے "کہ اس نواح میں بعض مقامات پر دس ہزار سے زیادہ مسلمان آباد ہیں" مارکو پولو کہتا ہے "کہ لنکا کے راجہ مسلمان

سپاہیوں کو باہر سے لاکر اپنی فوج میں بھرتی کرتے تھے" اس طور پر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کا تعلق ساحل مالا بار سے رہا اور ان کی زبان صوبہ وار زبان سے مخلوط ہونے لگی۔ اس اختلاط کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ اہل ولایت کی زبانوں پر ہندی الفاظ اور ہندوؤں کی زبانوں پر فارسی الفاظ چڑھ گئے۔

المختصر یہ کہ ہندو اور مسلمانوں کے باہمی میل جول سے ایک زبان ظہور میں آئی جسے آپ خواہ ہندی کہئے یا اُردو یا ہندوستانی۔ یہ خیال کرنا کہ اس زبان کو مسلمان بادشاہوں نے بنایا غلط ہے۔ یہ زبان خود بخود وجود میں آئی۔ ورنہ مسلم بادشاہوں کی سرکاری اور درباری زبان ہمیشہ فارسی ہی رہی۔ اُردو زبان محض معاشرتی ضرورتوں کی وجہ سے وجود میں آئی اور اس کے بنانے میں زیادہ تر حصہ اہل ملک یعنی ہنود کا تھا۔

ان دنوں ہم دیکھتے ہیں کہ قومیت کا تخیل ہندوستان کو آزادی بخشنے کے بجائے اس کی فرقہ پرستیوں اور خانہ جنگیوں میں روز افزوں ترقی کا باعث ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی دنیا میں اس قسم کی کشاکش کچھ زیادہ ناموزوں نہ تھی مگر ادبی دُنیا میں اس قسم کی جد و جہد کوئی اچھا اثر نہیں پیدا کرسکتی۔ اتحادِ قومی کی جڑیں بجائے اس کے کہ مضبوط پکڑیں آئے دن کے تعصبات کے سیلاب سے کمزور تر ہوتی جارہی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تنگ دل حضرات کی کرم فرمائیوں نے اُردو ہندی... ہندوستانی کے مفہوم میں ایک عجیب و غریب تنازعہ پیدا کر دیا ہے۔

اس قضیہ کا آغاز ہم انیسویں صدی عیسوی سے پاتے ہیں۔ واضح ہو کہ اول اول اہلِ یورپ تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ رفتہ رفتہ زمانہ کی موافقت مقامی حکمرانوں کی کمزوری اور اراکین سلطنت کی غداری و کوتاہ بینی سے انگریزوں کو موقع ملا کہ وہ اپنی توجہ تجارتی کاروبار سے ہٹا کر سیاست و حکومت کے دقیق مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ انجام کار کار ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company) نے تجارت سے سیاست کی طرف قدم بڑھایا تو یہ بات انگریزی حکام پر بخوبی روشن ہوگئی کہ حکمرانی کے رموز اور اہلِ ملک کی فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے کہ حکام دیسی زبانوں سے بدرجۂ اولیٰ واقف ہوں چنانچہ ہیسٹنگز سے لے کر لارڈ ولزلی تک جس قدر گورنر جنرل ہوئے ہیں سب نے اُردو کی پرداخت میں کوشش کی۔ اس خصوص میں سب سے پہلی منظم کوشش وارن ہیسٹنگز کی کہی جا سکتی ہے۔ انھوں نے کلکتہ (Calcutta) کے انگریزی علاقہ میں ایک مدرسہ قائم کیا جو دیسی کالج کہلاتا تھا اور اس میں زیادہ تر فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۷۹۸ء میں لارڈ ولزلی ہندوستان کے گورنر مقرر ہو کر آئے اس وقت تعلیم یافتہ کمپنی نے ایک کالج قائم کرنے کی اجازت طلب کی۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں ایک کالج کا افتتاح ہوا جو کہ بعد ازیں فورٹ ولیم کالج (Fort William College) کے نام نامی سے معروف ہوا۔ اور ڈاکٹر جان گلکرائسٹ (Dr. John Gilchrist) اس کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے لارڈ ولزلی اور گلکرائسٹ نے اپنے تدبر و دانشمندی سے محسوس کرلیا کہ اب فارسی ہندوستان کی زبانِ عام نہیں رہ سکتی نیز یہ بھی معلوم کرلیا کہ یہاں کی زبانوں میں صرف اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے۔ جو ملک کے بڑے حصہ میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔ پس اس زبان کی ادبیات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی اس وقت تک حقیقی معنوں میں اُردو کا سارا ذخیرہ شعر و شاعری تک محدود تھا۔ نثر تو ابتدا ہی سے مفقود تھی۔ لہٰذا اس کمی کی تلافی کے لئے "سررشتۂ تالیف و تراجم" قائم کیا گیا۔ اطراف ملک کے قابل افراد کو دعوتِ ملازمت دے کر کلکتہ میں جمع کیا گیا۔ اور ان سے اردو نثر میں کتابیں لکھوائی جانے لگیں۔ تالیف و تراجم کا دفتر قائم کرنے کے بعد یہ تجویز پیش نظر ہوئی کہ آیا قصص و حکایات و تاریخ و تمدن کی کتابیں از سرِ نو اردو میں تصنیف کرائی جائیں۔ یا فارسی اور سنسکرت کے قدیم ذخیرہ کو بہ طور تراجم اردو میں منتقل کیا جائے۔ آخرالذکر صورت بہ لحاظ حالات و قرائن زیادہ سہل اور کار آمد معلوم ہوئی۔ چنانچہ ملک کے مشہور ادیبوں کو ملازمت کے لئے بلایا گیا۔ جن میں للو لال جی۔ بہادر علی۔ حیدر بخش حیدری۔ کاظم علی۔ مظہر علی خان۔ نہال چند اور شیر علی افسوس وغیرہ اشخاص کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جب ترجمہ کا سوال پیدا ہوا تو ساتھ ہی ساتھ ترجمہ کی زبان کے نام اور انشا و اسلوب کا سوال بھی پیدا ہوا ۱۸۶۶ء کے دوران میں جون بیمس (John Beams) اور گراؤز (Growse) کے مابین مشہور علمی رسالوں میں اسی پر بحث ہوتی رہی۔ راجہ شیو پرشاد نے (Beams) بیمس کی تائید کی جو زبان اردو میں فارسی اور عربی عناصر کے حامی تھے۔ لچھمن سنگھ نے ان کی مخالفت میں گراؤز (Growse) کا ساتھ دیا جو کہ زبان میں سنسکرت الفاظ کی آمیزش کے قائل تھے۔

پس بیانِ مذکورۂ بالا سے ہم بہ آسانی تمام سمجھ سکتے ہیں کہ اردو ہندی ہندوستانی کے نفاق انگیز مسئلہ کی ابتداء کیونکر ہوئی اور بعد ازیں اس مسئلہ کو کس درجہ اہمیت دی گئی۔ اسی ضمن میں ہم کو دورِ حاضرہ کی غلط فہمیوں کو بھی فراموش کرنا چاہئے فی زمانہ اس مسئلہ میں دو غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں۔ اول یہ کہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ہندی دو ہزار برس سے مستعمل ہے لہٰذا ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کا حق اسی ہندی زبان کو حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض لوگ تو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندی کا لفظ عام اور وسیع ہے۔ اس کا تسلط کوئی محدود نہیں بلکہ اس کا اطلاق اردو پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کہ ہندوستان کی دیگر قدیم زبانوں یعنی اودھی۔ بندیلی۔ میتھلی۔ بھوجپوری وغیرہ پر ہوتا ہے مگر واضح ہو کہ وہ ہندی جس کی خاطر اتنا کچھ طوفان برپا کیا گیا ہے وہ محض حال ہی کی پیداوار ہے۔ للو لال جی نے اس کی بنا ڈالی اور آگے چل کر فرقہ داری اور مذہبی تعصب نے اس کو پروان چڑھایا۔ ایڈورڈ صال جو ایک جیّد عالم تھے اور ہندی زبان کے بڑے حامیوں میں شمار کئے جاتے تھے خود ہی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "ہندی زبان جیسی کہ وہ آج کل مستعمل ہے۔ دراصل بالکل جدید زبان ہے"۔

دوسری غلط فہمی جو کہ عوام کے دل و دماغ کو خیرہ کئے ہوتے ہے وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اردو زبان کو مسلمان بادشاہوں نے حکومت اور رعب سے پھیلایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ خیال حقیقت سے بہت ہی دور نظر آتا ہے اگر تاریخ ادب اردو کا مطالعہ کیا جائے تو صریحی طور پر اس امر کا انکشاف ہو جائے گا کہ مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اردو محض مسلمان بادشاہوں کی جد و جہد کا نتیجہ ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ اردو کی ترقی اور کامیابی میں ہندوؤں کی کوششوں کو بھی ایک بڑا مرتبہ حاصل ہے۔

سچ ہے کہ انسان کبھی ایک حال میں خوش نہیں رہتا۔ تغیر و تبدل فطرتِ انسانی کی ترکیب اصلی میں داخل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ کسی چیز کو بناتا ہے اور کبھی اسی عزیز چیز کو اپنے ہی ہاتھوں سے معدوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال ہماری اردو زبان کا بھی ہے۔ ایک وقت وہ تھا جبکہ اہل ملک یعنی ہنود اردو زبان کی پرداخت

اور اشاعت میں بدرجۂ اتم کوشاں ستے۔ مگر افسوس کہ اب وہ وقت بھی آ گیا جبکہ وہ لوگ اپنی بنائی ہوئی چیز کو خود ہی گمنامی کے بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ یا تو اردو کو اپنے ملک کی مقدس زبان کے طور پر نظر احترام سے دیکھتے تھے یا وہی اب ہیں کہ اس کو اسی کے مختلف ناموں سے میز کرتے ہوئے اس کی ترقی کی راہ میں سدراہ کا کام کر رہے ہیں۔ آئے دن اردو ہندی ہندوستانی کے مسئلہ کو مختلف اقسام کے رنگوں میں رنگ کر دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جیسے اردو ہندی یا ہندوستانی سے بالکل جدا کوئی دوسری زبان ہے۔ ان اردو نواز حضرات کی یہ کوشش بالکل اس کی مصداق معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی شخص اپنی چرب زبانی سے نظرِ حقیقت میں خاک ڈال لینے کی کوشش کرے۔ تاریخ کے صفحات ہمارے اس دعوی کی تائید میں خود ہی کہہ رہے ہیں کہ اردو ہندی۔ ہندوستانی حقیقی معنوں میں ایک ہی زبان یعنی اردو کے مختلف نام ہیں ہاں فرق یہ ہے کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان اردو کے نام بھی بدلتے رہے مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان تمام ناموں سے مراد یہی اردو رہی ہے۔ جس کے مٹانے میں آج حتی الامکان کوشش کی جا رہی ہے۔ ان ناموں کا تاریخی تجزیہ خود ہی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اردو زبان کوئی نئی زبان نہیں۔ بلکہ مختلف اوقات میں مختلف ناموں سے موسوم رہی ہے۔ آئیے اسی سلسلہ میں دیکھیں کہ ان ناموں کی تاریخی شان نزول کیا ہے۔ سب سے پہلے ہندی کو لیجئے۔

ہندی

آج جو زبان اردو کے نام سے مشہور ہے اس کا اصلی اور مقبول عام نام ہندی یا ہندوی ہے۔ ہندی یا ہندوی سے عام طور پر وہ دیسی زبان مراد ہے جو غیر ہندوستانی نہیں۔ دیسی اور پردیسی زبانوں کے اختلاط سے جو زبان ظہور میں آئی اس کا قدیم نام ہندوی ہوا۔ چنانچہ سنہ ۱۲۴۸ھ میں محمد عوفی نے ایک مجموعہ مرتب کیا۔ جس میں وہ سعد سلمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے ہندوی زبان میں ایک دیوان تیار کیا ہے۔ شاہ میراں جی کا انتقال سنہ ۱۴۹۳ھ میں ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی نظم کی زبان کو ہندی کہا ہے۔ شیخ سعدی نے اپنے ایک قطعے میں جس کا مطلع حسب ذیل ہے ؎

دلبرے دارم نکو مانندۂ شمس و قمر ؎ دل ربائے جاں فزا خندہ ہے چوں شکر

ایک ہندی شعر بھی کہا ہے جس کا پہلا مصرع یوں تحریر ہے ؎

"گہہ بہ ہندی گو یدم پانی بہن روٹی کہن"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی "زاد المتقین الی طوک الدین" مولفہ سنہ ۱۰۳۰ ہجری میں فرماتے ہیں "ہندیان در تقریر فارسی تکلف نہ کنند و ہم بہ زبان ہندی اکتفا فرمایند"۔ میر تقی میر نے "نکات الشعراء" میں زبان اردو کو ہندی ہی لکھا ہے۔ انشاء اللہ خان کے زمانہ میں اگرچہ اردو کا لفظ رائج ہو چلا تھا پھر بھی وہ اس زبان کے لئے ہندی ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ "دریائے لطافت" میں اپنی عبارت کو "درین عبارت ہندی" قرار دیتے ہیں۔ جان گلکرائسٹ نے اردو شعراء کے منتخب کلام کی ایک بیاض تیار کی اور اس کا نام "ہندی بیاض" رکھا۔ اسی طرح ایک دوسری اردو کتاب کا نام "اتالیق ہندی" رکھا ہے۔ مرزا غالب کے خطوط کے اگر ایک مجموعہ کا نام "اردوئے معلی" ہے تو دوسرے کا نام "عود ہندی" ہے۔ پس مثال مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اہل قلم نے اپنی اپنی تصانیف کو در زبان ہندی لکھا ہے مگر مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زبان موجودہ ہندی نہیں بلکہ اردو ہے لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی قدیم سے مراد ہندی جدید نہیں ہے بلکہ قدیم اردو ہے جس کو آج کل ہندی کی ضد قرار دیا جاتا ہے۔ اب اس کے دوسرے نام یعنی ہندوستانی کا تاریخی جائزہ لینا چاہئے۔

ہندوستانی

منجملہ دیگر ناموں کے ایک نام جو اردو زبان سے منسوب کیا جاتا ہے وہ ہندوستانی ہے۔ تاریخی سراغ سے معلوم ہوتا ہے

کہ سب سے پہلے پرتگیزوں نے سترہویں صدی عیسوی میں ہماری زبان اُردو کا نام انڈوستان رکھا ٹیری نے ۱۶۱۶ء اور فریو نے ۱۶۷۳ء میں ہماری زبان کا نام انڈوستان بتایا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد زبان کا نام بجائے انڈوستان کے انڈوستانی (Indostani) ہو جاتا ہے۔ مثلاً اماوزی نے ۱۷۰۰ء میں اردو زبان کے لئے (Indostani) انڈوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے قبل ۱۶۹۰ء میں اِس ہی زمانہ میں شاہی فوج انسران سے کالی زبان (Black Language) کہتے تھے۔ اُردو مصنفین میں "زبان ہندوستان" کا لفظ سب سے پہلے ہم وجہی کی کتاب "سب رس" مصنفہ ۱۶۳۵ء میں پاتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب کی زبان کو زبانِ ہندوستانی قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد اس لفظ کا استعمال ہم "تاریخ فرشتہ" مصنفہ ۱۶۰۵ء اور "بادشاہ نامہ" از عبدالحمید لاہوری مصنفہ ۱۶۵۰ء میں بھی دیکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں زبانِ اردو کا نام ... ہندوستانی رہا ہے۔ اٹھارویں صدی کے خاتمہ پر لارڈ ولزلی (Lord wellesly) کے عہد میں فورٹ ولیم کالج (Fort william college) سرکاری افسروں کو دیسی زبان کی تعلیم دینے کے واسطے قائم کیا گیا تھا اور گلکرائسٹ اس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ ان کے زمانہ میں اُردو کے لئے ہندوستانی کا لفظ سندی ہوگیا۔ چنانچہ گلکرائسٹ نے انگریزی ہندوستانی ڈکشنری اور ہندوستانی علم اللسان وغیرہ کتابیں لکھیں۔

زبان کے لئے ہندوستانی زبان (Hindustani Language) کا لفظ بھی ملتا ہے

اس زمانے میں میرامن نے اپنی مشہور کتاب "باغ و بہار" تصنیف کی اور اپنی کتاب کی زبان کو ٹھیٹھ ہندوستانی بتایا ہے جیسا کہ ان کی کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ "جان گلکرائسٹ صاحب نے فرمایا کہ قصہ کو ایسی ٹھیٹھ ہندوستانی میں کہو جو ہندو مسلمان، عورت، مرد، لڑکے، بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں۔" علاوہ ازیں گریرسن کہتا ہے "اُردو سے ہندوستانی کی وہ صورت مراد ہے جس میں فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہندی ہندوستانی کی وہ شاخ ہے جس میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے۔" المختصر یہ کہ اس نام کے تاریخی شواہد سے بھی یہی ترشح ہوتا ہے کہ ہندوستانی سے مراد کوئی دوسری زبان نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ اُردو کے قدیم ناموں ہی میں سے ایک نام ... ہندوستانی بھی تھا۔

اُردو ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ بتانے کے بعد اب ہم اُردو کی تاریخ پر بحث کریں گے۔

اُردو بمعنی "لشکر شاہی" ترکی زبان کا لفظ ہے انہیں معنوں میں یہ لفظ زمانۂ قدیم سے مستعمل رہا ہے۔ سلاطینِ تغلق کی تاریخ میں بھی یہ لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ بعد ازیں تیموریوں اور خصوصاً عہد شاہجہانی میں بھی اُردوئے معلیٰ شاہی لشکرگاہ اور دہلی کے قلعہ معلیٰ کو کہا کرتے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا بھی زور کم ہو چلا۔ اسی اثنا میں ہماری مخلوط زبان عام بازاروں اور معمولی گھرانوں سے نکل کر شاہی دربار تک پھیل چکی تھی۔ اس لئے اول اول لوگوں نے اس زبان کو زبان اردوئے معلیٰ کا خطاب عطا کیا چنانچہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر کی تصانیف یعنی "نکات الشعراء" اور "نوطرز مرصع" میں، زبان کو اردوئے معلیٰ لکھا گیا ہے۔ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل سے اضافت جاتی رہی اور خود زبان کا نام اُردو ہوگیا۔ مثلاً "مخزن الغرائب" میں مظہر جان جاناں کے متعلق لکھا ہے "در زبان ہندی کہ مراد از اُردو است خیلے فصیح و بلیغ بود"

ہندی کے معنوں میں اُردو کا استعمال غالباً سب سے پہلے مصحفی نے کیا ہے۔ مثلاً

مصحفی:- خدا رکھے زبان ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اُردو ہماری ہے

داغ نے بھی موجودہ زبان کو زبانِ اُردو سے تعبیر کیا ہے ؎

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدے
کہ آتی ہے اُردو زبان آتے آتے

قائم کی مخزنِ نکات میں زبان کے لئے اُردو کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

دکن کے شاعر باقر آگاہ نے ۱۷۸۲ء اور "تذکرہ گلزار ابراہیم" کے مصنف علی ابراہیم خان نے ۱۷۸۴ء میں زبان کے لئے اُردو کا لفظ استعمال کیا ہے میرامن نے بھی اُردو ہی کا لفظ استعمال کیا ہے بعد ازیں انیسویں صدی میں یہ نام بہت مقبول ہوا اور اب اس سے ہندوستانی یا دہلی کی ادبی صورت مراد ہے۔

پس ان ناموں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ان ناموں سے مراد کوئی دوسری زبان نہیں رہی ہے۔ بلکہ یہ سب اسی ایک زبان کے نام رہے ہیں جس کو ہم آج کل اُردو کہتے ہیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا کاروبار بڑھایا اور تجارت سے سیاست کی طرف قدم بڑھایا تو انگریز ملازموں کی تعلیم کے لئے ایک ایسی زبان کا انتخاب کیا گیا جو اپنی مقبولیت کی وجہ سے بہت مفید تھی۔ اس زبان کا نام ہندوستانی یعنی اُردو تھا۔ مسلمان مصنفین سے قطع نظر ہندو مصنفین ایک صدی قبل اُردو کو ہندی کہا کرتے تھے۔ بادشاہ شاہ عالم کے وقت میں منشی متولال صاحب نے "گلدستۂ نشاط" تالیف کی جس کے دیباچہ میں کہتے ہیں: "از آنجا کہ ریاحین اشعار ہندی کہ خالی از آب و رنگ لطافت نیست" حالانکہ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب میں ہندی کا ایک دو بال بھی شامل نہیں ہے۔ تمام کلام فارسی یا اُردو ہے۔ اُردو میں میر، مصحفی اور انشا وغیرہ کا کلام بھی شامل ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناموں کی گڑبڑ سے استدلال فضول ہے۔ اُردو۔ ہندی۔ ہندوستانی اور ریختہ وغیرہ سب ایک ہی زبان کے نام ہیں اور یہ زبان یعنی اُردو ہندوستانی کے نام سے ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ چنانچہ گلکرائسٹ نے اسی زبان کو (Grand popular speech of India) کہا ہے۔ اپنی مشہور کتاب (East India Guide) میں کہتے ہیں: "اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف اضلاع اور صوبوں میں خاص خاص بولیاں بولی جاتی ہیں۔ لیکن ہم جرأت کے ساتھ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اگر فرداً فرداً دیکھا جائے تو ان میں کوئی بھی ایسی مفید اور ضروری نہیں جیسے ہندوستانی۔"

غرضیکہ اُردو کی یہ مقبولیت برابر جاری رہی چنانچہ ڈیو پان جو سینٹ کے ممبر تھے اپنی کتاب "اقوام کی پیدائش و فوت" میں کہتے ہیں: "برطانوی ہند کی مردم شماری رپورٹ کی کاغذات کے مطابق اس وقت ۲۸ کروڑ ۴۲ لاکھ ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان میں تقریباً بیس کروڑ نفوس کے درمیان جو ایک چیز مشترک رشتہ کا کام دیتی ہے وہ اُردو زبان ہے۔"

(باقی صفحہ (۱۶) پر ملاحظہ فرمائیے)

خاص الاصلاح

عید نمبر کیلئے

خونیں نوازشیں

از حضرت سرشار کسمنڈوی

زمانہ عیش سے تھا ہمکنار عید کے دن
سنی کسی نے نہ دل کی پکار عید کے دن

تری تلاش میں گم ہو گئی فضاؤں میں
مری نگاہِ جنوں آشکار عید کے دن

صلائے عام تھی ماحول کی درخشانی
پکارتی تھی مجھے بار بار عید کے دن

بقدرِ جوشِ محبت، بقیدِ ہوش و حواس
دھڑک رہا تھا دلِ بیقرار عید کے دن

کسی سے ملنے ملانے کا حوصلہ نہ ہوا
میں اپنے آپ ہی تھا شرمسار عید کے دن

وہ دیکھتے تو تغافل پہ اپنے پچھتاتے
میں جس خلش سے رہا بیقرار عید کے دن

یہی نصیب رہے ہاں یہی غنیمت ہے
ترے خیال سے ہوں ہمکنار عید کے دن

خدا گواہ وہ تم تھے جو یاد..... آتے تھے
نہ تھا مجھے کسی پہلو قرار عید کے دن

جہاں اُداس تھا دل کے اُداس ہونے سے
خزاں کا رنگ لیے تھی بہار عید کے دن

ہزار دل کو سنبھالا جگر کو سمجھایا...
رُکا نہ گریۂ بے اختیار عید کے دن

غمِ حبیب کی خونیں نوازشیں توبہ!
لہو میں ڈوب گئی جانِ زار عید کے دن

شکایتیں دلِ مضطر کی حق بجانب تھیں،
بلائے جاں تھا غمِ انتظار عید کے دن

نہ وہ ملے، نہ اجل آئی، اور نہ دل ٹھہرا
یہ سختیاں مرے پروردگار عید کے دن

مری نگاہ میں کیوں پھول بھی تھے انگارے
سمجھ سکی نہ یہ منطق بہار عید کے دن

خطِ شکست میں نازل ہوا ہے اک مکتوب!
خیال یہ تھا کہ آئیگا تار عید کے دن

وہ عیدگاہ کا منظر وہ زرق برق لباس
وہ تہنیت کی مسلسل پکار عید کے دن

غلط نہ تھیں مری بے اختیاریاں سرشار!
وطن سے دُور تھا میں دلفگار عید کے دن

بقیہ صفحہ (۱۴) ! المختصر یہ کہ اُردو اسی طرح زمانہ گزشتہ میں مقبولِ عام اور ہر دلعزیز رہی ہے اور اس کی مقبولیت کا ناقابلِ تردید ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۳۵ء میں جب فارسی کی بجائے اُردو دفتری زبان قرار دی گئی تو اس کے خلاف کسی نے بھی آواز نہ بلند کی۔ گارسن و تاسی لکھی گزٹ مورخہ ۲۶ فروری ۱۸۶۱ء کے حوالے میں کہتے ہیں کہ "بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ کے زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے وائسرائے گورنر جنرل

....

....

....

بہادر کو ایک عرضداشت بھیجی جس میں یہ درخواست کی گئی کہ جدید ہائیکورٹ میں کارروائی اردو زبان میں ہونی چاہئے" اسی زمانہ میں بمبئی (Bombay) میں یونیورسٹی قائم کی گئی نیز ۱۸۶۱ء کے ڈگری کے امتحان میں اُردو زبان بھی شامل تھی۔ اور اس کے نصاب میں" اخلاقِ ہندی" مثنوی میر حسن"۔" دیوانِ ناسخ اور" باغ و بہار" وغیرہ مشہور کتابیں معین تھیں۔

حالانکہ تمام: بیان و امثالِ بالا سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ اُردو نہ تو کوئی نئی زبان ہے اور نہ تو ہندی ہندوستانی سے علیحدہ کوئی ایک جدا زبان ہے مگر پھر بھی اُردو کے تنگ نظر معترضین اور ہندی کے معزز شائقین اُردو کو مٹانے اور ہندی جدید کو خواہ مخواہ ابھارنے میں ہمہ وقت کوشاں نظر آتے ہیں۔ اور اپنی اس سعی بیجا کی تائید میں بالعموم یہ آڑ لیتے ہیں کہ اُردو میل والی زبان ہے اور ہندی ایک خالص زبان ہے۔ مگر واضح ہو کہ اگر تنگ نظری کو خیرباد کہہ کر نظرِ حقیقت سے دیکھا جائے تو عوام پر بدرجۂ احسن نمایاں ہو جائے گا کہ اگر زبان کو ویسی زبان بنانے کے لئے بھی نظریہ تسلیم کر لیا گیا تو یقین جانئے کہ دنیا میں ایک زبان بھی صحیح معنوں میں خالص نہیں بن سکتی۔ جو اگر سچ پوچھو تو حقیقت بھی یہی ہے کہ دیگر زبانوں کا الفاظ کی آمیزش سے کسی زبان کو بھی مفر نہیں صرف فرق یہ ہے کہ وہی الفاظ جو ابتدا میں غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے مقامی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور انجام کار اسی زبان کا جزو بن کر رہ جاتے ہیں۔ آیئے اسی کلیہ کے تحت زبانِ اُردو کا سونا بھی کسوٹی پر رکھ کر اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھیں۔

مطالعہ اور مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ایک زندہ زبان کہی جانے کی مستحق ہے اور ایک عرصہ سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اب اس وقت اس کو ترک کرنے کا سوال بالکل بے محل سا معلوم ہوتا ہے اگر مداحینِ زبان ہندی جدید اب بھی اُردو کی جگہ ہندی کو عوام میں رائج کرنا کارِ ثواب جانتے ہیں۔ تو معاف فرمایئے میں تو یہ کہوں گا کہ ان حضرات پر یہ مثال صادق آتی ہے کہ جیسے کوئی قدامت پسند اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے زمانۂ جدید میں بھی زمانۂ قدیم کے اصولوں کو دستور العمل بنائے ہو۔ اس سے انکار نہیں کہ یہ قدیم اصول بھی اپنے زمانے میں کسی خاص حیثیت کے مالک رہے ہوں گے۔ مگر اب جبکہ زمانہ کی رفتار نے ان کو تہ میں بٹھا دیا ہے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو بارِ دیگر زندہ کیا جائے۔ (بقیہ صفحہ ۱۰۴ پر دیکھئے)

فرمودات آثر

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

(از خامۂ عالیجناب نواب مرزا جعفر علیخاں صاحب آثر لکھنوی فائنینس منسٹر ریاست کشمیر)

آغازِ محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہے
متوالی رسیلی آنکھوں میں نیند ایسی گھُلی ہے کہ بس توبہ
طائر ہے نہ صیدِ وحشی ہے، دل ہے البتہ تڑپتا دل
آفت میں بلا میں گھرتے رہو، سرگشتہ و حیراں پھرتے رہو
کچھ مشقِ ندامت ہوتی رہے، کچھ عذرِ ستم بھی کرتے ہو
جو عشق کے فن کے ماہر ہیں ان سے پوچھو، تم کیا جانو
یہ جان کا خواہاں ہوتا ہے اے دل تو فریبِ اسکا سمجھ
کہنے کو تو ہم آزار کشیدہ کہتے ہیں اسکو کیا کیا کچھ
موسم اور وقت کی باتیں ہیں، راتیں ہیں نہ وہ ساتیں ہیں
کہنے اور طول سے کہنے کی حسرت تھی لیکن جب پوچھا

جب دلکو مسوسے بیٹھے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہے
فتنے تو اٹھانا اک جانب، جا دو بھی جگانا مشکل ہے
دیکھو تو ادھر، کوشش تو کرو، کیا ایسا نشانا مشکل ہے
یہ عشق کی وادی ہے۔ اسمیں آرام تو پانا مشکل ہے
جانوں کے کھپانیوالوں کو ہنس ہنس کر رلانا مشکل ہے
کب اشک بہانا مشکل ہے، اور کب پی جانا مشکل ہے
ہر لحظہ روٹھنے والے کو منت سے منانا مشکل ہے
انصاف یہ ہے اس جور پہ بھی یوں دلکو لبھانا مشکل ہے
رونے میں کبھی طوفان تھے، اب وہ اشک بہانا مشکل ہے
منہ اسکا تکتے رہ گئے یعنی حال سنانا مشکل ہے

میں میر کا دم بھرتا ہوں آثر ہیں اسکے کمال کا قائل ہوں
ہاں شعر تو تم کہہ لیتے ہو وہ بول بنانا مشکل ہے

عید مُبارک!
مشہورِ عالم کارخانہ
دی میسور اگربتی کمپنی
کی
تیار کردہ
نیرنگ دربار اگربتی (رجسٹرڈ)
استعمال کیجیے
جو
ہر جگہ
دستیاب ہوتی ہے
DURBAR BAT
دی میسور اگربتی کمپنی (رجسٹرڈ) مدرصاحب اسٹریٹ بنگلور سٹی۔ (برانچ) زکریہ مسجد بمبئی ۳

شیواجی دربارِ عالمگیر میں!

شیواجی یا سیوا نے عالمگیر کی افواج سے نبرد آزمائی کے بعد جب قلعۂ پورندھر کو محصور اور اپنی طاقت کو مغلوب ہوتا دیکھا تو اس نے صلح کی درخواست کی اور اطاعت قبول کرتے ہوئے ١٠٧٦ھ میں مزید ۲۳ قلعوں کی کنجیاں بلا تامل حوالہ کیں اور اپنا پائے تخت لینے کے لئے آگرہ روانہ ہوا۔ سیوا جب شہر کے قریب پہونچا تو عالمگیر نے کنور رام سنگھ کو جو راجہ جے سنگھ کا بیٹا تھا مع مخلص خاں کے سیوا کے استقبال کے لئے بھیجا سیوا نے دربارِ عالمگیری میں باریاب ہو کر پہلے آداب بجالایا اور پھر عالمگیر کو نذر پیش کی۔ عالمگیر نے اشارہ کیا کہ پنجہزاری امرار کی قطار میں اس کو جگہ دی جائے لیکن سیوا کی توقعات اس سے زیادہ تھیں اس لئے اس نے وہیں دربار کے ایک گوشہ میں رام سنگھ سے شکایت کی اور دردِ شکم کے بہانے سے فرش پر لیٹ گیا بنا بریں عالمگیر نے حکم دیا کہ وہ فوراً اپنی فرودگاہ کو واپس جائے!

ISMAILI P. PRESS, BOMBAY, 3.

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

عید نہیں

از حضرت شاد عارفی!

عید کا دن ہے کوئی سلسلۂ دید نہیں
دید ہے عید اگر دید نہیں عید نہیں

عید اگر نام ہے محبوب کے نظارے کا
میں قسم کھا کے یہ کہہ دوں گا مری عید نہیں

عید کے روز تو جائز ہے گلے مل لینا
آپ کی ذات سے لیکن مجھے امید نہیں

عید کا روز مقرر ہے ملاپوں کے لئے
ان کی جانب سے ابھی تک کوئی تمہید نہیں

کون محروم تمنائے ملاقات ہے ؟ "میں"
عید کس کی نہیں دنیا میں، مری عید نہیں

وہ لب بام، "کوئی چاند" چمکتا ہے شاد
میں نے اب تک یہ کہا تھا کہ مری عید نہیں!

"میری عید"

بجا کہ عید آئی ہے نشاطِ بیکراں لئے
تبسم اور قہقہوں میں سر پہ آسماں لئے

زمیں پہ جھک پڑی ہیں ہا! کہکشاں کی رونقیں
فضائے آسماں لئے بہارِ بوستاں لئے

جہاں آب و رنگ و بو میں بس گئی ہیں نکہتیں
صباحت جبیں کے ساتھ شوخ سرخیاں لئے

لئے شرابِ ارغواں سرور و کیف بے خودی،
سرور و کیف بیخودی، "شباب نوجواں" لئے

مصافحوں، معانقوں میں سب نے لطف یکدلی
ادھر لئے ادھر لئے یہاں لئے وہاں لئے

"امید کامراں" کی دھن میں گھر سے چل چکے ہیں کچھ
پلٹ کے آرہے ہیں کچھ "امید کامراں" لئے

زمین بندگی ہے آج، ہر امین بندگی.....
جبینِ بندگی کے رخ پہ نور عز و شاں لئے

وہی چہل پہل وہی، وہی سرمیں وہی.....
غرض پھر عید آئی "روشناس خوبیاں" لئے

مگر وہ ہجر آشنا جو زندگی سے تنگ ہے
چلا ہے جو ازل سے دل میں درد داستاں لئے

وہ اس ہجوم دلکشا سے شاد بہرہ ور نہیں
کب آئی عید کب گئی، پتہ نہیں خبر نہیں

ماہِ صیام کے مبارک مہینے کے اختتام پر ہلال عید اوج فلک پر اپنی عظمت و شوکت اور درخشانیوں کے ساتھ طلوع ہو کر حقیقتاً ان برگزیدہ ہستیوں کو مبارکبادی کا دلنشیں اور رُوح پرور پیام سناتا ہے جنھوں نے تیس روز تک اپنے نفس کو جلا جلا کر خدائے قدوس کے ساتھ اپنی فداکاری، جاں نثاری، سچی قربانی جذبۂ اطاعت و بندگی کا بے مثل ثبوت دیا ہے۔ ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم بھی صمیم قلب سے ان کو پیغام مبارکباد دیتے ہوئے ان کے لئے یہ دعائے خیر کریں کہ ان کے روزے اور نماز بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت حاصل کریں آمین۔

عید مشتق ہے عود سے جس کے معنی بار بار آنے کے ہیں چونکہ یہ مُبارک دن برکات و احساناتِ الٰہی کو ساتھ لئے ہر سال آتا ہے اس لئے اصطلاحاً اسکو یوم العید کہتے ہیں۔ اس کی آمد رمضان کی کھانے پینے کی بندشوں کو ہٹا کر ہر قسم کے خورد و نوش کی اجازت دے کر دلوں کو مسرت اور خوشی سے بھر دیتی ہے اسلام کے ہر چھوٹے سے لیکر بڑے کام میں حکمتِ الٰہی اور مشیت ایزدی یہی رہی ہے نہ وہ اسلام کے ہمہ گیر مذہب کی جملہ باتوں کو دیگر مذاہب سے اس طرح مختص اور ممیز کر دے جس طرح انسانی صنعت سے فطرت کے ہر کام میں بین فرق پیدا ہو جاتا ہے

اسلام کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ مذہب اسلام بہ نسبت دوسرے مذاہب عالم کے زیادہ آسان اور ممکن العمل ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کہنے میں سچائی اور حقیقت کو بہت ہی کم دخل ہے بلکہ اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام دیگر مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ مشکل اور دقت طلب ہے۔ مجھکو یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ لوگوں کی اس غلطی کا اصل ماخذ یہ ہے کہ جب چھوت چھات اور دوسری رکاوٹوں کے باعث دوسرے مذاہب میں بار یابی مشکل ہو جاتی ہے۔ تو لوگ اسلام میں محض لا الہ.... کہہ کر داخل ہو کر اس کے آسان ہونے کی غلط در غلط تاویل کر کے ایک زبردست حقیقت سے انحراف کرتے ہیں۔ ع

کافر نتوانی شد..... ناچار مسلماں شد

میں پوچھتا ہوں اور غالباً میرا یہ پوچھنا قطعاً بے محل اور نامناسب نہ ہوگا کہ کیا ہمارے مذہب میں اصول اور سخت پابندیوں کی نگہداشت نہیں ہے؟ کیا اس مذہب میں رہ کر ہم حدود اللہ سے تجاوز کر سکتے ہیں۔ کیا ہم پر حقوق اللہ، حق العباد حقوق والدین۔ حقوق ہمسایہ۔ حقوق دوست و دشمن نہیں عائد ہوتے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو مجھکو بتایا جائے کہ یہ مذہب کیسے آسان ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس مذہب کو اختیار کرنے اور اس کو پوری محنت اور دیانت داری سے سمجھکر عمل کرنے کے بعد یہ ہماری زندگی کے مشکل سے مشکل مسائل کو آسان کر دیتا ہے۔ دنیا میں صرف یہی ایک مذہب ہے جو فطرت کے ہر اصول کیساتھ چل کر انسان کو غلامی سے آزاد کر کے صرف ایک ہی آستان پہ جھکنے کی دعوت دیتا ہے جہاں جھکتے ہی ماسوا سے ترکِ تعلق کر کے جو کچھ کرتا ہے صرف خدا کی خوشنودی اور رضا مندی کے لئے کرتا ہے۔ اس کا اٹھنا۔ بیٹھنا۔ کھانا۔ پینا۔ چلنا پھرنا۔ مرنا جینا سب اسی ایک معبود کے حکموں کی تعمیل میں ہوتا ہے غرض یہ کہ ایک انسان کی ساری زندگی کا ایک مکمل ضابطہ اور پروگرام ہے جس پر چل کر انسان دین و دنیا دونوں میں بہترین فلاح و بہبود حاصل کر سکتا ہے۔ قل انی..............

عہدِ نو کا آغاز

بلاشبہ ہم مسلمانوں کے لئے یہی وقت ہے کہ ہم اسلامی تمدن اسلامی کلچر اور اسلامی اصول کی تشکیل جدید الٰہیات اسلام کے لئے دل و جان سے کوشش کریں لیکن اس کوشش میں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ہمارا کوئی قدم قرآن کریم اور سنتِ رسول کے خلاف نہ اٹھے یہ ایک زبردست فرض ہے جو قرآن کی رُو سے ہم تمام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ زمانہ حال کی مادہ پرستی اس حقیقت کو واضح طور پر ظاہر کر رہی ہے کہ ہر ذی ہوش اس سے تھک کر اور بیزار ہو کر ایک ایسے صحیح وجدان کا متلاشی ہے جو اس کو مادیات کی زہریلی، اندھیری اور متعفن دنیا سے نکال کر ایک ایسی صاف ستھری فضا میں ڈالدے جہاں اس کی روحانی تشنگی سیراب ہو سکے۔

صدیوں کے گھناؤنے تعصب۔ انسانیت سوز خوف، دردناک بیماریوں، بربادکن افلاس۔ غم و رنج۔ اداسی و مایوسی افسردگی اور قنوطیت نے انسانیت کو اتنی سخت زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے کہ اس کی تمام فطری قوتیں گھٹ گھٹ کر جان توڑ رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا، انسانیت اور دنیا کے غلط تصور نے انسان کی ایسی زبوں حالت کر دی ہے۔ کہ وہ اس میں پڑا درد و کرب سے چلا رہا ہے لیکن عقل سلیم اور سیدھی سمجھ سے کام لے کر اتنا غور کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کی اس

مہلک بیاری کا حقیقی علاج اور مداوا کیا ہے؟ اس غلط اور سراسر لغو تصور نے ان کے جسم قلب اور دماغ کو بیمار۔ ناتواں اور ضعیف کرکے ان کو اس لذت سے محروم کر دیا ہے جو ایک روشن قلب۔ مسرور رُوح اور شاداں و فرحاں دماغ ہر لحہ انسان کو عطا کرتا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اختصار اور مبہم اشارہ سنجیدہ اور غور کرنے والے دماغوں کیلئے کافی ہے جو ایک پتہ کی پژمردگی اور کملاہٹ سے خزاں کی آمد کو سمجھ جاتے ہیں لیکن ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کے نفسیات کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں کہ کسی بڑے انقلاب کے بغیر اپنی جگہ سوچنا اور غور کرنا نہیں چاہتے گویا وہ کسی بڑے زلزلے یا ہولناک جنگ یا خوفناک طوفان کے منتظر رہتے ہیں۔ جوان کے جامد اور سخت تخیل کے زاویوں میں تبدیلی پیدا کرکے ان کو انقلاب کا مزا چکھا دے موجودہ مہیب اور ہلاکت آفرین جنگ نے بھی خدا کے نظریہ میں اگرچہ براہِ راست نہیں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ ایک زمانے میں روس نے مسجدوں کو توڑ توڑ کر تھیٹر اور ناچ گھر بنایا تھا۔ آج دیکھنے والی آنکھیں حیران ہیں کہ وہی روس بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر زیرِ لب آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا ہے کتنا سچ کہا ہے مولانا ظفر علی خان نے ؎

اے نالۂ مظلوم کی تاثیر کے منکر....
آتشکدہ یورپ سے جو اٹھتا ہے دھواں دیکھ
وہ قصر جو اسلام کے کھنڈروں پہ بنا تھا
اب چاٹ رہی ہے اسے شعلوں کی زباں دیکھ

وسیع النظر لوگ اس کا پورا احساس کرتے ہیں کہ ہر لحہ ہم کو خدا کی قدرت سے فائدہ ہو رہا ہے۔ ہم اس رب العالمین کے ہر وقت زیرِ سایہ اور حضور میں ہیں مغرب میں مادہ پرستی اپنے انتہائی نقطہ پر پہونچ چکی ہے مصنوعی عیاشی کی عالمگیر خواہش کے خلاف ردِ عمل شروع ہو گیا ہے۔ تبدیلی نصاب کا آغاز ہے قدیم نصاب کے ساتھ جدید نصاب روز بروز ملتا جاتا ہے۔ پرانے مدرسین جو مسجدوں میں بوریوں پر بیٹھ کر صرف دینیا اور مذہبی تعلیم دینا اپنا فرض سمجھتے تھے اب اپنے نصاب میں نمایاں ترمیم کرکے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ بلاشبہ اسلام ترقی پر ہے۔ لیکن مسلمان... طالب علموں کو چاہئے کہ وہ غیر مسلم کلچر کی زہر چکانیوں اور بے ہودگیوں سے اپنے آپ کو بچائیں جو... آج دُنیا میں ہر طرف الحاد۔ مادہ پرستی۔ لامذہبیت اور گھناؤنا تعصب اور رُوح فرسا تنگ نظری پھیلا کر انسانیت کو سولی کے تختہ پر لٹکا کر تازیانے پہ تازیانے لگا رہا ہے...... مسلمان نوجوانوں کو اس دُنیا میں جو کرنا ہے: مذہب۔ اپنی قوم اور کل دنیا کے انسانوں کے لئے جو آج غلط و مبہم تصورات میں پڑ کر سرگرداں پھر رہے ہیں۔ مشعلِ راہ بننا ہے اگر وہ ایسے ہی ذلیل مذموم اور گھناؤنی باتوں میں کھو گئے تو وہ خدا کا عظیم الشان گناہ کرکے اپنے اور اپنی قوم اور تمام دنیا کی آبادی کے کتنے زبردست نقصان کا موجب ہوں گے؟ مغرب کے انحطاط کے اسباب میں یہی چیزیں ملتی ہیں کہ اس کی مادہ پرستی نے روحانیت کو تباہ کرکے اس کے وجود کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش میں اپنے رات دن ایک کر دئے چنانچہ موجودہ جنگ صاف صاف بتاتی ہے کہ خدا کا منکر ہو کر انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا ترقی اس میں ہے کہ مادیت۔ روحانیت کے حدود سے نکل کر کوئی کام کرنے کی جرأت نہ کرے۔ اگر اس کے خلاف ہوا تو ترقی روبہ زوال ہو جاتی ہے۔

مادہ پرستی کی انتہا

جب مادہ پرستی اپنے انتہائی نقطہ پر پہونچ کر انسانیت کی رُوح کو درد و تکلیف اور غم و رنج سے سخت آزردہ کر رہی ہو اس وقت ایک ایسے عالمگیر اصول ایسے معقول ضابطے کی ضرورت ہوتی ہے جو ہماری روزانہ زندگی سے وابستہ امور کو سلجھا کر ان میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دے اور میرے خیال میں ایسا نظام اور لائحۂ عمل سوائے اسلام کے اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کی انتہا نہیں

شکسپیئر اس دنیا کو محض ایک تماشاگاہ سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس تماشاگاہ عالم میں تمام انسان خواہ وہ مرد ہوں کہ عورتیں محض اداکار کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک دروازے سے داخل ہوئے ہیں اور ایک معین مدت کے بعد دوسرے دروازے سے نکل جاتے ہیں اور یہ کہ ہر شخص اپنے زمانۂ زندگی میں مختلف کام انجام دیتا رہتا ہے جس کو وہ سات دور میں تقسیم کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ پہلا دور وہ ہوتا ہے جس میں بچہ محض معصوم اور ہر چیز سے ناواقف رہتا ہے دوسرے دور میں وہ اسکول جاتے ہوئے کبیدگی محسوس کرتا ہے اور تیسرے دور میں ایک پُر شباب.... جوان کی صورت میں آہیں کھینچتا ہے۔ اور اس کا دل تپشِ محبت سے ہر وقت جلتا رہتا ہے چوتھے دور میں وہ ایک سپاہی کے جذبات سے بھرا ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ تازہ اور پُرامید حوصلے اور ارادے ہوتے ہیں وہ دنیا کو دیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ چپہ چپہ اس کے زیرنگیں آجائے۔ پھر پانچویں دور میں اس میں عقل و حکمت پیدا ہو جاتی ہے وہ ہر کام میں غور و فکر اور عقل و تدبیر اور انصاف کو کار فرما دیکھنا چاہتا ہے اور چھٹے دور میں ناتوانی: ضعف، عدم طاقتی اور لاغری اس کی مصاحب ہوتی ہیں اور آخری دور میں اس کا بچپن پھر عود کر آتا ہے اور وہ بچوں کی طرح زار و نزار لاغر و کمزور مجبور و لاچار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بالکل خلاف اسلام زندگی کے ختم اور سمٹنے کا قطعی منکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان پہ کبھی موت طاری ہی نہیں ہوتی زندگی جاودانی اور غیر فانی ہے اور وہ اپنے کاموں کے لحاظ سے آگے بڑھتی جاتی ہے جسکو لفظاً موت سے تعبیر کرتے ہیں وہ صرف ایک منزل ایک ٹھہراؤ ایک قیام ایسا ہے جہاں سے انسان پھر دوسری زندگی کے راستے پہ چلنے لگتا ہے۔ وہ غفلت۔ عیش کوشی۔ جمود اور بےحسی کو موت سمجھتا ہے جو انسانیت کی دشمن اور انسانی ترقی کی سب سے بڑی حریف ہے۔

اسلام کے پانچ ارکان

ایک مسلمان کے لئے ضروری بلکہ جس کے بغیر وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہو ہی نہیں سکتا یہ ہے کہ وہ اسلام کے پانچ ارکان کا پوری طرح پابند ہو اور ان کی بجا آوری اپنی زندگی کا عین فرض یقین کرے۔

توحید

توحید کی حقیقی تعریف یہ ہے کہ انسان تمام ماسوا سے ترک تعلق کرکے صرف ایک آستان کی جبہ سائی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے اس کا اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا۔ پھرنا۔ مرنا۔ جینا سب خدا ہی کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے ہو اور وہ اس کی بندگی میں اتنی مضبوطی اتنی پائداری اور اتنا پختہ یقین پیدا کرے کہ اگر

اس کو اس کی راہ میں اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔ من کان اللہ کان اللہ لہٗ جب وہ بندہ اس طرح اطاعت میں محو ہو جاتا ہے تو خدا بھی اس کا ہو جاتا ہے۔

صلوٰۃ ایمان بالغیب کے بعد قرآن کریم کی سب سے پہلی تعلیم اقامت صلوٰۃ ہے یعنی نماز قائم کرو یہ فرض بلا استثنا ۱۰ سال کی عمر میں ہر مسلمان عورت اور مرد پر عائد ہو جاتا ہے جس کی بجا آوری میں کوئی عذر کوئی حیلہ ہرگز درست اور روا نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنی پابندی کرنیوالوں میں پابندی وقت طہارت۔ ضبط نفس اور تنظیم جماعت پیدا کرتی ہے۔ ایمان۔ مساوات ہمدردی۔ قربانی اطاعت امیر کا جذبہ پیدا کر کے تمام جماعت اور قوم میں یکا اور اتحاد کی روح پھونک دیتی ہے چھوٹے بڑے۔ ادنیٰ و اعلیٰ۔ جاہل عالم۔ غریب امیر۔ سب کو ایک صف میں کھڑا کر کے اعلان کرتی ہے کہ کوئی حق نہیں رکھتا کہ بعد میں آئے اور صف اول میں جگہ پائے اور جو پہلے آئے ہوئے ہیں ان کو اٹھا کر پچھلی صف میں بیٹھنے پر مجبور کرے اس دربار شاہی میں کسی کی نشست مخصوص نہیں جو جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے یا کھڑا رہے۔

مساوات میں امارت۔ غربت پستی بلندی کا مطلق لحاظ نہیں سب کے سب دوش بدوش بلا تفریق اور بلا خیال مدارج ایک ہی قطار اور ایک ہی صف میں دست بستہ کھڑے ہو کر اپنا رخ ایک ہی قبلہ اور ایک ہی مرکز

کی طرف پھیر دیتے ہیں اقبالؔ نے کتنا بہترین اور حقیقی نقشہ کھینچا ہے ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز ٭ قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ٭ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے ٭ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

تنظیم مسلمانوں کو فوجی رمز اور قواعد کے بہترین اصول سکھا کر ان میں ایک ضبط اور ایک نظام کے پابند کرنے کی خو اور عادت پیدا کر دیتی ہے ان کو تعلیم دیتی ہے کہ وہ دن رات میں پانچ بار اذان کی آواز سنتے ہی چاہے دن ہو کہ رات۔ بارش ہو کہ طوفان۔ پتھر گرتا ہو کہ اولے برستے ہوں گھر سے نکل کر مسجد کا رخ کریں، اور وہاں ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر امام کے پیچھے اس طرح کھڑے ہو جائیں کہ امام اگر ان کو آگ میں کودنے اور سمندر میں پھاند پڑنے کا بھی حکم دے تو اس سے سر مو انحراف نہ کریں اس سے روگردانی کرنے والا جماعت سے خارج اور اسلامی اصولوں کا باغی سمجھا جاتا ہے۔ من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر۔

اطاعت امیر جس طرح مقتدی نماز میں امام کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا اس طرح اطاعت امیر بھی ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم ہے یعنی اگر امیر قرآن اور سنت رسولؐ سے انحراف نہیں کرتا ہے تو ہر مسلمان کا یہ لازمی فرض ہے کہ ان کی اطاعت میں غفلت نہ برتے نماز کی ان فوائد کے علاوہ بڑی خصوصیات یہ بھی ہیں کہ وہ دن

غیر مطبوعہ

خاص الاصلاح عید نمبر کے لئے

ارشادات عالیہ

(افضل الشعراء عالیجناب محمود علیخاں صاحب محمودؔ رامپوری مرحوم و مغفور)

وہ کافر ہیں یہ بیت جس بات پر ظالم مچلتے ہیں ٭ سنبھالے سے سنبھلتے ہیں نہ بہلائے بہلتے ہیں

عجب مشکل ہے جیتا ہوں تو وہ جینے نہیں دیتے ٭ جو مرتا ہوں تو پھر ارمان غیروں کے نکلتے ہیں

ترے ارمان ترے پیکان نئے مہمان ہیں قاتل ٭ نکالے سے نکلتے ہیں نہ یہ ٹالے سے ٹلتے ہیں

نئے انسان کو اکثر بلا لیتے ہیں وہ شب کو ٭ فقط اس واسطے ہر روز ہم صورت بدلتے ہیں

کسیکو وصل میں ہوتی ہے شادی مجھکو یہ غم ہے ٭ جو ارمان ہجر میں ہمدم تھے وہ دل سے نکلتے ہیں

یہ نقشہ ہو گیا ہے اب ہماری ناتوانی کا ٭ جگر میں درد اٹھتا ہے جو ہم پہلو بدلتے ہیں

عدو سے ملکے چھپ چھپ کر دئے ہیں نیش غم تو نے ٭ وہ کوئی خار چبتے جی مرے دل سے نکلتے ہیں

کہا جب میں نے ان سے چاہنے والا نہیں ملتا ٭ تو بولے چاہنے والا کی ہم صورت سے جلتے ہیں

وہ ان کا راہ میں ملکر یہ کہنا یاد آتا ہے
کہاں جاتے ہوئے محمودؔ ٹھہرو ہم بھی چلتے ہیں

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

عیدِ ماضی و حال

از حضرت اعجاز صدیقی اکبر آبادی مدیر ماہنامہ شاعر (آگرہ)

اے خوشا وہ دن بھی تھے کس درجہ عشرت کنار
ہر طرف موجِ شگفتِ گل، ہر اک جانب بہار

دامنِ انسانیت تھا زرنگار و زرفشاں
سجدہ گاہِ آدمیت تھی بساطِ کہکشاں

تھے مہ و خورشیدِ دل کی جلوہ گاہوں میں چھپے
طور تھے لاکھوں نگاہوں کی پناہوں میں چھپے

مست و بیخود بادۂ عرفاں سے تھی بزمِ حیات
نغمہ ہائے سرمدی سے گونج اٹھی تھی کائنات

تھے جنوں میں بھی انداز خودی و بیخودی
بت شکن پیدا ہزاروں تھے یہ فیضِ بت گری

ایک نعمت تھی توکل کی بہارِ زندگی
جلوہ گر تھی روح میں صدق و صفا کی روشنی

جذبۂ صادق سے تھا ہر قلب گرمایا ہوا
شام کے گیسو پہ تھا رنگِ سحر چھایا ہوا

صرف تھا "نورِ ازل" "عین الیقیں" "حق الیقیں"
غیر کے در پر کسی پہلو نہ جھکتی تھی جبیں

امتیازِ ما و تو سے قومیت بیگانہ تھی،
خودروی تھی اک کہانی، خودسری افسانہ تھی

آدمی بازارِ ہستی میں نہ تھا ایماں فروش
سینۂ مومن میں تھا اک واقعی جوش و خروش

تھے ریاکاری سے خالی اپنے روزے اور نماز
ایک ہی صف میں نظر آتے تھے محمود و ایاز

کانپتی تھی سطوتِ مسلم سے ساری کائنات
ایک ہی مرکز پہ کھنچ آئی تھی روحِ شش جہات

بوذرؓ و سلماںؓ، جنیدؒ و خالدؓ و حیدرؓ، بلالؓ
لاکھ پروانے تھے اور تھی ایک شمعِ لایزال!

عید اُن کی تھی، جو تھے پابندِ شرعِ احمدیؐ
تھا نظر کش جن کا حد درجہ مذاقِ سادگی

عید اُن کی تھی، کہ جو حق کیش و حق آگاہ تھے
آسمانِ وحدتِ قومی کے مہر و ماہ تھے

عید اُن کی تھی، کہ جو فاقوں میں بھی ہنستے رہے
خشک لب، تنہا خدا کی راہ میں قرباں ہوئے

عید اُن کی تھی، امینِ قوم تھے جو سربسر،
قومیت سازی کے مقصد پر رہی جن کی نظر

عید اُن کی تھی، جو تھے دینِ مبیں کے جاں نثار
دردِ ملت سے جو رہتے تھے ہمیشہ بے قرار

عید اُن کی تھی، جو تھے انسانیت کا شاہکار
تھا ہلالِ عید کا زیبا انہیں کو انتظار

ہم کو خود معلوم ہے، جیسی ہماری عید ہے
ماضیِ اسلام کی پر خود غلط تقلید ہے،

سیم و زر کے صرف سے یہ عید کی زیبائشیں
یہ نمائش کاریاں، یہ کھوکھلی آرائشیں،

اپنے ملبوسِ حریری کی یہ قبلِ عید فکر
دوستوں کی محفلوں میں عید کے ساماں کے ذکر

ہوں نمود و فخر کے جب تک نہ سب ساماں بہم
پڑھ نہیں سکتے کسی صورت نمازِ عید ہم

ہو نہ جب تک خودنمائی و خودی کا تکملہ
سوئے منزل چل نہیں سکتا ہمارا قافلہ

اس سے کیا، رکھا نہ ہو گر ہم نے روزہ ایک بھی
اس سے کیا، ہوتا رہا ہو ترکِ فرضِ منصبی!!

اس سے کیا، ہوں پیٹ سے گر قوم کے پتھر بندھے!
کٹ رہی ہوں ظلم کے ہاتھوں سے انساں کے گلے!!

اس سے کیا، ہوں کتنے ہی نالہ کناں بیکس یتیم!
قلب بیواؤں کے رنج و غم سے ہو جائیں دو نیم!!

اس سے کیا، ہوں قوم کے افراد فاقوں سے نڈھال!
اس سے کیا گر ہو دلوں میں سوزشِ زخمِ ملال!!

اس سے کیا، گر ہو نہ اک چیتھڑا کسی کے جسم پر!
ٹھوکریں مزدور کھاتے پھر رہے ہوں در بدر!!

اس سے کیا، چاروں طرف گر جنگ ہو شعلہ فشاں!
اُٹھ رہی ہو دہر کے ذرّوں سے آوازِ فغاں!!

اس سے کیا، خطرے میں ہو ہر سلطنت اسلام کی!
اس سے کیا، بربادیاں ہو جائیں مصر و شام کی!!

اس سے کیا، ترکوں کے سر پر ہو ہجومِ رنج و غم!
اس سے کیا، ہو موت کی آغوش میں سارا عجم!!

اس سے کیا، ہندی مسلماں ہو اسیرِ ظلم و جور!
ختم کر دینے کا اس کے ہو طریقہ زیرِ غور!!

اس سے کیا، ہو اقلیت پر اکثریت فتحیاب!
اس سے کیا ہو جائے ہم پر زندگی کا سدِ باب!

عید اپنی ہم منائیں گے اسی انداز سے
لے ملائیں گے مسرت کی بجھی آواز سے

اے مسلماں، آسمانِ عظمتِ ملت کے چاند
ہو گئی کیوں تیرے دل کی روشنی اس درجہ ماند؟

دہر میں ظلمت بداماں کہہ رہے ہیں سب تجھے
فکر ہو گی اس گہن سے چھوٹنے کی کب تجھے

تو یوں ہی دیکھے گا کب تک قوم کے ادبار کو،
موقعِ تضحیک دیگا کب تلک اغیار کو؟

غمگسارِ قوم بن، خدمت گزارِ قوم بن،
ہو سزاوارِ بہارِ زندگی تیرا چمن،

کر کچھ اس انداز سے کردار کی نشو و نما
از سرِ نو دینِ حق ہو فیضیابِ ارتقا،

آخری سانسوں پہ ہے عمرِ درازِ کائنات
کاش اب بھی ڈھونڈ لے غافل کوئی راہِ نجات

چھپے کہاں ہیں سوز و گدازِ زندگی
اُٹھے گا کبھی پردۂ اسرارِ زندگی
کھل جائے گا اک روز یہ عقدۂ معظم
مرے ساقی تو ہے رازدارِ زندگی

رات میں پانچ بار مسلمانوں کو ایک جگہ اور ایک مسجد میں متفق اور متحد کر کے ان کو اس بات کا موقع دیتی ہے کہ وہ باہمی تبادلۂ خیالات کر کے ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی حاصل کریں۔ بے حیائی بے شرمی اور لغو اور فضول باتوں سے اجتناب کریں منشیات سے دور رہیں۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ اس کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔

روزہ دنیا کی فطرت کی بنیاد دیکھ اس نہج پر ڈالی گئی ہے کہ ہر رنج کے بعد خوشی اور ہر تکلیف کے بعد راحت اور ہر مشکل کے بعد آسانی لازمی ہے شریعت محمدیہ کا منشائے حقیقی یہ ہے کہ روزہ خواہشات نفس اور ہوا و ہوس کو روکے اور فضول طعام فضول کلام فضول نیام یعنی بیجا کھانے بیجا بولنے اور بیجا سونے سے محترز رہے اور پھر اس کے خوشگوار نتائج یعنی دولت اور عزت پہنچ جانے اور بہرہ مند ہونے کا نام عید ہے۔ اخوت و مساوات صبر و شکر استقامت و پرہیز گاری سے ایک شادمانی پیدا ہوتی ہے اور یہ زندگی کا وہ پیغام ہے جو انسانی فطرت کو بیدار کر کے عفو اور دل اور ایمان کو ہر قسم کے گرد و ... ان کر دیتا ہے۔ اور انسان کا رشتہ ... جوڑ دیتا ہے اور دوسری طرف شخصی اور اجتماعی زندگی کا راز ... حقیقت یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں پر بھوک و پیاس کا راز افشا ہو جاتا ان کی معاشرت اور ان کی زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے اس مہینہ میں ال... بارگاہ حق پروردگار ضبط کر لی جاتی ہیں تاکہ ان کا روحانی اور فطری شعور بیدار ہو جائے۔ آرام طلبی عیش پروری اور مادہ پرستی کا رجحان نفس کشی مصائب برداری اور فیض روحانیت سے بدل جائے۔

اور یہ کہ جملہ بداخلاقیاں اور ذمائم دور ہو کر بلند اخلاق اور شریفانہ خصائل اور محبت و غمخواری کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ اس سے ذاتی فائدہ یہ ہے کہ (۱) معین وقت کے ساتھ کھانے پینے سے جسمانی صحت بلند ہو جاتی ہے (۲) کفایت شعاری کی اہمیت اور رزق کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے (۳) دوسروں کی مصیبت و تکلیف دل میں احساس درد پیدا کرتی ہے۔

زکوٰۃ علم معاشیات (Economics) وہ علم ہے جس سے انسان روزانہ انسانی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے علم فرد اور جماعت کے اس حصہ کی تشریح کرتا ہے جو مادی ضروریات اور فلاح و بہبود کے صحیح اور مناسب استعمال سے گہرا تعلق رکھتا ہے یہ علم اگر ایک طرف دولت اور اس کے حصول کے گہرے مطالعہ کی تعلیم دیتا ہے تو دوسری طرف دنیا وہ اہم طور پر انسانی فطرت پر باریک بینی سے نقد و تبصرہ کرنے کے قواعد سکھاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک واضح نقشہ انسان کے دماغ میں کھینچ کر تشریح کرتا ہے کہ دولت کا صحیح اور نامناسب صرف کیا ہے اور اس .... سے بچنے کے راستے اور وسائل کیا ہیں۔ اس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے کہ (کلوا واشربوا ولا تسرفوا) یعنی کھاؤ پیو مگر بیجا صرف نہ کرو کیونکہ خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(بقایا صفحہ (۱۰۳) پر ملاحظہ فرمایئے)

خاص الاصلاح عید نمبر کے لئے!

ایک غریب شاعر کی عید!

(از تاج الشعراء پروفیسر علامہ حکیم تاج الدین احمد صاحب تاج (لاہور))

چھوڑا جو شب نے ہاتھ سے دامانِ صبح عید
پھر بن گیا وہ چاک گریبانِ صبح عید

ہیں مردہ حسرتیں دلِ حرماں نصیب کی!
گاتے ہیں ان کا مرثیہ مرغانِ صبح عید

کیا بخت نارسا پہ مرے اوس پڑ گئی
مرجھا گیا ہے میرا خیابانِ صبح عید

پیمانۂ نشاط کی مٹی خراب ...... تھی
ٹوٹا ہوا تھا شب ہی سے پیمانِ صبح عید

رنج و غم و الم کا ہے تانتا لگا ہوا
آتے ہیں کیسے ٹھاٹھ سے مہمانِ صبح عید

میرے لئے وہ گوشۂ خلوت بنا رہا
لگتا تھا مجھ پہ تنگ تھا میدانِ صبح عید

کوڑی کا کر دیا مجھے اس بے زری نے ہائے
دل ہی میں رہ گئے مرے ارمانِ صبح عید

گویا یہ آئینہ ہی مری بے زری کا ... آج
ہے زرد کیوں کہ مہرِ درخشانِ صبح عید

عیش و طرب کی زمزمہ آرائیاں کہاں؟
سونا پڑا ہے میرا گلستانِ صبح عید

دنیا کو درہم و دینار کو نثار
اور میں کروں گا حسرتیں قربانِ صبح عید

اے تاج شاہ دیں نے نگاہ کرم جو کی!
ہر صبح پھر لائے گی سامانِ صبح عید!

از حضرت ملّا رموزی بھوپال

غازی خان ایک خاندانی رئیس کے بیٹے ہیں۔ خاندانی رئیس سے مراد وہ خاندان جس میں ذاتی قابلیت سے نہیں بلکہ وراثت کی اندھا دھند خوش نصیبی سے دولت حشمت اور فراغت منتقل ہوتی چلی آئی تھی۔ والد صاحب نے انیسویں صدی کے آغاز کے اثرات سے غازی خان کو ساتوں ولایت گھومنے کا موقع دیا تھا اس لئے غازی خان یورپ کی طویل سیاحت سے واپس آکر وطن میں پہچانے بھی نہیں جاتے تھے اور بجز ہندوستانی رنگ اور صورت کے یہ ہر طرف سے ولایتی نظر آتے تھے۔ البتہ ایک ہندوستانی بدقسمتی آپ سے عنفوانِ شباب ہی سے چمٹ گئی تھی اور وہ تھی ایک کم حیثیت کی ہندوستانی عورت سے شادی۔

اب جو غازی خان کو اچانک والد کی تمام دولت ان کی وفات سے حاصل ہوئی تو اب غازی خان تھے اور یورپ کا ایک ایک قاعدہ دہرایا جاتا تھا احباب میں بی، اے، پاس سے کم لیا نہیں جاتا تھا۔ تمام کاروباری معاملات میں اردو کے عوض انگریزی کا حکم دیدیا گیا تھا۔ ذاتی محرر کو پرائیوٹ سکرٹری کے نام سے یاد فرماتے تھے۔ مگر دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ مسلم لیگ کے کالی جھنڈی والے رضاکاروں کا کافی زور تھا اور بیلچہ بردار خاکساروں کا شباب، اسی لئے غازی خان کو کبھی کبھی اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دینا ہی پڑتا تھا۔ لہذا کبھی کبھی اپنی کوٹھی میں کسی قومی کارکن کو بھی چائے پر یاد فرما لیتے تھے۔ اور بس اسی وقت شیروانی اور ترکی ٹوپی میں نظر آتے تھے مگر مصیبت بالائے مصیبت آپ کی وہ کم حیثیت کی بیوی صاحبہ تھیں۔ جو دولت کی روزافزوں کثرت سے اب حد فراغت سے بہت آگے بڑھ چکی تھیں۔ خدمت میں خادموں کی ایک فوج تھی اور سواری میں، موٹر پر موٹر، اس لئے موصوفہ کی گفتگو میں گنوار پن سے بھی دو لٹھ آگے کا غرور تھا۔ ہر سانس میں دس مرتبہ اپنے شوہر کو "صاحب" کہتی تھیں۔ اور ہر لمحہ ولایتی جوڑوں پر جوڑے بدلتی تھیں کہ ناگاہ رمضان شریف کا مہینہ آگیا اور عین اس زمانے میں آیا جب مسلم لیگ کے کارکنوں نے مسلمان وزرائے اعظم تک کے خلاف ایک ہفتہ کا نوٹس دیدیا تھا اور بنگال کے صدر اعظم تک کے پیچھے سیاہ جھنڈیاں لئے پھرتے تھے۔ اس لئے غازی خان کو اپنے زبردست "مسلمان" ہونے کا ثبوت دینے کی کافی فکر تھی۔ مگر عادت اور رواج کو کیا کہا جائے کہ ہندوستان کے کسی ایک شہر میں یہ رسم ہی نہیں کہ اگر محلے کا رئیس محلے کی مسجد میں پانچ وقت نماز باجماعت ادا نہ کرے تو اس کا حقہ پانی بند۔ اور یہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ ساری قومی تحریکات کا درد غیر منظم مسلمانوں کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور یہ غریب ان تحریکات کے لئے چندے دیتے ہیں۔ غازی خان قسم ہی کے دولت مندوں سے اس لئے تحریکات اور چندوں کے بقاء کے لئے غریب مسلمان اکثر دولت مند مسلمانوں کے عیوب اور شرعی خطاؤں تک پر کچھ نہیں کہتے۔ ممکن ہے کہ غریبوں کی شریعت میں یہ جائز ہو اللہ کی شریعت میں تو نہیں۔

اس لئے غازی خان نے فوراً حکم دیا کہ ہماری کوٹھی پر تراویح کا بندوبست کیا جائے۔ حالانکہ کوٹھی سے بہت ہی قریب مسجد موجود تھی۔ مگر کس مولوی کی مجال جو غازی خان کو یہ حکم خدا سنائے کہ محلے کی مسجد ہوتے ہوئے یہ آپ کی کوٹھی میں تراویح کیا؟ ادھر آجکل حافظِ قرآن وہ بے علم و بے ہنر لوگ ہوا کرتے ہیں۔ جو بے ہنری کی وجہ سے کسب معاش کے ہر شعبہ میں محتاج و معذور ہوتے ہیں۔ اس لئے ان غریبوں کو رمضان ہی کا مہینہ مالی حیثیت سے کچھ کام دے جاتا ہے۔ لہذا یہ اپنی جہالت اور بے ہنری کے ہاتھوں جس مسجد جس محلے اور جس کوٹھی میں قرآن محترم سناتے ہیں وہاں ایک چاکر اور بندۂ بے دام بن کر ہی رہتے ہیں۔ اور مقتدی کے ہر حکم و فرمان کو شاہی حکم محسوس کرتے ہیں۔ لہذا پرائیوٹ سکرٹری نے اسی قسم کے ایک حافظ صاحب کو پیش کر دیا۔ جو کُل پندرہ روپیہ پر راضی ہو گئے اور اوپر سے دعاگو بھی۔

شام کو ہی کوٹھی کے سب سے نیچے والے حصہ میں ایک یکطرفہ کمرہ تراویح کے لئے خاص کر دیا گیا۔ جو غازی خان کے دیوان خانے۔ عیش خانے اور گزرگاہ تک سے کافی ایک طرف تھا۔ کوٹھے کے درجۂ اول فرنیچر کے مقابل قرآن خوانی کے کمرہ کا فرش بس کُل فرش ہی تھا یعنی دری اور دری پر جائے نماز۔ اب سوال تھا مقتدیوں کا سو دو چار مسلمان۔ خانساماں تھے دو چار چپراسی اور ایک دو محلے کے ایسے بوڑھے مسلمان جن کو غازی خان کے خزانے سے دو چار روپیہ مہینہ تنخواہ ملتی تھی۔ یہ اہتمام ہوا رمضان میں غازی خان کے ہاں قرآن خوانی کا جس سے خود غازی خان اور آپ کی "ممدوحہ" کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ غازی خان کے مشاغل یومیہ عین یورپی اصول پر مرتب تھے۔ جن میں دنیا جہان کی تفریحات عیش مرغن غذائیں اور فرانس کے کیمیاوی اجزا والے چشموں سے پینے کا پانی شامل تھا۔ روزہ نماز کا رمضان میں بھی کوئی حکم تھا نہ سوال ایک بجے دن کو سو کر

آمنسا شام کو یورپی کھیل اور گئی رات تک خوشامدی احباب کا مجمع اور کوئی یورپی کھیل اندر محترمہ کی حکومت میں دو چار پرانے وقتوں کی بال بچے والی مسلمان خادم عورتیں تھیں جو خود روزہ دار ہو کر بھی دن بھر محترمہ کے احکام میں سرگرداں رہتی تھیں۔ البتہ روزہ کے نام سے صرف شام کو چند گھنٹوں کی رخصت ہو جاتی تھی۔ ان بے بس ملازم عورتوں کے چھوٹے چھوٹے بچے جب کسی دن روزہ رکھ لیتے تھے تو سائنس داں محترمہ ان کی ماؤں کے سامنے ہی ان کا خاصا مذاق اڑاتی تھیں اور خود روزہ سے کوسوں دور رہتی تھیں۔ جب محترمہ ان روزہ دار بچوں کا مذاق اڑاتی تھیں تو ان کی صحیح معنی کی روزہ دار مسلمان ماؤں کو شدید تکلیف پہونچتی تھی۔ مگر کمبخت پیٹ کے ڈر سے یہ محترمہ کے ان ملحدانہ خیالات کی تردید بھی نہیں کر سکتی تھیں

ان حالات میں ختم قرآن و تراویح کا دن آیا جس میں شرکت کے لئے بعض دوسرے مسلمان بھی مدعو کئے گئے۔ آج غازی خان نے بھی اسلامی لباس پہنا اور ختم قرآن کے تمام اہتمام خدام نے کیا غازی خان صرف رسمی شرکت کے لئے اسلامی لباس میں ایک نومسلم اجنبی کی طرح شریک ہوئے غریب امام یا حافظ قرآن نے جھک کر سلام کیا اور حضور غازی خان صاحب کی جانب سے خدم نے حافظ صاحب کو ہار اور پندرہ روپیہ کا نذرانہ پیش کیا۔ اس طرح غازی خان صاحب کے ہاں رمضان شریف آئے اور چلے گئے۔

عید کے بعد بھی غازی خان کے بڑے لخت جگر نے ولایت سے واپس آنے سے انکار کر دیا اور ایک جرمن دوشیزہ کے عشق میں مبتلا ہو کر باپ کا تمام اندوختہ برباد کر کے بے پتہ ہو گئے۔ غازی خان نے ان کی تلاش میں خود بھی ... کے دو بڑے سفر کئے جن میں رہا سہا بھی ختم ہو گیا۔ اسی سال محترمہ پر فالج کا اثر ہوا اور کامل تین برس تک بستر مرگ پر پڑی سسکتی رہیں۔ اسی عرصہ میں دو جوان العمر لڑکیاں شدید علالتوں کے بعد ماں باپ کے سامنے ہی راہئ ملک بقا ہو گئیں۔ محلے سے لیکر تمام بستی کے لوگ ہمدردی کرنے کے عوض اس گھرانے کا نام سننا بھی برداشت نہیں کرتے۔ اور غازی خان کی ان تمام بربادیوں کو اللہ کے احکام اور رمضان شریف کی توہین کا بدلہ سمجھتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار!!

کلام حسرت

از حضرت حسرت لکھنوی

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

بیکسی میں چل دئے سب چھوڑ کر تنہا مجھے
اب تو اپنا بھی نظر آتا نہیں اپنا مجھے

گردشِ قسمت نے کیا کیا جانے دکھائی مجھے
یہ غنیمت تھا کہ بخشی عمرِ دو روزہ مجھے

لیچلا جوشِ جنوں کیوں جانب صحرا مجھے
کیا بیابانی میں کوئی گم ہے گھر میرا مجھے

اس نے پھر مخمور تر انداز سے دیکھا مجھے
یہ قدم اکھڑے وہ غش آیا، چلا، لینا مجھے

نزع میں امروز و فردا نے رکھا مجھے
جان بھی دینے نہیں دیتا ترا "وعدا" مجھے

دولتِ کون و مکاں ایسی ودیعت پر نثار
دل کی صورت میں عطا کی درد کی دنیا مجھے

یا مراظرفِ نظر تھا یہ جو اب تک ہوش سے
یا جمالِ یار ہی نے دید یا دھوکا مجھے

میں ہوں وہ حسرت کہ مجھ سے کوئی دل خالی نہیں
کاش وہ بت اپنے دل میں بھی جگہ دیتا مجھے

گلچینی

(۱) میں نے باغ عالم سے بہترین پھول چنا مگر وائے بیدردی کہ زمانے کی دست و برد نے مجھ سے چھین لیا۔

(۲) ہنوز ان تیز کانٹوں کی خلش میرے کمزور ہاتھوں میں محسوس ہو رہی ہے جن کی مزاحمت کے باوجود میں نے پھول تک ہاتھ بڑھایا۔

(۳) گلشن دنیا میں جتنی بہاریں آئیں گی گل و بلبل کو باہمی صحبت کا اتنی ہی دفعہ اتفاق ہوگا۔ لیکن میری اور اس گل شاداب کی ہمنشینی یا قسمت یا نصیب۔

فراق!

(۱) آگ جب پہلے پہل سلگتی ہے تو کبھی اپنے دھوئیں سے اور کبھی سوزش سے ہر چیز کو تکلیف دیتی ہے۔

(۲) لیکن جو چیز آگ میں جل کر راکھ ہو جاتی ہے وہ دوبارہ جلنے کے خوف سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

(۳) یہی کیفیت آتش محبت کی ہے۔

(۴) اس کی تابش سے پہلے انسان بہت گھبراتا ہے۔ لیکن جو وقت جل کر فنا ہو جاتا ہے تو پھر دنیا کی کسی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتا۔

عبداللطیف عبدالشکور اینڈ کمپنی

اُولن، کاٹن، اینڈ سلک پیس گڈس امپورٹرس

۱۳-۱۵ زکریا مسجد، بمبئی نمبر (۳)

ٹیلیگرام "شکور" بمبئی ——— ٹیلیفون نمبر ۲۱۸۸۴

Abdul Latif Abdul Shukur & Co.,

Woollen, Cotton & Silk Piece Goods Importers.

13-15 Jackeria Musjid, BOMBAY 3,

Tele: "SHUKUR" Bombay.   Telephone No. 21884

ملکۂ نورجہاں کی شہنشاہ جہانگیر کی رہائی کیلئے مہابت خاں سے معرکہ آرائی !!

۱۶۲۶ء میں شہنشاہ جہانگیر نے مہابت خاں کی مسلسل عدول حکمی، خلاف ورزی، اور خودستائی کی بنا پر ایک فرمان جاری کیا کہ اس کا دربار بند کر دیا گیا ہے اور وہ فلاں تاریخ سے معتوب ہے۔ جب مہابت خاں کو اس کا علم ہوا تو اس نے شہنشاہ جہانگیر سے انتقام کی ٹھانی اور جب شہنشاہ جہانگیر ہدسپس (دریائے جہلم) عبور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو مہابت خاں نے (جو کرن سنگھ کا سوتیلا بھائی تھا اور بعد میں مسلمان ہوا) دو ہزار راجپوت بایں ہدایت روانہ کئے کہ جب شہنشاہ جہانگیر ہدسپس (دریائے جہلم) سے کشتیوں کے ذریعہ پار اترنے کی کوشش کریں، تو انھیں گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن اس ہدایت کے باوجود مہابت خاں سے نچلا نہ بیٹھا گیا۔ اور وہ اپنے دو سو باڈی گارڈ لے کر شاہی خیمہ کی طرف لپکا اور اس کے محاصرہ میں کامیاب ہوا۔

ملکۂ نورجہاں جو دریائے جہلم پار کرکے اپنی افواج سے جا ملی تھی اور جو جہانگیر کی آڑ میں حکومت کے سیاہ و سفید کی مالک اور امور سلطنت میں رد و بدل کا مجاز رکھتی تھی شہنشاہ جہانگیر کی رہائی کے لئے مہابت خاں کی افواج پر دریائے جہلم سے اپنی فوجیں لئے ہوئے آندھی کی طرح ٹوٹ پڑی اور مردانہ وار مقابلہ کیا، لیکن جب فوج کشی سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس فہیم و ذہین ملکہ نے سپر ڈال دی اور خود شہنشاہ جہانگیر سے قید خانہ میں جا ملی اور مہابت خاں کی افواج کو اپنا ہم نوا بنا کر بالآخر شہنشاہ جہانگیر کو قید و بند کی مصیبت سے چھڑا لائی !!

مسلمان بھائیوں کو عید مبارک!
نیو تھیٹرز کلکتہ
شاہکار
ڈاکٹر!
جسکو بنگال فلم جرنلسٹس ایسوسی ایشن نے ۱۹۴۱ء کی بہترین فلم قرار دیا ہے
اس شہرہ آفاق بنگالی فلم کا سچا نقشہ اردو زبان میں دیکھنے کیلئے تیار رہئیے
سبودھ مترا
پنکج ملک
صغیر جبین شور
سلیس زبان
بہترین موسیقی
اور بلند معیار
اداکاریوں
کا
ایک مرقع
اداکاران:
پنکج ملک
بھارتی
اہین چودھری
نیمو اور جیوتی
پرکاش!
عنقریب بمبئی کے بہترین سینما میں آرہی ہے!
بکنگ کیلئے لکھیئے: کلکتہ فلم ایکسچینج نیو ویسٹ اینڈ سینما کمپاؤنڈ بمبئی نمبر (۴)

اجنبو! عید مبارک
کیا مبارک ہے روز عید سعید ——— آج سب کی بر آئی ہے امید
آپ پر بھی ہوا ہے مرے مشفق ——— خالق دو جہان کا لطف ... مزید
روح پرور موسیقی اور دلفریب نغموں کے ساتھ ایک نہایت دلچسپ کہانی ہے "مسافر" کے ڈائرکٹر نے پوری قابلیت سے پردۂ سیمیں پر پیش کیا ہے۔
رنجیت کا نہایت دلکش شاہکار !!
پردیسی
ڈائرکٹر:- چترنجن دوشی
خاص اداکار:-
موتی لال، خورشید بیگم، سینہ پربھا پردھان، ای بلیموریا، درگیش، کیسری، کانتی لال، اور بھگوان داس وغیرہ !!
اوقات روزانہ:- ۳ ½، ۶، اور ۱۰ بجے جمعہ سنیچر اتوار و تہوار ۲ بجے زائد کھیل !
الفریڈ ٹاکیز
رپن تھیٹر
پلے ہاؤس !
عید اور باسی عید کے دن کھیل ۱۱ ½ بجے سے شروع ہوگا !
اترے پکچرز کی دوسری اعلیٰ ترین ہندوستانی فلم
راج دلاری
اداکاران:- ونمالا، مظہر خان، ترلوک کپور، بابا دیوی، سونلنی دیوی، ڈیوڈ، نوین یاگنک، بیبی وملا وغیرہ !!
موسیقی:- ایچ خان مستانہ
عنقریب آرہی ہے !
اداکاران:-
ونمالا، مظہر خان، شاہو موڈک، بابا دیوی، سونلنی دیوی، ڈیوڈ، نوین یاگنک و ملا وغیرہ

تخلیقِ محبت

از حضرت احسن رضوی داناپوری — خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے!

مشیت کو پس از خلقت بڑی الجھن نظر آئی
بنانے کو بنایا اور بگڑ جانے سے گھبرائی

حوادث کے تھپیڑے چلتے پھرتے سامنے آئے
وہ ہستی کی حقیقی تلخیوں کے کانپتے سائے

وبالِ مستقل تھے عالمِ ایجاد کے منظر
خلش انگیز تھے مجموعۂ اضداد کے منظر!

اثر احساس کو دے ہی چکی تھی تازیانوں کا
لپک شعلوں کی تھی اور لوچ تھا چبھتے قانون کا

یہ کڑواہٹ گراں تھی اور گوارا اس کو کرنا تھا
بہر صورت اسی دشوار منزل سے گزرنا تھا

ضروری تھی مصائب کیطرف سے کچھ سبکدوشی
مہیا کی نئے جذباتِ غم سے خود فراموشی

جمودِ سنگ و آہن سے شکوہِ جانکنی لے لی
شکستِ آئینہ سے روشنی ہی روشنی لے لی

شمع سے سوز چاہا انتظارِ کیف آگیں کا
ترنم بھر دیا ماحولِ غم میں ساز پرویں کا

متانت چاند سے تاروں سے ذوقِ جستجو مانگا
شعاعِ مہر کی گرمی سے جوشِ آرزو مانگا

جنوں کی بیکراں کیفیتیں طغیانِ دریا سے
بگولوں سے طلب کیں وحشتیں تشویش دنیا سے

تمنائیں ضیائے صبح سے اور شام سے حسرت
نظارہ خواہی دنج اور ڈھونڈھی آرت سے حیرت

تصور کی حلاوت خیز مایوسی سرابوں سے
تخیل کی پریشاں زادگی معصوم خوابوں سے

نہ جانے کسقدر ارمان مانگے ریگِ صحرا سے
نہ جانے خواہشیں لیں کسقدر ناپید پیدا سے

گلوں کے آخری انداز سے افسردگی لے لی
کلی کے کھلتے ہی مرجھانے سے آزردگی لے لی

اٹھی کی بہارِ رنگ و نکہت سے پریشانی
ہوئی جا کر کے ساحل آبشاروں سے گراں جانی

ہوا کی مستیٔ رفتار سے وارفتگی لے لی!
زمانے کی تغافل کوشیوں سے بیخودی لے لی

فراہم کر لیا موسم سے استقلال پامالی
مہیا سبزے سے کی روندے جانے میں بھی خوشحالی

فرشتوں کے طریقِ بندگی سے طرزِ خاموشی
سبک روحی سی حوروں سے لیا اک حسن مدہوشی

گدازِ شبنم و سیماب سے بیتابی و نرمی
اور اپنے خاص جلووں سے عطا کی ضو اثر گرمی

بچایا سایۂ ابلیس کی ظلمت طرازی سے
چھپایا دیدۂ پنہاں میں کمال چارہ سازی سے

جوانی کی رگوں سے خون کھینچا آنکھ سے آنسو
دھواں اٹھا جگر سے دل میں پیدا ہوگئی خوشبو

لطیف اجزا اکٹھے کر دئے حساس سینوں میں
محبت نور بن کر رہ گئی دل کے نگینوں میں

حوادث کے اندھیرے میں یہی مشعل دکھاتی ہے
لطافت کا یہ مجموعہ محبت کام آتی ہے

سامی مذاہب میں یہودیوں کا مذہب سب سے قدیم ہے۔ اور قرآن شریف میں رسالت مآب صلعم کو مثیل موسیٰؑ قرار دیا گیا ہے۔ لہذا ایک مختصر تبصرہ ان کی مذہبی کتاب تالمود پر کیا جاتا ہے۔

جس طرح مسلمانوں میں وحی کی دو قسمیں مانی جاتی ہیں۔ یعنی وحی متلو اور وحی غیر متلو وحی متلو قرآن شریف ہے اور وحی غیر متلو اقوال نبی صلعم۔ اسی طرح یہود کی وحی متلو توراۃ یعنی صحائف موسیٰؑ ہیں جو بائبل میں سب سے اول موجود ہیں۔ یعنی (۱) کتاب پیدائش۔ (۲) کتاب خروج۔ (۳) کتاب لاوی (۴) گنتی (۵) استثنا۔ اور وحی غیر متلو تالمود ہے جو مجموعہ هدایات ہونے کے باعث اس نام سے موسوم ہے۔ اور یہ آرامی زبان کا لفظ ہے تالمود کے دو حصے ہیں۔ ایک مشنیٰ دوسرے گمرہ۔ ایک متن کی حیثیت سے ہے دوسری بطور شرح۔ کہا جاتا ہے کہ تالمود کی تالیف تین سو گیارہ سال میں مکمل ہوئی۔

روایات یہود کے بموجب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد عمران نے اپنی پھوپھی سے شادی کی۔ اس کے بطن سے پہلے ایک لڑکی مریم پھر حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ پیدا ہوتے۔ انھوں نے مابین ۲۴۴۸ و ۲۴۸۸ ہبوط آدم یعنی ۱۳۱۲ لغایتہ ۱۲۷۲ قبل مسیح بنی اسرائیل کو خدا کے ۶۱۳ پیغام پہونچائے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے پہلے حضرت ہارون کو تمام احکام سنائے۔ اس کے بعد ان کے سامنے ان کے بیٹوں کو سنائے۔ بعد ازاں قوم کے ستر برگزیدہ اصحاب کو سنائے اس کے بعد عام اجازت ہوگئی۔ اس طرح حضرت ہارون نے حضرت موسیٰ سے احکام کو چار مرتبہ سنا ان کے بیٹوں نے تین مرتبہ بزرگان قوم نے دو مرتبہ اور پوری قوم نے ایک مرتبہ۔ حضرت موسیٰ کے بعد حضرت ہارون نے ان کے سامنے تمام احکام کو دہرایا اور فرزندان ہارون نے بھی ان احکام کو دہرا دیا۔ اس کے بعد بزرگان قوم نے۔ غرض تمام احکام قوم کے دل پر نقش کردیئے گئے۔

ماہ شباط ۲۴۸۸ کی پہلی تاریخ مطابق ماہ فروری ۱۲۷۲ ق م میں حضرت موسیٰ نے عام اعلان کرایا کہ بنی اسرائیل میں سے جس کسی کو احکام الہی کے متعلق کچھ دریافت کرنا ہو وہ دریافت کرے۔ اور خود تمام احکام کو قلم بند کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۷ ماہ آذر ۲۴۸۸ مطابق مارچ ۱۲۷۲ .... میں اس اہم کام سے فراغت پائی۔ تیرہ نسخہ تیار ہوتے۔ ہر قبیلہ کے پاس ایک نسخہ رہا اور ایک نسخہ قبیلہ لدوی کو معبد میں رکھنے کے لئے دیا۔ اس اثنا میں جو تشریح زبانی کی گئی وہ تالمود کی اصل و اساس ہے۔

حضرت موسیٰ کے بعد ان کے جانشین یوشع بن نون ہوئے۔ سال ولادت ۲۴۰۶ ہے، ۸۲ سال کی عمر میں بنی اسرائیل کے فرمانروا ہوئے اور ایک سو دس سال کی عمر پاکر ۲۵۱۶ میں وفات پائی۔ اس کے بعد انبیائے بنی اسرائیل کا دور دورہ رہا۔ یہاں تک کہ ۲۸۹۲ میں حضرت داؤد سریر آرائے حکومت ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد حضرت الیاس کو یہ ذمہ داری سپرد ہوئی۔ اور ۳۰۲۰ میں وہ آسمان پہ گئے اور حضرت الیسع کا دور شروع ہوا۔ ۳۴۱۳ھ حضرت عزیرا اس عہدہ پر سرافراز ہوئے ان کے بعد ستیسویں صدی کے اواخر میں حلیل بہت مشہور و معروف ہوئے۔

حلیل کے زمانہ تک وحی متلو یعنی توراۃ کے سوائے کوئی نوشتہ موجود نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ کے اقوال اور انبیائے بنی اسرائیل کی تشریحات سب زبانی روایات تھیں۔ حلیل کے زمانے میں علمائے بنی اسرائیل میں مناظرے شروع ہوئے اس لئے حلیل نے جملہ اقوال کو مدون و مرتب کرنا شروع کیا۔ ۳۷۲۸ء میں یعنی حضرت موسیٰ کی وفات کے بارہ سو چالیس سال بعد اور حضرت مسیح کی پیدائش کے تیس سال پہلے حلیل نے تالمود کی بنیاد ڈالی۔ اس نے چھ جلدوں میں تقریباً چھ سو ابواب مرتب کئے تھے کہ وفات پائی اور یہ کام ناتمام رہا۔ اس کے بیٹے پوتوں میں سے کسی نے اس کو مکمل نہ کیا۔

ابی شمنان جو حلیل کا پرپوتا تھا اور حضرت موسیٰ کے وقت سے احکام الہی کا چونتیسواں محافظ تھا اس نے یہ عہدہ جلیلہ ابی یوداہ کو سپرد کیا۔ اس نے اپنے شاگردوں کی مدد سے اس عظیم الشان کام کو ۳۹۷۸ مطابق ۲۱۸ء میں مکمل کیا۔ اس کا نام اس نے مشنیٰ رکھا جو عبرانی لہجہ میں مشنہ بولا جاتا ہے۔ جس وقت اس کی اشاعت ہوئی تمام بنی اسرائیل نے اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور عقیدت مندوں نے سر چڑھایا۔ اس قانون کے چھ حصے تھے۔ حصہ اول میں زراعت کے قوانین تھے جس میں یہ بتلایا گیا تھا کہ زراعت کی پیداوار میں سے کتنا حصہ کس کو ملے۔ حاصل اراضی کو کس طرح صرف کیا جائے۔ صدقات میں کب اور کتنا دیا جائے۔ اس کے مستحقین کون کون ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے حصہ میں اعیاد یہود کا ذکر ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔ تیسرے حصہ میں قانون النسوان ہے۔ یعنی منگنی شادی طلاق وغیرہ کا ذکر ہے۔ چوتھے حصہ میں ابواب جنایات میں جس میں تمام فوجداری اور دیوانی قانون آجاتا ہے۔ پانچویں حصہ میں متبرک اشیا کا ذکر ہے۔ مثلاً قربانی اور معابد وغیرہ کے احکام۔ چھٹے حصہ میں تزکیے کے اصول ہیں یعنی کونسی اشیا ناپاک ہیں اور کیونکر پاک کی جائیں اور نفوس انسانی کی تقدیس کس طرح کی جائے۔

جس طرح اب تک توریت پر بحث وتحیص کی جاتی تھی۔ اس سے مسائل کا استخراج کیا جاتا تھا۔ اس کے الفاظ کی چھان بین کی جاتی تھی۔ اب یہی درجہ مشنہ کو بھی حاصل ہو گیا۔ یعنی توریت کی طرح مشنہ ایک متن قرار پایا اور اس کی شرح بیان کی جانے لگیں۔ ابتداءً یہ بھی زبانی روایات کے طور پر نقل کی گئیں ۱۲۷ھ مطابق ۲۶۷ء یعنی تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد ان شرح کی تدوین شروع ہوئی۔ اب آشی نے اس کی ابتدا کی اور اس کے فرزند مریمَر نے اس کی تکمیل کی۔ مشنہ کی شرح کو گیمرہ کہتے ہیں۔ اور دونوں کے مجموعہ کا نام تالمود ہے یہ مجموعہ ۲۵۳ھ مطابق ۳۹۳ء میں مکمل ہوا۔

مسلمانوں نے جس طرح فن حدیث کو مرتب کیا ہے۔ بالکل اسی طرح یہودیوں نے تالمود کو ترتیب دیا۔ جس طرح مسلمان محدثین روایات احکام کی چھان بین کرتے تھے۔ اسی طرح یہود نے احکام کے روایت کرنے میں زیادہ تحقیق سے کام لیا اور واقعات کے روایت کرنے میں سہل انگاری برتی۔ اصول حدیث میں بھی یہی معمول ہے کہ مناقب اور سیر میں ضعیف روایات قبول کر لی جائیں۔ مگر احکام میں خوب غور کیا جائے۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں تالمود سے چند روایات نقل کرتا ہوں تاکہ اس قوم کے متعلق کچھ معلومات میں اضافہ ہو۔

قصہ ہابیل وقابیل

کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم نے اپنے فرزند اکبر قابیل کو زمین بخشدی اور وہ اس میں زراعت کرنے لگا اور اپنے فرزند اصغر ہابیل کو بکریوں کا چرانے والا بنا دیا۔ اپنی اپنی پیداوار سے دونوں قربانی کے لئے لائے۔ قابیل نے ادنیٰ جنس پیش کی اور ہابیل نے اعلیٰ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو آگ قربانی کو قبول کرتی تھی اس میں ہابیل کی قربانی قبول ہوئی اور قابیل کی رد۔ اس وجہ سے وہ ہابیل کا دشمن ہو گیا۔ اور موقع پاکر اس کو قتل کر دیا۔

قرآن شریف میں بھی یہ قصہ اسی طرح منقول ہے۔ نہ معلوم ہمارے مفسرین نے کہاں سے یہ روایت حاصل کی کہ بنائے عداوت وہ لڑکی تھی جو قابیل کے ساتھ پیدا ہوئی تھی اور حضرت آدم اس کی شادی ہابیل سے کرنا چاہتے تھے۔

نمرود کی سرکشی

یہودی روایات کے بموجب نمرود حضرت نوحؑ کا پرپوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم کا کوٹ حضرت نوحؑ کے پاس تھا اس کو ان کے بیٹے حام نے چرا لیا اور وہ نمرود کو مل گیا۔ اس کی وجہ سے اس کے جسم میں بہت طاقت وقوت پیدا ہو گئی۔ یہ بہت زبردست شکاری تھا اور سپاہیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی پہلی لڑائی یافث کے فرزندوں سے ہوئی نمرود غالب ہوا۔ رفتہ رفتہ بہت طاقت بڑھالی اور حضرت ابراہیمؑ کے باپ تارخ کو اپنا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ اور شہر شینار کو بسا کر اپنا دارالحکومت مقرر کیا۔ اور خدا کو بھلا کر بت پرستی شروع کی۔ اسی کے زمانے میں یہ تجویز کی گئی کہ ایک مینار بنایا جائے اس کی تعمیر تیس سال تک ہوتی رہی مگر لوگوں کے دلوں میں غرور پیدا ہوا بعض لوگوں نے کہا اس مینار پر چڑھ کر اپنے بتوں کو آسمان پر چڑھائیں گے۔ بعض نے کہا کہ خدا کی طاقت سے مقابلہ آسمان پر جا کر کریں گے۔ بعض نے کہا تیروں سے اور بھالوں سے اس کو زخمی کریں گے۔ خدا نے ہر گروہ کو دنیا میں عذاب کیا۔ تیر انداز آپس میں لڑے۔ بتوں کے لے جانے والے بندر بنا دیے گئے خدا کی طاقت سے مقابلہ کرنے والے زمین میں منتشر کر دیے گئے۔ اور مینار کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے ہی ان کی بولیاں مختلف ہو گئیں۔

جب حضرت ابراہیم کی ولادت ہوئی تو کاہنوں نے نمرود سے کہا یہ لڑکا تیری سلطنت کی تباہی کا باعث ہوگا لہٰذا اس کو قتل کر دے۔ اس نے تارخ کو بلا کر اپنا فیصلہ سنایا۔ اور کہا اس لڑکے کے معاوضہ میں کافی رقم دی جائے گی۔ تارخ نے کہا یہ خدا کا انعام ہے میں کیونکر اس کو فروخت کروں۔ مگر نمرود نہ مانا۔ آخر تارخ نے اپنے ایک غلام کا نوزائیدہ بچہ اس کے حوالہ کر دیا اور کہا یہی ابراہیم ہے۔ نمرود نے اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کر دیا۔ اور تارخ نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی والدہ کو دس سال تک ایک غار میں چھپائے رکھا۔ بعد ازاں حضرت نوح کی خدمت میں بھیجدیا۔ وہاں وہ ۳۹ سال رہے۔ واپس آنے پر دیکھا کہ صرف دوسرے ہی نہیں بلکہ اپنے گھر میں بھی بت پرستی ہو رہی ہے۔ اور گھر میں بارہ بت رکھے ہوئے تھے حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کو سمجھایا مگر اس نے بت پرستی ترک نہ کی۔ آپ نے ایک دن ان بتوں کو توڑ دیا اس کی شکایت تارخ نے نمرود سے کی۔ اس نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈلوا دیا اور چونکہ تارخ نے فرمان سلطانی کی تعمیل نہیں کی تھی۔ اس کے دوسرے بیٹے کو بھی آگ میں ڈالا گیا حضرت ابراہیم صحیح سلامت آگ سے نکل آئے مگر آپ کے برادر اکبر اس میں جل گئے ان کے بطن سے حضرت لوط اور ان کی دو بہنیں حضرت سارہ اور میلقاہ پیدا ہوئیں۔ حضرت سارہ سے حضرت ابراہیم کا عقد ہوا۔

حضرت ابراہیم کا یہ اعجاز خداوندی دیکھکر نمرود ان پر مہربان ہو گیا تھا۔ مگر دو سال کے بعد اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص جو حضرت ابراہیم سے مشابہ ہے آگ میں سے شمشیر بکف نکلا اور ایک میدان میں نمرود کا تعاقب کیا نمرود بھاگا۔ اس آدمی نے ایک انڈا پھینکا اس میں سے ایک دریا لہریں لینے لگا۔ اس میں نمرود اور اس کے تین رفیقوں کے علاوہ سب غرق ہو گئے۔ اتنے میں دریا غائب ہو گیا اور انڈے میں سے ایک چڑیا پیدا ہوئی جس نے نمرود کی آنکھیں نکال لیں۔

نمرود خوفزدہ حالت میں بیدار ہوا اور معبروں سے یہ خواب بیان کیا انہوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم کے باعث اس پر تباہی آنے والی ہے لہٰذا ان کا قتل مناسب ہے نمرود نے کچھ سپاہی بھیجے کہ خفیہ طور سے قتل کر دیا جائے مگر حضرت ابراہیم کو پہلے سے معلوم ہو گیا اور آپ حضرت نوح کے پاس چلے گئے۔ وہاں تارخ ملنے کو آیا تو حضرت ابراہیم اپنے تمام اہل خاندان کو حسب ارشاد خداوندی حزن کی طرف لے گئے۔ کچھ دن وہاں رہکر کنعان کو چلے گئے۔ آپ وہیں فروکش تھے کہ آپ کی نسل بڑھنی شروع ہوئی اور آپ کے پوتے عیسو نے ایک دن شکار کھیلتے ہوئے نمرود کو تیر کا نشانہ بنایا اور اس کے دو ساتھیوں کو بھی قتل کیا اور حضرت آدم کا کوٹ اس کے جسم سے اتار لائے۔

مسلمانوں میں مشہور ہے کہ قوم نمرود پر مچھر مسلط کئے گئے تھے اور ایک مچھر ناک کے راستہ نمرود کے دماغ میں گھس گیا تھا۔ جس کی ایذا دہی کے باعث ہر وقت سر پر جوتے پڑتے تھے اور آخر کار وہ مر گیا۔ قرآن شریف میں نمرود کا یہ انجام کہیں مذکور نہیں۔

چونکہ علمائے اسلام نے بہترین دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ ذبیح اللہ اصل میں حضرت اسمٰعیل ہیں اور قرآن شریف سے بصراحت یہی ثابت ہوتا ہے لہٰذا حضرت اسحٰق کا جو قصہ تالمود میں ہے حذف کیا جاتا ہے مگر اتنا کہہ دینا کافی ہے

کہ اسلامی روایت شانِ نبوت کے لائق ہے۔ اور یہودی روایت اس کے منافی۔ کیونکہ یہودی روایت میں حضرت اسحٰق کا استقلال دبیح ہے۔ مگر حضرت ابراھیمؑ کے متعلق یہ ہے کہ انھوں نے ایک ذبیحہ ذبح کر دیا اور خدا سے التجا کی کہ اسی کو خون اسحاق سمجھا اور جب کسی پیر مرد نے ذبح اسحاق کی خبر حضرت سارہ کو پہونچائی تو وہ پریشان ہو کر گھر سے نکل پڑیں اور جب دوبارہ اسی پیر مرد نے سلامتی کی خوش خبر دی تو شادیٔ مرگ ہوگئیں۔

فرعون کی سزائیں

اہل مصر پر غرق ہونے سے پہلے دس عذاب بھیجے گئے ان کی نوعیت کی توجیہ علمائے یہود نے یہ کی ہے۔

(۱) چونکہ اہل مصر نے بنی اسرائیل کا خون بہایا تھا لہذا ان کے دریاؤں کا پانی خون کر دیا گیا۔

(۲) چونکہ حضرت موسیٰ کی بلند آواز پر اہل مصر نے کان نہ دیا اس لئے مینڈک بھیجے گئے کہ مالی نقصان کے ساتھ ساتھ ان کے کانوں کو ایذا پہونچے۔

(۳) جھینگریوں کا عذاب اس لئے مسلط کیا گیا کہ قوم فرعون نے بنی اسرائیل سے سڑکیں جھاڑنے کا کام لیا تھا۔ مٹی کی اینٹیں بنوائی تھیں۔ لہذا اسی خاک کو جھینگریوں میں تبدیل کر دیا گیا۔

(۴) وحشی جانوروں کو اس لئے مسلط کیا گیا کہ بنی اسرائیل کو ان کے شکار پر مقرر کیا گیا تھا اور چونکہ ان کی کھال کام آسکتی تھی۔ اس لئے وہ جانور مصر میں نہ مرے اور مینڈک بیکار ہونے کے باعث مصر ہی میں فنا کر دیے گئے۔

(۵) بائے طاعون سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ عذاب الٰہی صرف قوم فرعون کے لئے ہے اور اسی باعث بنی اسرائیل پر اس کا بالکل اثر نہیں ہوا۔

(۶) دمبل اس لئے پیدا ہوتے کہ بنی اسرائیل سے اپنے گھروں کی صفائی کا کام لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کا خون خراب ہوگیا تھا۔ لہذا خدا نے قوم فرعون کو خرابیٔ خون کی سزا دی۔

(۷) چونکہ بنی اسرائیل سے بیگار لے کر کھیت جتوائے گئے تھے اور تخم ریزی کی گئی تھی لہذا خدا نے طوفان ژالہ باری سے زراعت کو نقصان پہونچا دیا تاکہ قوم فرعون اس محنت کی محنت سے مستفید نہ ہو سکے۔

(۸) ٹڈی کی مصیبت اس لئے نازل کی گئی کہ ژالہ باری سے جو کچھ کمی رہ گئی تھی وہ پوری ہو جائے اور زراعت پورے طور سے ختم کر دی جائے۔

(۹) تاریکی اس لئے مسلط کی گئی کہ نور الٰہی سے بے بصیرت ہوگئے تھے۔ اس لئے بصارت سے بھی محروم کر دیا گیا۔

(۱۰) پہلوٹھے بچوں کا مرنا۔ آخری عذاب تھا اور چونکہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ اس لئے سب سے آخر میں مسلط کیا گیا۔

ان میں سے پانچ عذابوں کا ذکر قرآن شریف میں بہ صراحت ہے۔ ایک طوفان دوسرے ٹڈی تیسرے جھینگریاں چوتھے مینڈک پانچویں خون پہلے لڑکوں کے مرنے کا ذکر تفاسیر میں ہے۔ ممکن ہے کہ طاعون کی گلٹی سے مرے ہوں۔ لہذا اس صورت میں پانچ چھ اور دس ایک ہی عذاب کے مختلف نام ہوں وحشی جانوروں اور تاریکی کا کوئی ذکر نہیں ہے اور انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔

فرمودات ناطق

مرسلۂ جناب ... قاضی ... صاحب ...

(ابو العلا حضرت ناطق گلاؤٹھوی)

ہے تیری آرزو تو اجل کو بلائے کون
گھر سے زیادہ کون ہے ہر وقت آئے کون
تم اور میری خانہ خرابی کے ذمہ دار
دنیا کو چھوڑتے ہوئے آتی ہے سکو موت
چلئے گزر رہی ہے بہر حال زندگی
سب جس پہ ہنس چکے ہوں اسے دل لگی سے کیا
ملتے ہیں دوستی کے لئے سیکڑوں مگر
پابندِ یک وگر ہیں بت و برہمن ہی خوب

اچھا میں آنکھ میچ کے دیکھوں تو آئے کون
اے دردِ یار بار کسی کو بلائے کون
اب کیا کہوں جو یہ نہ کہوں میں کہ ہا کون
مارا اگر نہ جائے تو راضی سے جائے کون
اب رہ گزر پہ بیٹھ کے قصہ سنائے کون
جو سب کو رو چکا ہو اسے پھر ہنسائے کون
میں دل میں سوچتا ہوں کہ جھگڑے بڑھائے کون
اس گھاٹ پر ہم آئیں تو گنگا نہائے کون

ناطق کوئی تو چاہئے ایسا بھی غم گسار
ناصح سے کچھ نہ ... آئے تو باتیں بنائے کون

قوم لوط

قوم لوط کی شناخت تو مشہور ہے۔ مگر مجرمانہ لطیفے بھی دلچسپ ہیں اس کی دو مثالیں نقل کیجاتی ہیں۔

(۱) اس قوم میں ایک شخص ہدودنامی تھا۔ اس نے ایک نادار مسافر کو اپنے شہر سدوم میں دیکھا اور چاپلوسی کر کے اپنے گھر مہمان رکھا۔ اور اس کا مال غائب کر دیا۔ دوسرے دن اس کو رخصت نہ کیا۔ جب تیسرے دن وہ کسی طرح ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوا تو اس کو

ایک خط انکے نام

از ساحر الکلام حضرت رام پرکاش
ساحر ایم اے، نائب صدر بزم اردو بمبئی

وہ جو تڑپا کے گئے ہیں، وہ جو تڑپاتے ہیں اب — وہ جو آ آ کر تخیل میں چھپے جاتے ہیں اب

وہ جو کہتے تھے تجھے کیونکر بھلا سکتا ہوں میں — دور رہ کر تجھ سے کیونکر چین پا سکتا ہوں میں

وہ کہ جن کو دیکھ کر مسرور ہو جاتا تھا دل — جلوۂ انوار سے پُر نور ہو جاتا تھا دل!

وہ کہ جن کی مسکراہٹ تھی پیامِ زندگی — مسکراہٹ جس پہ قائم صبح و شامِ زندگی

وہ کہ جن کے دور جانے پر تو گھبراتا تھا دل — وہ کہ جن کے پاس ہونے پر بہل جاتا تھا دل

وہ، ملا سکتی نہ تھی جن کی نظر سے میں نظر — دیکھتے ہی جن کو ہو جاتی تھی خود سے بےخبر

وہ جو تھے تسکینِ دل، آرامِ جاں میرے لئے
جن کے دم سے تھا یہ گھر جنت نشاں میرے لئے

وہ، کہ اب فرقت میں جنکی دل مرا رنجور ہے — رنج سے معمور ہے اور غم سے چکنا چور ہے

وہ کہ جو پردیس میں رہتے ہیں اور خاموش ہیں — وہ، کہ جو دل میں نہاں ہیں آنکھ سے روپوش ہیں

وہ جنھوں نے دور ہو کر اب ستایا ہے مجھے — یاد رکھنے کی قسم کھا کر بھلایا ہے مجھے

وہ کہ جن کی یاد میں آٹھوں پہر روتی ہوں میں — دل کو کھو کر ان کے غم میں جان اب کھوتی ہوں میں

وہ جو ہر دم یاد آتے ہیں مگر آتے نہیں، — مجھکو صبح و شام کلپاتی ہیں، کل پاتی نہیں

جنکی پیاری پیاری باتیں اب سہانے خواب ہیں — ہائے کس درجہ سہانے یہ پرانے خواب ہیں

آج ان کے نام خط لکھتی ہوں کیا ان کو لکھوں؟
"بے وفا" ان کو لکھوں یا "باوفا" ان کو لکھوں؟

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

اجازت دے دی۔ جب مال طلب کیا تو کہنے لگا خواب بہت اچھا ہے عمر تیری دراز ہوگی اور مسرت میں بسر ہوگی۔ اس نے مجبوراً عدالت میں چارہ جوئی کی۔ حاکم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہدود سچا ہے اور وہ معبر خواب ہے۔ لہٰذا اس کی فیس بھی واجب الادا ہے۔

(۲) حضرت سارہ نے اپنے خادم کو حضرت لوط کی خبر لانے کے لئے بھیجا ایک سدومی نے اس کے پتھر مار دیا جس سے خون نکل آیا یہ اس سے ہاتھا پائی کرنے لگا تو اس نے کہا کہ میں نے تو فصد لی ہے۔ اس کا معاوضہ دے۔ دونوں نے عدالت میں مرافعہ کیا۔ حاکم نے سدومی کی موافقت میں فیصلہ کیا اس پر حضرت سارہ کے خادم نے ایک پتھر حاکم کے مارا اور کہا جو معاوضہ تم مجھ کو دیتے وہ اس سدومی کو دے دو اور بھاگ گیا۔

علمائے یہود کہا جاتا ہے کہ ربی یہودا علم و فضل میں صرف اپنے معاصرین ہی میں ممتاز نہیں تھا بلکہ حضرت موسیٰ کے بعد اس قابلیت و جامعیت کا کوئی آدمی پیدا نہیں ہوا۔ یہ شخص مال و دولت بھی وافر رکھتا تھا۔ لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ مگر یہ نہایت متواضع تھا۔ اپنی کرسی دروازے کے پاس رکھی تھی تاکہ جب درس گاہ میں داخل ہو تو لوگوں کو کھڑے ہونے کی زحمت نہ ہو۔ اس نے توریت کی تعلیم کو عام کر دیا۔ اس کے لئے کسی گروہ کی تخصیص نہیں رہی۔ بادشاہ وقت نے اس کو ایک قیمتی ہیرا بھیجا اس نے معاوضہ میں ایک تعویذ بھیج دیا۔ بادشاہ نے بُرا مانا تو کہلا بھیجا کہ تمہارے تحفہ کی میں حفاظت کروں گا۔ مگر میرا ہدیہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ اس کے وفات پانے پر قوم نے روزہ رکھا اور اس کے ساتھ تواضع اور خوف خدا کا خاتمہ ہو گیا۔

راشی یعنی ربی سلیمان ابن اسحاق سنہ ۱۰۴۰ء میں فرانس میں پیدا ہوا۔ فیلو جیسا فلسفہ طب ہیئت میں کمال حاصل کیا۔ اطالیہ۔ یونان۔ البانیہ فلسطین مصر وغیرہ کا سفر کر کے اپنے علم کو بڑھایا۔ تالمود کے ۲۳ مقالوں کی شرح لکھی۔ بادشاہ وقت یروشلم پر حملہ کرنا چاہتا تھا راشی سے مشورہ کیا اس نے کہا کہ فتح تیری ہوگی مگر تین ہی دن میں صرف تین سواروں کے ساتھ واپس آنا پڑے گا۔ بادشاہ بہت غصہ ہوا اور کہا اگر چوتھا سوار بھی ہوا تو تجھکو قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے کہا منظور ہے۔ اتفاق سے چار سال کی لڑائی کے بعد بادشاہ کامیاب ہوا۔ مگر جب یروشلم سے نکلا تو اس کے ساتھ چار سوار تھے۔ اپنے دارالحکومت میں داخل ہوتے ہوئے ایک سوار مر گیا تو بادشاہ کو راشی کی پیشین گوئی یاد آئی۔ مگر خود راشی مر چکا تھا۔ تقویٰ اور طہارت کے باعث یہود نے اس کو اپنے فسانوں کا ہیرو بنا رکھا ہے۔

تعلیمات ایثار کسی معاوضہ کی توقع کئے بغیر کسی سے حسن سلوک کرنا ایثار ہے۔ صدقہ بھی ایثار کی قسم ہے مگر وہ فقیروں کے لئے ہے اور ایثار امیر و غریب سب کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ضیافت بھی ایثار ہی کی قسم ہے۔ فقیروں کو بجائے صدقہ کے قرض دو تاکہ ان کو ذلت کا احساس نہ ہو۔

تواضع۔ خدا نے خود تواضع سکھائی ہے یعنی طور کو اپنی تجلیوں کے لئے مخصوص کیا جو بلند ترین پہاڑ نہیں ہے۔ نخل طور جس میں تجلی کا ظہور رہا وہ ایک نیچی جھاڑی تھی کوئی بلند درخت نہیں تھا۔ ایک ربی کا قول ہے کہ عُجب بُت پرستی ہے۔ دوسرا کہتا ہے مغرور سنگ دل کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ تیسرا کہتا ہے تواضع قربانی سے بہتر ہے۔

خوف الٰہی۔ ایک ربی کہتا ہے کہ جس کو توریت کا علم ہوا اور اس کے دل میں خدا کا خوف نہ ہوا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو خزانے کے صندوقوں کی کنجیاں دے دی جائیں مگر باہر دروازے کی کنجی نہ ملے۔ ایک ربی کے تلامذہ عیادت کو آئے اور اس سے وصیت چاہی تو اس نے کہا خدا سے اتنا ہی ڈرو جتنا بندوں سے ڈرتے ہو۔ شاگردوں نے تعجب سے کہا اس سے زیادہ نہ ڈریں تو اس نے کہا اتنا ہی کافی ہے۔ کیونکہ جب تم کوئی برا کام کرنا چاہتے ہو تو لوگوں کی نگاہوں سے علیحدہ ہو جاتے ہو اسی طرح خدا کی نگاہ سے بچنے کی کوشش کرو۔ مگر تم اس سے کہیں نہیں چھپ سکتے۔

تکریم والدین:— ماں باپ کی ضروریات کا پورا کرنا ان کی تعظیم ہے۔ اور ان کے احکام کی بجا آوری ان کا خوف ہے۔ ایک شخص نے اپنے باپ کو بہترین کھانا کھلایا باپ نے پوچھا یہ کہاں سے حاصل کیا۔ اس پر بیٹے نے جواب دیا کہ تمہیں اس سے کیا غرض۔ وہ سزا کا مستوجب ہوا۔ ایک شہر میں بیگار لی جاتی تھی اور جو ٹھیک کام نہ کرتے تھے ان کو تازیانے لگائے جاتے تھے ایک شخص نے اس خیال سے کہ شاید باپ سے کام نہ ہو سکے تو سزا پائے اس لئے اس کو اپنے کام پر بھیجا اور خود بیگار میں گیا۔ اس کو ثواب ملا

علم توریت:۔ کلام الٰہی کو پانی سے کیوں تشبیہ دی گئی؟ کیونکہ پانی بلندی سے نشیب کی طرف بہتا ہے۔ اسی طرح کلام الٰہی بلندی سے قلوب انسانیہ میں جو نشیب میں ہیں یعنی متواضع ہیں جاگزیں ہوتا ہے۔ کلام الٰہی کو شراب اور دودھ سے کیوں تشبیہ دی گئی؟ کیونکہ جس طرح سنہری برتنوں میں دودھ اور شراب خراب ہو جاتے ہیں۔ مٹی کے برتنوں میں حفاظت ہوتی ہے۔ اسی طرح کلام الٰہی... مسکینوں کے قلوب میں محفوظ رہتا ہے۔ کلام الٰہی کو چراغ سے کیوں تشبیہ دی گئی؟ کیونکہ چراغ اسی وقت تک جلتا ہے جب تک اس میں تیل ہو ورنہ خاموش ہو جاتا ہے لہٰذا کلام الٰہی سے اسی وقت تک استفادہ کیا جا سکتا ہے جب تک اس پر عمل کیا جائے۔

دعا و عبادت:۔ دعا اسرائیل کا ہتھیار ہے جو ہزاروں لڑائیوں میں کامیاب رہا ہے۔ اگر باب قبول بند ہو جائے تو باب اشک اس وقت بھی کام آتا ہے۔

غلاموں کے کان میں حلقہ اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ انھوں نے خدا کا یہ فرمان نہیں سُنا کہ خدا کے بندے اس کے بندوں کے بندے نہیں ہو سکتے۔ جو اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ سزا بھگتیں۔

جو جس قسم کی قربانی کرے گا اس کا ثواب پائے گا۔ مگر جو خدا کے سامنے تواضع کریگا وہ دُنیا کی ہر قسم کی قربانی کا ثواب پائے گا۔

عبادت گاہ کو جانے میں جلدی کرو۔ مگر واپس آنے میں جلدی نہ چاہئے

یوم سبت:۔ جو لوگ احترام سبت میں خوشی منائیں گے۔ ہمیشہ خوش رہیں گے۔ جب سبت سے پہلے دن کوئی یہودی عبادت گاہ سے اپنے گھر واپس جاتا ہے تو اس کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں۔ اگر اس کے گھر استقبال سبت کا انتظام ہے تو نیکی کا فرشتہ اس کے حق میں دُعا کرتا ہے اور انتظام نہیں ہے تو بدی کا فرشتہ بد دعا دیتا ہے۔

جزا و سزا۔ ہر کام کی جزا و سزا ہے۔ مثلاً حضرت یوسف نے حضرت یعقوب کو دفن کیا تو حضرت موسیٰ حضرت یوسف کی لاش کنعان کو لے گئے۔

ایک شخص کو بالوں پر غرور ہوا اس کو بالوں کے ذریعہ پھانسی دی گئی

(باقی صفحہ (۶۶) پر دیکھئے!!)

از حضرت محمد عبداللہ قریشی بی، اے!

خاص برائے الاصلاح عید نمبر!

عید ہر سال آتی ہے اور اپنی تمام رنگینیوں۔ دلفریبیوں، مسرت پاشیوں اور رعنائیوں کے ساتھ آکر گذر جاتی ہے۔ یہ کسی کے لئے مژدۂ عشرت و شادمانی لاتی ہے اور کسی کے لئے پیام سوگ اس کا آنا اک شانِ استغنا کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر ہر بچے۔ بوڑھے ہر مرد و زن اور ہر امیر و غریب پر گونا گوں ! اسے مطلق غرض نہیں ہوتی کہ اس کا ورود کتنے دلوں کے لئے باعث عیش و راحت ثابت ہوگا اور کتنے قلوب کے لئے موجب رنج و کلفت اسے بالکل پروا نہیں کہ اس کے آنے سے کتنوں کے دل معمورۂ عشرت سے لبریز ہو جائیں گے اور کتنوں کے گھر صفِ ماتم بچھ جائے گی۔

بہت سے گھرانے جو معمولی ایام میں بھی عشرت کے نشہ میں مخمور اور بادۂ مسرت سے چور رہے ہیں بعض حوادثِ جانکاہ کی وجہ سے اس روز نالہ کناں اور مجبور نظر آنے لگ جاتے ہیں اور بہت سے مفلس و قلاش خاندان اپنی عسرت۔ تنگ دستی۔ اور فاقہ مستی کے باوجود اس یوم سعید کو خوشی و بہجت اور مسرت و انبساط کے عالم میں گذار دیتے ہیں۔

صبح عید اپنے ساتھ نا معلوم کس قدر مسرتیں لاتی ہے کہ ایک طرف تو امراء اور رؤسا اپنے زرق برق قیمتی لباس اور خوش رنگ جامے زیب تن کرکے آراستہ ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف غریب اور بے سر و سامان غرباء فرطِ طرب سے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کو اُٹھا سید ھا اوڑھ کر دلی خوشی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی صبح عید جو شادمانیوں، عیش کامیوں عشرت سامانیوں اور شورانگیز تمناؤں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آتی ہے بعض گھروں میں اس شان سے نمودار ہوتی ہے کہ شامِ مصیبت کا سماں چھا جاتا ہے۔ بھلا جس حرماں نصیب بی بی کا جوان خاوند عید سے کچھ دن پہلے ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے جائے اور اس کا سہاگ لُٹ جائے اور جن بدقسمت معصوم بچوں کے سر سے شفقت پدری کا سایہ اٹھ جائے اور وہ بیکس و بیتیم رہ جائیں۔ ان کے گھر میں صبح عید "شام غم" بن کر نہ آئے تو کیا ہو؟

ہلالِ عید جس طرح امیروں کے محلوں پر جلوہ افروز ہوتا ہے اسی طرح اس بیوہ اور یتیموں کے گھر پر بھی نمودار ہوتا ہے۔ مگر آخرالذکر چار دیواری میں بسنے والوں میں سے کوئی بھی عید کی مسرتوں سے واقف نہیں ہوتا۔ ان کے حصے میں سوائے رنج و غم اور حسرت و اندوہ کے اور کچھ نہیں آتا۔ غم نصیب اور شکستہ دل بیوہ جس پر چند ہی روز ہوئے یہ کوہِ الم ٹوٹ پڑا ہے عید کا چاند دیکھتے ہی اور مضمحل اور اداس ہو جاتی ہے۔ اس کا دل بجھ جاتا ہے۔ طبیعت افسردہ ہو جاتی ہے اور وہ مایوسی و نامرادی کی مجسم تصویر بن کر کہتی ہے ؎

لیتا ہے میرے دل میں غم آرام اس طرح
سنسان جنگلوں میں پڑے شام جس طرح

وہ اپنے سارے وقت کو جو رونے دھونے اور بے باپ کے بچوں کو دیکھ کر کڑھنے سے بچتا تھا۔ محنت و مشقت میں لٹاتی تھی۔ دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھتی تھی۔ اپنا پیٹ کاٹتی تھی۔ انہیں کھلاتی تھی۔ خود پھٹا پرانا پہنتی تھی۔ انہیں اچھے سے اچھا پہناتی تھی لیکن پھر بھی وہ بات پیدا نہ کرسکتی تھی جو اس بندھی ہوئی آمدنی میں میسر تھی۔ گزشتہ دو ہفتوں سے وہ اسی پریشانی میں مبتلا تھی کہ عید کے موقعہ پر بچوں کے پاس نئے کپڑے ہو جائیں۔ اور دو چار آنے مٹھائی اور کھلونوں کے لئے بھی مل جائیں وہ اپنے لٹے ہوئے آپے کے غم کو بھول گئی تھی اور ہر وقت اسی فکر و تردد میں رہتی تھی کہ عید سر پر آرہی ہے۔ اور سب کام ادھورے ہیں۔

اس نے خون پانی ایک کر دیا تھا۔ اپنی تمام امکانی طاقت اس کام میں لگا دی تھی۔ مگر پھر بھی بچے کے پاس نئی ٹوپی نہ ہو سکی۔ لڑکی کی اوڑھنی تو سنور گئی۔ مگر نیا کُرتا میسر نہ آسکا۔ اس کی ممتا تڑپ رہی ہے۔ حسرت کلیجہ چیر کر باہر نکلنا چاہتی ہے دل بے چین ہے اور آنکھیں پُرنم ایک خیال آتا ہے ایک جاتا ہے۔ بچوں کو دیکھتی ہے اور روتی ہے۔ دو پیسے بڑی مشکل سے دونوں کو دئے ہیں۔ مگر اندر والا خوش نہیں ہے۔ تھوڑی سی سویاں پکائی ہیں۔ مگر کیا تینوں کا پیٹ بھر جائے گا۔؟

گذشتہ عید کے موقعہ پر تو ان کا باپ ملازمت کی وجہ سے باہر گیا ہوا تھا لیکن بچے کو بوڑھے نانا کے ہمراہ عید گاہ بھجوا دیا تھا۔ اب کے نہ باپ ہے

نہ چھوڑا جاتا۔ بچہ کس کے ساتھ جائے؟ دن بھر آپ روئے اور بچوں کو رلائے بس یہی کرے۔ خیر یہ مشکل خدا نے آسان کر دی۔ ہمسائی کے میاں اپنے بچوں کے ساتھ اس کے بچے کو بھی لے گئے۔ بیچارے خود بھی مفلوک الحال تھے۔ کوئی آسودہ نہ تھے پھر بھی دو ڈھائی آنے کی چیزیں اسے خرید دیں۔ بچہ اس قدر خوش ہوا گویا اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔

ایسے لوگ خدا کی نگاہ میں ان امیروں سے لاکھ درجہ اچھے ہیں جن کے نام پر دنیا تھوتھو کرتی ہے۔ اور جن کی کمائی میں عیاشی اور فضول خرچی کے لئے تو ہزاروں لاکھوں روپئے موجود ہیں۔ مگر رانڈوں یتیموں محتاجوں اور بے کسوں کے حق کا ایک پیسہ بھی نہیں۔ حیف ہے ان ارباب غفلت و نشاط پر جو عید کے دن خود تو خوشیاں منائیں۔ اچھے اچھے لباس پہنیں۔ لذیذ کھانے کھائیں۔ مگر ان کے پڑوس میں رہنے والے غربا و مساکین شکم پری سے بھی محروم رہیں۔ ان کی خبر بھی نہ لی جائے۔ ان کو پوچھا تک نہ جائے۔ منتوں اور دولتمندوں کے لاڈلے تو ریشم و کمخواب کے جوڑے زیب تن کریں لیکن گھر کے پاس بسنے والے غریبوں کے جگر گوشے ستر پوشی کے لئے بھی آنسو بہائیں اور ایک ایک کا منہ دیکھ کر رہ جائیں۔

آہ! ایک زمانہ تھا کہ لوگ اپنے سے زیادہ دوسروں کی ضرورت کا خیال رکھا کرتے تھے۔ اور حاجتمندوں کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ مشہور مورخ اور سیرت نگار واقدی جس نے ۲۰۷ھ میں بعہد مامون رشید وفات پائی۔ اپنے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے کے لوگ کتنے ایثار پیشہ ہوتے تھے۔

واقدی لکھتا ہے کہ میرے دو دوست تھے جن میں سے ایک ہاشمی تھا ہم تینوں اپنے آپ کو ایک جان سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ میں افلاس میں اتنا مبتلا ہوا کہ سامان خورد و نوش مہیا کرنے سے بھی عاجز آگیا۔ بہتیری دوڑ دھوپ کی مگر ہاتھ نہ کھلا۔ اتنے میں عید آگئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا۔ بیوی نے کہا کہ ہم تو محتاجی کی تکلیف برداشت کرلیں گے۔ اور صبر شکر کرکے جوں توں دن کاٹ لیں گے۔ مگر بچوں کی حالت مجھ سے نہ دیکھی جائے گی۔ کل جب ان کے ہم عمر بچے رنگا رنگ کپڑے پہن کر نکلیں گے تو میرے بچے روئیں گے اور عیدی کے لئے ترسیں گے۔ اس وقت قیامت کا سامنا ہوگا اگر آپ سے ہو سکے تو کوئی تدبیر کرو۔ کہیں سے تھوڑی بہت نقدی لاؤ اور ان کلیجے کے ٹکڑوں کی ضروریات میں خرچ کرو۔ تاکہ ان کی عید خیریت سے گزر جائے۔

بیوی کی یہ بات میرے دل میں کھب گئی اور میں اتنا متاثر ہوا کہ میں نے اسی وقت دو فقرے لکھ کر اپنے ہاشمی دوست کی طرف بھیج دئے جن میں اپنی ناداری اور محتاجی کا اشارہ اس طرح کیا ؏ بینوا ایم و عید می آید

"ہم ہیں محتاج اور عید آئی ہے"

رقعہ ملتے ہی اس نے ایک سربمہر تھیلی جس میں ایک ہزار درہم تھے۔ میرے پاس بھیج دی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ابھی میں نے تھیلی کا منہ نہ کھولا تھا کہ میرے دوسرے دوست کا رقعہ میرے پاس پہونچا جس میں لکھا تھا ؎

شدہ ست کہ خستۂ تیغ تجرّم!
گر ہیچ ممکن است مرا مرہمے فرست

میں نے اپنی ضرورت کا خیال چھوڑ دیا اور وہی سربمہر تھیلی اٹھا کر اس کے پاس روانہ کردی اور بچوں سے شرمندہ ہونے کے سبب سے وہ رات گھر کی بجائے مسجد میں بسر کی۔

دوسرے دن میرا ہاشمی دوست اسی سربمہر تھیلی کو لے کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ کل جو تھیلی میں نے تمہیں بھیجی تھی وہ کہاں ہے۔ میں نے اسے سارا قصہ سنایا

. . . .

اس نے کہا کہ جب تمہارا رقعہ میرے پاس پہونچا تو اس وقت اس تھیلی کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا۔ مگر مروت نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں اس میں سے کچھ اپنے پاس رکھوں اور پوری کی پوری رقم تمہیں نہ بھیجدوں اور چونکہ مجھے بھی ضروری اخراجات درپیش تھے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں فلاں شخص کو جو میرا اور تمہارے دونوں کا دوست ہے۔ پیغام بھیجوں اور اس سے کچھ طلب کروں۔ جب میرا پیغام اس کے پاس پہونچا تو اس نے میری ہی تھیلی جوں کی توں میرے پاس بھیجدی۔ میں سخت متعجب ہوا میں نے خیال کیا کہ بعض اوقات مرد وفا کی خاطر سونے چاندی کی حفاظت پر لات مار دیتے ہیں اسی لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ اصل حال معلوم کروں۔

اس کے بعد ہم نے تیسرے دوست کو بلایا اور ایک سو درم الگ کرنے کے بعد جو بچوں کے اخراجات کے لئے منظور ہوئے۔ باقی رقم تین برابر حصوں میں تقسیم کرلی اور سب کی عید ہوگئی۔

مشرق و مغرب دوستوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن ایسے دوست کہاں میسر آتے ہیں جو اپنی ضرورتوں اور آسائشوں کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں خوشی محسوس کرتے اور ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

بقیہ صفحہ (۶۸) شکایت کردوں گی۔"

"دوست ہوکر بھی میں نے دوست سے ایک بات چھپائی ہے لیلا! کرشن سو رہا تھا۔ میں نے پڑھنے کے لئے بجلی کا بٹن دبایا۔ اور لیلا ..... لیلا استفسارانہ نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ پیڈ پر ایک کاغذ پڑا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔

بابوجی ......!
ہم پیار کرتے تھے ایک دوسرے کو اب بھی کر سکتے ہیں .... بھیا....۔
تمہاری:۔ للی

لیلا یکایک چونک پڑی ۔! یہ تو اسی نے لکھا تھا۔ اس کے باپ کے گھر کے پاس ایک بابوجی .... چلئے اندھیرا بڑھ رہا ہے.......۔" دونوں دھندلے سنسان صحرائی راستے پر چلے جا رہے تھے۔ لیلا سوچ رہی تھی "کرشن .... بابوجی... لیلا..... بچپن کی للی ۔"

دوسرے روز ۔۔ ایک ہاتھ میں تار کا لفافہ لئے ہوئے کنول اندر آیا۔ لیلا ایک بار کانپ اٹھی۔ کنول نے لفافہ کھولا اور تڑپتے تڑپتے دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ لیلا آنکھوں میں الفت رفتہ کی یاد کے نقوش کو دبائی ہوئی پڑھ رہی تھی: یکایک قلب کی حرکت بند

HIND PICTURES
HIND PICTURES
ہند پکچرز بمبئی
کا
دوسرا قابل
فخر کارنامہ!
SOCIETY
سوسائٹی
آپ نے
بہت سی
سوسائٹیاں
دیکھی ہونگی۔ مگر
اس سوسائٹی
میں آپ کو
ملیں گی جنکو
نئی ہی باتیں
مسٹر نذیر
بہت جلد آپ کے سامنے پیش کرینگے
اور سائٹہ میں گوپ۔ مجید۔ الکنندا، راجکماری شکلا (کلکتہ والی)
مالتی (دگونگی) شام، انوری، چوپڑا، رام اوتار، وغیرہ اپنی اداکاری کے
جوہر دکھائینگے
ڈائرکشن
نذیر
گانے ہونگے:-
حسرت لکھنوی
میوزک:-
رفیق غزنوی
بی۔ اے
For Territorial Rights:-
HIND PICTURES
126, Main Road, Dadar, BOMBAY 14

شہنشاہ اکبر اور ملکہ جودہ بائی

ہندوستان کی تاریخ میں شہنشاہ اکبر کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جو ہندوستانی رعایا میں ہمیشہ ہر دلعزیز اور توصیف و ستائش کی مستحق رہی، اس جلیل القدر و والاتبار شہنشاہ کا پورا نام ابوالفتح جلال الدین محمد ہے۔ آپ شہنشاہ ہمایوں کے بڑے شاہزادے تھے اور سندھ میں واقع شدہ امرکوٹ نگر میں ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء میں جبکہ شہنشاہ ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر رانا پرشاد کے یہاں بحیثیت ایک پناہ گزیں کے فروکش تھے آپ نے اپنی ولادت سے شہنشاہ ہمایوں کا غم غلط کیا۔

شہنشاہ ہمایوں کا ۱۵۵۵ء میں جب اچانک انتقال ہوا اس وقت شہزادہ اکبر کی عمر تیرہ برس نو مہینہ کی تھی اور آپ سمالک "پہاڑ کیطرف" کا لانور" میں جہاں سے سکندر نے شیر شاہ سوری کو شکست فاش دیکر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اقامت پذیر تھے۔ شہنشاہ ہمایوں کے انتقال سے کسی ناخوشگوار واقعہ کے رونما ہونے سے قبل بیرام خاں اور دیگر وزراء سلطنت نے اسی سال آپ کی شہنشاہیت کا اعلان کیا اور آپ نے سریر آرائے سلطنت ہوتے ہی گجرات۔ بنگال کشمیر اور سندھ وغیرہ فتح کر کے ان تمام شہروں کو اپنے قلمرو میں شامل کیا اور آگرہ، الہ آباد، اٹک اور دوسرے مقامات پر جدید قلعے تعمیر کراتے ہوئے آگرہ میں واقع شدہ فتحپور سیکری کی قلعہ بندیوں کی مرمت کرائی آپ بالعموم فتحپور سیکری ہی ایں رہائش پسند کرتے تھے آپ نے کل ۴۹ سال تک ہندوستان پر حکومت کی اور بعمر ۶۳ سال ۱۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء میں اس عالم فانی سے کوچ کیا آپ کا دلکش روضہ آگرہ سے ۵ میل کے فاصلہ پر سکندرہ میں واقع ہے جسے شہنشاہ جہانگیر نے بنوایا تھا اور جو آج بھی اس جلیل القدر شہنشاہ کی یاد میں ہیں سرشک غم بہانے پر مجبور کرتا ہے۔ شہنشاہ اکبر نے بہ قید حیات ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے لئے بے انتہا کوششیں کیں اور یہی وجہ تھی کہ دربارِ اکبری میں ہندو بڑے بڑے عہدہ پر فائز اور مامور تھے۔ شہنشاہ اکبر کے پہلو میں جو تصویر ہے وہ جے پور کے راجہ بھارمل کی بڑی شاہزادی ملکہ جودہ بائی کی ہے، آپ شہنشاہ جہانگیر کی والدۂ ماجدہ ہیں۔ اور مریم زمانی کے نام سے مشہور ہیں!
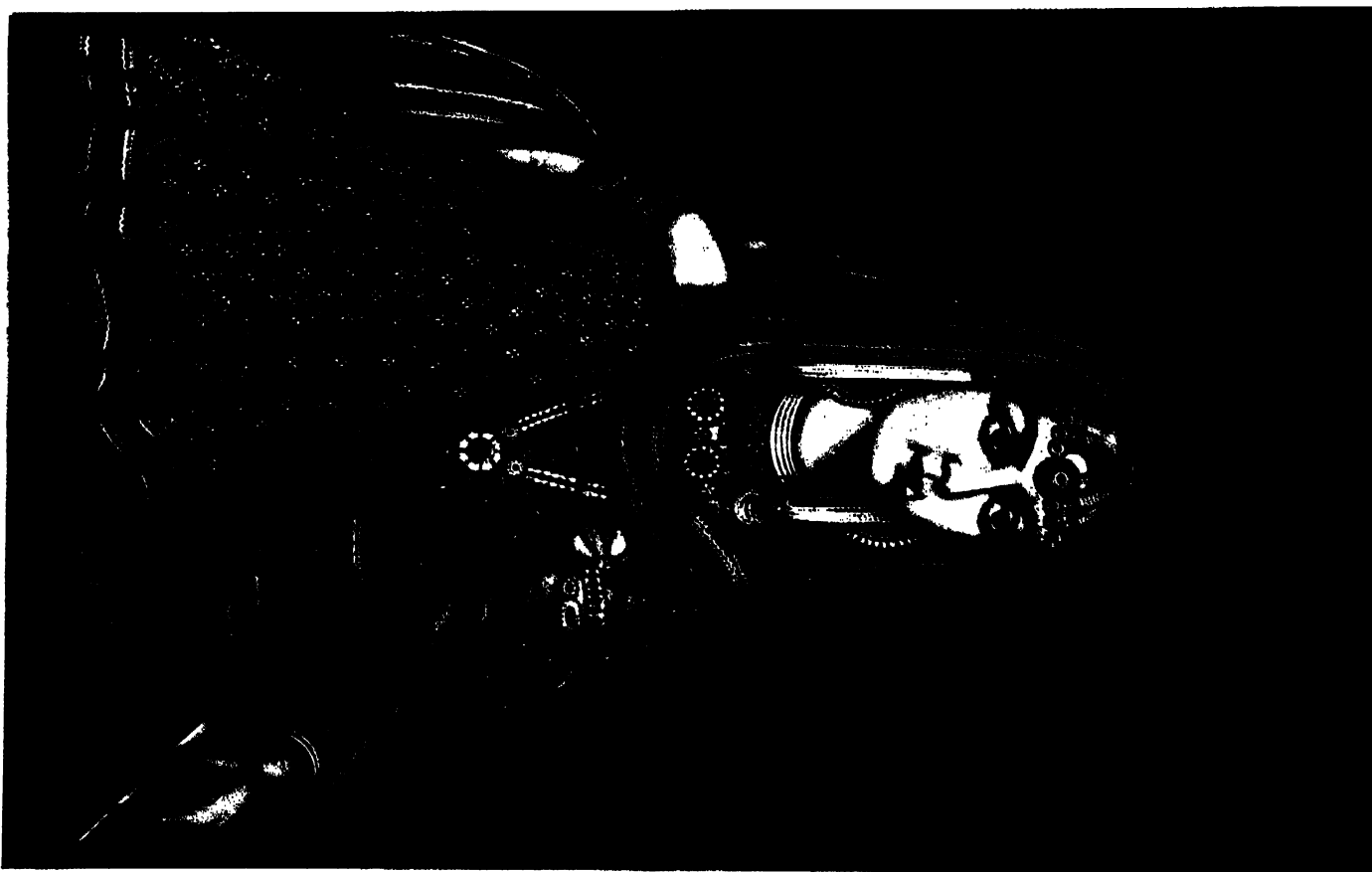
خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

ممالک متوسط کے کوہستان سے ریل کا گذر

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

(اثر خامۂ حضرت فروغ علوی کاکوروی، ایم، اے، بی، ٹی!!!)

صبح!

وہ سلسلۂ کوہ پہ چھایا ہوا...... گلزار
صبح متبسم کی وہ رنگینیٔ زرکار.....
وہ رنگ شفق، بادشمال اور... وہ کہسار
وہ دھندلی فضاؤں میں بھڑکتے ہوئے انوار

دامن میں پہاڑوں کے وہ اتراتی ہوئی ریل!
مستی میں چلی جاتی ہے بل کھاتی ہوئی ریل!

〃

اُف نیر اعظم کا وہ خاموش ترانا
سائے کا وہ سنسان وادیوں کی تہ میں چھپانا
وہ نرم شعاعوں کا مچلنا، وہ بجانا
مرغانِ نواسنج کا اڑ اُڑ کے وہ.... گانا

وہ پرزوں کی ٹھنکار پہ لہراتی ہوئی ریل
وہ جاتی ہے کس شان سے اٹھلاتی ہوئی ریل

دوپہر

وہ دھوپ، وہ کہسار پہ چھائی ہوئی زردی،
وہ ریگ کے تودوں کی لپک، شعلۂ ارضی،
اشجار کے گلدستوں کی وہ سبزی و سرخی
وہ تاب و تب سنگ، ہواؤں کی وہ گرمی

وہ گرمیٔ رفتار سے اتراتی ہوئی ریل!
خاموش فضاؤں کو وہ گرماتی ہوئی ریل

شام

وہ شام، وہ زرریز وہ زرکار فضائیں
وہ چلتی ہوئی زمزمہ پرواز...... ہوائیں
وہ اٹھتی ہوئی جانب مشرق سے گھٹائیں
ہر چیز میں وہ خانہ برانداز.... ادائیں

وہ تیز روی پری کو شرماتی ہوئی ریل
وہ کوہ و بیابان کو گرماتی ہوئی ریل

رات

وہ شب کی سیاہی میں ہلالِ متبسم
وہ تاروں کی دزدیدہ نگاہِ..... متکلم
وہ چاندنی، وہ روشنی نرم و ملائم
خاموشیٔ صحرا میں وہ آوازِ بہائم

فوارۂ دودی کو وہ برساتی ہوئی ریل!
بھک بھک سے وہ ماحول کو گرماتی ہوئی ریل

〃

وہ تاروں کے کھمبوں کی روش، تاروں کی جنبش
اشجار کی وہ تیز روی، اور وہ گردش
اک سلسلۂ لامتناہی ہے وہ لرزش
دنیائے مناظر کی وہ نیرنگ نمائش

وہ گردش افلاک کو بتلاتی ہوئی ریل
وہ وقت کی رفتار کو دکھلاتی ہوئی ریل

〃

وہ کوک، بھکا بھک، وہ زنازن، وہ اڑانی
وہ گرمیٔ رفتار، وہ بدمستی و شوخی!
جاتی ہے فروغ اور بھی بل کھاتی ہوئی ریل
طے کرتی چلی جاتی ہے پستی و بلندی!
کب بادِ مخالف کو بھی خاطر میں ہے لاتی
اکثر عمل آپ کو بتلاتی ہوئی ریل!!

تاریخِ اسلام کا یہ نہایت ہی اندوہناک واقعہ ہے کہ عجم میں آکر اسلام کی فطری سادگی مجروح ہوگئی۔ اسلامی فتوحات کے ابتدائی دور میں، اسلامی تمدن، عجم کے تمدن پر غالب آگیا۔ لیکن حکومتِ الٰہی کی جگہ ملوکیت .... ( ) کے قائم ہوتے ہی، جاہلانہ اور غیر اسلامی تہذیب پھر ابھر آئی اور ملتِ اسلامیہ میں عجم کی خو بو بس گئی۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کی ایک شعر میں ترجمانی کی ہے :-

سہ عجم کی روایات میں کھو گئی !
یہ امت خرافات میں کھو گئی

مسلمان بادشاہوں نے اپنے ذاتی اقتدار اور انفرادی نفع اندوزی کو برقرار رکھنے کے لئے اسلامی اسپرٹ سے دیدہ و دانستہ اعراض برتا اور غیر اسلامی رسم و رواج کو فروغ دیا، اس افسوسناک لغزش اور خطر آمیز غلطی کو "رواداری" اور "مشربِ صلحِ کل" کے خوبصورت ناموں سے تعبیر کیا گیا۔ مگر الفاظ کے ردو بدل سے حقیقتیں نہیں بدلا کرتیں۔ برف کا نام اگر آگ رکھ دیا جائے تو کیا برف کو آگ کہہ دینے سے برف کی ٹھنڈک بھی گرمی سے بدل جائے گی۔ اس عجمی روش اور جاہلانہ تصورات کا یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے ایک دنیا کو تھرا دیا تھا اور جن کی تلواروں کی جھنکار نغمۂ تکبیر بن کر گونجتی تھی، ان کی اولاد۔ نازنینانِ حرم کے جھرمٹ میں عود اور بربط کے تاروں سے کھیلنے لگی۔ اسلام نے شمشیر و سناں ہاتھوں میں دی تھی عجم نے شمشیر و سناں کو طاؤس و رباب سے بدل دیا۔

ع نگہہ کی نامسلمانی سے فریاد

اس تمام تباہی کے باوجود اسلام نے دلوں میں جو آگ بھڑکا دی تھی اس کی کجلائی ہوئی چنگاریاں مسلمان بادشاہوں کے سینوں میں باقی تھیں۔ اسی چیز کا اثر [illegible] رفاہِ عام اور خدمتِ خلق کے لئے انھوں نے بہت کچھ کیا جس کا ایک منظر یہاں [illegible] کیا جاتا ہے۔

[illegible] اولیت

مغربی تمدن ہسپتالوں، دواخانوں اور تیمار داروں کے انتظامات پر فخر کرتا ہے اور ناواقف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہسپتالوں کی [illegible] کی ایجاد ہے۔ حالانکہ اس سے سینکڑوں سال پہلے مسلمان بادشاہ [illegible] چکے تھے اور اسلامی شفاخانے اپنے زمانے میں اپنی آپ مثال تھے [illegible] یہ اسی کی نقالی ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مغرب کو نقالی میں کمال حاصل ہے وہ پرائے مال کو اپنا مال بتا کر پیش کرتا ہے ناواقف اور بے خبر اس دام میں آجاتے ہیں۔ میں آج ان ہی حلقہ ہائے فریب کی دھجیاں بکھیرنا چاہتا ہوں

بعض شفاخانوں کے نام

مسلمان بادشاہوں کی حکومت میں بہت بڑے بڑے مقامات اور مراکز پر بہترین شفاخانے قائم تھے، جن میں ہر مرض کے لئے دوائیں تیار رہتی تھیں اور "علم العقاقیر" (جڑی بوٹیوں کا علم) معراجِ کمال پر تھا۔ مکہ۔ مدینہ۔ بغداد، طرابلس، حلب، انطاکیہ۔ قاہرہ۔ اندلس۔ اور ایران کے شفاخانے بہترین اسلوب پر قائم کئے گئے تھے۔

شفاخانوں کی بہتات کا یہ عالم تھا کہ ایک شہر دمشق میں متعدد شفاخانے قائم تھے۔ جن میں سے پانچ شفاخانوں کے نام ہم تاریخ میں ملتے ہیں۔

(۱) شفاخانہ ولید بن عبدالملک (۲) شفاخانہ دقاقیہ (۳) شفاخانہ نوریہ (۴) شفاخانہ قیمریہ (۵) شفاخانہ رکنیہ۔

طبی انتظامات

عضد الدولہ کے عہدِ حکومت میں گشتی شفاخانہ بھی تھا۔ اطبا، چھوٹے چھوٹے قریوں میں دورہ کر کے مریضوں کا علاج کرتے تھے اور اس طرح گاؤں کے رہنے والے شہروں کے شفاخانوں میں علاج کی غرض سے آنے کی زحمت سے بچ جاتے تھے۔

شفاخانوں میں فنِ طب کی کتابیں بھی مہیا کی جاتی تھیں، تاکہ اطبا، ضرورت کے وقت (Consult) کر سکیں۔ اس علمی اور فنی نظام نے یہاں تک ترقی کی کہ خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں فنِ طبابت کی سند (Diploma) دی جانے لگی اور مستند طبیب ذمہ داری کے ساتھ علاج کرنے لگے۔

قیدیوں کے علاج کے لئے بھی قید خانوں میں شفاخانے قائم ہو چکے تھے تیسری صدی ہجری میں قیدیوں کے علاج کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

مخصوص شفاخانے

مختلف امراض کے لئے مخصوص شفاخانے قائم تھے ۸۸ھ میں کوڑھیوں کے لئے دمشق میں ایک شفاخانہ قائم ہوا جس میں صرف جذامیوں کا علاج کیا جاتا تھا۔

اسی مہذب یورپ کے آباؤ اجداد قرونِ وسطیٰ میں بہت دنوں کے مریضوں اور خصوصاً جذامیوں کو آگ میں زندہ جلا دیا کرتے تھے۔ مگر مسلمان حکومتوں نے ایسے مایوس مریضوں کی جان بچانے کے لئے شفاخانے تعمیر کرائے۔ فاس میں سید ابوالعباس سبتی نے مزمن امراض والوں اور اندھوں کے لئے شفاخانہ بنایا۔ مراکش کا ایک

شفاخانہ صرف پاگلوں کے لئے مخصوص تھا۔ طرطوس ہسپتال بھی اس عہد میں قائم ہو چکا تھا۔

مغربی طب کو "انجکشن" کی ایجاد پہ ناز ہے، مگر آج سے سیکڑوں سال پہلے۔ احمد ابن طولون شاہ مصر نے مصر میں ایک ایسا دواخانہ قائم کیا جس میں فوری اور ناگہانی مرضوں اور حادثوں کے لئے دوائیں تیار رہتی تھیں۔ یہ دواخانہ اپنی افادیت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا اور دور دور مشہور تھا۔

جائے وقوع :-

شفاخانوں کو صحت بخش مقاموں پہ بنانے کا تصور اس وقت موجود تھا چنانچہ عضد الدولہ شاہ دیلم نے جب بغداد میں شفاخانہ تعمیر کرانے کا خیال ظاہر کیا تو سب سے پہلے اس دور کے نامور طبیب اور حکیم علامہ رازی سے مشورہ کیا۔ رازی نے شہر بغداد کے مختلف گوشوں میں کچا گوشت لٹکوا دیا اور جس مقام کا گوشت زیادہ دیر میں خراب ہوا وہیں شفاخانہ عضدیہ کی بنا ڈالی گئی یہ شفاخانہ اپنے دور کا بہت بڑا شفاخانہ تھا۔

تنظیم

شفاخانوں میں عورتوں اور مردوں کے جداگانہ کمرے ہوتے تھے پردے کا بہت معقول انتظام تھا۔ مریضوں کے خورونوش۔ رہنے ...... سینے اور پہننے اور اوڑھنے کے لئے ہر قسم کی ...... سہولتیں مہیا تھیں۔ مریضوں کے مختلف حلقے (Ward) مقرر تھے۔ مریضوں کو امراض کی مناسبت سے مخصوص کروں اور وارڈوں میں رکھا جاتا تھا۔

اچھے اور تندرست ہونے پر جب مریضوں کو شفاخانوں سے رخصت کیا جاتا تو چلتے وقت ان کو معقول رقم بھی حکومت کی طرف سے عطا کی جاتی۔ تاکہ مریض کچھ دن تک روزگار اور معیشت کی مشقت سے دور رہ کر اپنے گھروں پر آرام کر سکیں اور اچھی غذا کھا سکیں۔

آج مغربی طب کے خداوند اس تصور سے نا آشنا ہیں۔

حرفِ آخر

مضمون بہت مختصر ہے۔ مگر ارباب فکر اور اہل بصیرت کو ایک نکتہ بھی بہت ہوتا ہے۔ میں اپنے ناظرین سے غور و فکر کی توقع رکھتا ہوں اور یہی غور و فکر میری عرق ریزی کا حقیقی صلہ اور میری محنت کی صحیح داد...... ستائش ہے!

(تمام شد!)

حقائق و بصائر

قوموں میں جو موجود ہو کوتاہیٔ اخلاق!
توسیع معیشت نہیں کچھ وجہ مباہات
تشکیل عمل میں ہے زمانے کا خسارہ
تقسیم عمل گر نہیں از روئے مساوات
قربانیٔ زر سے نہ ملازمت صحت!
اس راہ میں مقبول ہے قربانیٔ لذّات
انصاف سے حاصل نہ ہوا مقصدِ انصاف
ایسا بھی زمانے میں ہوا ہے بہت اوقات
ممکن ہے مکافاتِ عمل میں ہو گرفتار
وہ قوم، کہ ہے منتظرِ روزِ مکافات!
سمجھی نہ حوادث کے بتدریج عمل کو
جس قوم کی تقدیر میں تھی مرگِ مفاجات
اے زیب یقینی ہی کہ جابر ہوں وہ اقوام
حاصل ہے جنہیں جن میں تخصیص مراعات!

اثر خامہ محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ لدھیانوی

وقفۂ زندگی!

(۱) انسان پانی کا بلبلا ہے اس کو ٹوٹتے دیر نہیں لگتی اس حباب کو پانی کا تیز جھونکا توڑ دے۔ خواہ یہ خود پانی میں مل جائے۔

(۲) انسانی زندگی کا عرصہ اتنا ہی مختصر ہے جیسے جگنو فضا میں جگمگاتے ہی اپنے پروں کو سمیٹ لے اور روشنی غائب ہو جائے۔

آہِ مظلوم!

(۱) غریب کے دل کو نہ دکھاؤ اس کے دل کے ساتھ کائنات بھی کانپ اٹھتی ہے۔

(۲) مظلوم کے آنسوؤں میں سمندر کے مد و جزر سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔
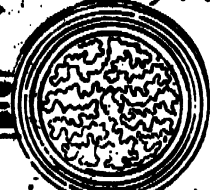
مصائب

(۱) مصائب کی رگڑ ہی سے شرافت کے زنگ آلود آئینہ پر جلا ہوتی ہے۔

(۲) مصائب کی سختی سے ضمیر کی قوت بیدار ہو جاتی ہے۔

پرنٹر حسن علی علی محمد سمار نے انجیلی پریس واقع ڈونگری میں چھاپ کر دفتر سے ایچ ایس
(بھارل پبلشر نے شائع کیا!)

ایک بصیرت افروز اور درس آموز مضمون

فریادِ عمل

از جناب محمد ایوب صاحب صابر (راز غزالی)

خاص برائے الاصلاح عید نمبر!!

آہ! آج دنیائے اسلام میں میری کوئی قدر نہیں۔ کوئی میرا چاہنے والا نہیں مجھے کوئی برتنے والا نہیں۔ میری آواز صدا بصحرا سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ہاں۔ آج سے چند صدی پہلے میری بہت قدر تھی۔ ہر مسلمان میرا شیدائی تھا۔ میری جگہ لوگوں کے پُرجوش قلوب میں تھی۔ میرے صدقہ میں عرب کے بادیہ گرد نصف دنیا کے شہنشاہ ہو گئے۔ انہیں کے ہم مذہب مجھکو برت کر ہندوستان کی قسمت کے مالک بن گئے۔ اسپین میں آٹھ سو برس تک حکمراں رہے۔ قرطبہ کے کھنڈرات آج بھی شاہد ہیں۔ براعظم افریقہ کے ذرات پر محیط ہو گئے۔ لیکن جب مسلمان میرے صدقے میں بام عروج پر پہونچ گئے۔ انہیں دنیا کی تمام قوموں میں سرفرازی حاصل ہو گئی۔ اور خیر الامم کا لقب ان پر صادق آگیا۔ جب ان میں دنیا کی تمام حکمتیں بھر گئیں۔ تب وہ مجھے بتدریج فراموش کرنے لگے۔ میں ان کی نظروں سے گر گیا اور کس مپرسی کی حالت میں در در کی ٹھوکریں کھانے لگا۔ میں نے صدائے بے کسی بلند کی لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ میں نے بہت نیچ اونچ سمجھایا۔ لیکن افسوس کہ میری ایک نہ سُنی گئی۔ دن عید اور رات شب برات کے مصداق وہ بزم رقص و سرود برپا رہتی کہ نہ دین کی خبر نہ دنیا کی۔ بزم نا و نوش تھی اور یارانِ بداندیش کا مجمع! آخر میں بھی مایوس ہو کر خاموش ہو رہا۔ قدرت نے بھی ڈھیل دے دی کچھ روز تک تو اسی حالت میں گذرتی رہی۔ لیکن کب تک؟ زوال و تخریب کے پیغامبر نے تباہی و بربادی کا پیغام دیا۔ بغداد کو ہلاکو خاں نے جلا کر خاک و سیاہ کر ڈالا اور وہ انقلاب بپا ہوا کہ بس خدا کی پناہ! اسپین پر شاہ فرڈیننڈ نے دھاوا بول دیا۔ اور ابوالحسن کے غدار اور قاتل بیٹے عبداللہ کے ہاتھوں آن کی آن میں آٹھ سو برس کے مستحکم و پُرجلال حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ہم کو فراموش کرنے والوں کا وہ حشر ہوا۔ کہ بس دشمن کو بھی وہ دن نہ دکھائے۔ ارے انتہا ہو گئی کہ ایک ایک مسلمان کو جلا وطن کر دیا گیا۔ اور اسپین میں ان کا ایک بھی فرد باقی نہ رہا۔

ہندوستان میں تو مجھے بھولنے والوں کا وہ انجام ہوا کہ الہی توبہ! اب بھی سننے والے سن کر رو دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ دنیائے اسلام میں ایسی تباہی آئی کہ مسلمانوں کا قابلِ رشک عروج زوال کے انتہائی عمیق میں دفن ہو گیا۔ میں نے رونے والوں سے اکثر کہا کہ "بھائی تم لوگوں نے مجھے فراموش کر دیا۔ اس کا نتیجہ تمہیں دیکھنا پڑا۔ رونے سے گمشدہ عروج کو اقبال حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں تو اب بھی ایک وفادار خادم کی طرح تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار رہوں۔ اگر تم مجھے برتو پھر تم وہی ہو سکتے ہو۔ ابھی کچھ نہیں گیا ہے صبح کا بھولا شام کو آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ دیکھو مغربی قومیں میری کیسی قدردان ہیں اور مجھ کو برت کر ساری دنیا پر حکمرانی کر رہی ہیں۔ اور تم بھی انہیں کے محکوم ہو۔ یہاں تک کہ آب و خاک باد و نار سب پر قابض ہیں۔ فضائے بسیط میں ہوائی جہاز اور سمندر میں دیو پیکر جہاز چل رہے ہیں۔ غرض وہ وہ ایجادیں اور حکمتیں پیدا کیں کہ دنیا محوِ حیرت ہے یہ سب کس کے صدقے میں ہے؟ میرے صدقے میں ہے؟ میرے صدقے میں اور صرف میرے صدقے میں۔ !میں کون ہوں؟ میرا نام کیا ہے؟ میں ہوں

عمل! عمل!! عمل!!!

کبھی وقتی اثرات سے مسلمان کچھ متاثر ہوئے بھی تو ان پر وہی نشۂ غفلت طاری ہو گیا۔ سر سید احمد خان پیدا ہوئے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی قائم کی۔ مسلم لیگ بنی مولانا محمد علیؒ نے خلافت کمیٹی بنائی۔ جمعیت علماء قائم ہوئی سب کچھ ہوا بڑی بڑی تجویزیں پاس ہوتی رہیں۔ بڑے بڑے لائحۂ عمل مرتب ہوتے رہے۔ لیکن جب عمل کا وقت آیا تو سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور اگر کروڑوں میں دو چار آدمیوں کے قلوب میں جوشِ عمل کا جذبہ پیدا ہوا بھی تو کیا؟ کتنی مایۂ ناز ہستیوں کو ان خوابِ غفلت کے ماتوں نے پیوندِ زمین کر دیا۔ اور خود چکنے گھڑے کی طرح کورے ہی رہے۔

مجھے اپنی گذشتہ قدردانیاں اب بھی یاد ہیں۔ اسی لئے میں بار باران کا انتباہ کرتا رہا۔ تاکہ وہ مجھے برت کر بامِ عروج پر چڑھیں اور میں اپنے شیدائیوں کے مرجع کو دیکھ کر عہدِ ماضی کی غم انگیز خیالات سے نجات پاؤں اور ان کو وہی رفعت و وقعت حاصل ہو جو نصف سے صدی پہلے حاصل تھا۔ غالباً یہ آخری انتباہ ہے اگر خوابِ غفلت سے جاگ تو جاگے۔ ورنہ پھر شاید زمانہ اس کا موقع نہ دے۔

اقوالِ زرّیں!

جورٹ نہ بولو اگر مصلحت مجبور نہ کرے ۔ کوڑھ مغزوں سے شرافت کا برتاؤ فضول ہے وقت کی رفتار کے پیشِ نظر ہر کام انجام دو ۔ بے عملی کو زندگی کا شعار نہ بناؤ۔ چاپلوسی و خوشامد سے محترز رہو ۔ دوسروں کے عیوب پر نظر کرنے کی بجائے اپنے معائب دور کرنے کی کوشش کرو۔

(یکتا)

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

تلوّن!

ایک واقعہ سے متاثر ہو کر!!

از محترمہ نجمہ تصدق صاحبہ ایم، اے، بی، ٹی!

(آغاز):

آغازِ محبت میں وہ اک صبحِ خراماں
آنکھوں میں سمیٹے ہوئے سو رنگ کے طوفاں

اب تک ہے تصور میں وہ بیدار نظارا
وہ مست سماں اب بھی نگاہوں میں ہے رقصاں

سانچے میں جوانی کے وہ ڈھالی ہوئی مورت
حوروں کے تبسم کی جھلک رخ پہ فروزاں

دزدیدہ نگاہوں میں وہ دزدیدہ تبسم!
وہ برقِ مجسم کبھی پنہاں کبھی عریاں

حسن اس کا جوانی کی تمناؤں کا مرکز!
وہ قامتِ خوش خوش سے خجل سروِ گلستاں

وہ نورِ شباب! اور وہ شرمیلی ادائیں
پیغامِ جنوں دل کے لئے جذبۂ پنہاں

انگڑائی سی لے کر ہوئی بیدار محبت
جذبات کی مستی ہوئی ہم رنگ گلستاں

امید کے آغوش میں [illegible] جذبے
آغاز میں ہوتا ہے مگر عشق ہی ناداں

(انجام):

اک وقت [illegible] جاتی ہے امید
فرصت نہیں ملتی کہ سئیں چاکِ گریباں

[illegible]
بربادیٔ احساس کے ہو جاتے ہیں ساماں

[illegible]
رہ جاتی ہے افسردہ و مجبور و پریشاں

(ترکِ تعلق کے کچھ عرصہ بعد):

کیوں [illegible] جوانی کے مچلتے ہیں [illegible]
اللہ یہ کون آتی ہے پھر حشر بداماں

کیوں حسن کی دنیا میں ہوا ہے [illegible]
کیوں بھولنے والی کا ہے انداز پشیماں

کیوں دیتی ہیں پیغامِ جنوں [illegible]
کیوں ان کے حسیں چہرے پہ زلفیں ہیں پریشاں

کیوں چھیڑتی ہیں [illegible]
کیوں جاری ہیں تجدیدِ محبت کے یہ فرماں

[illegible] عہدِ گزشتہ
کیوں ہوتے ہیں پھر سے تمنا کے پیماں

[illegible]
کوئی کون جواب [illegible] جذبات کے طوفاں

قدرت کی ستم ظریفیاں بھی عجب ہیں۔ کسی کو اس نے کیسا بنا دیا ہے۔ اور کسی کو کیسا، جیسے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک سانچا ہی نہیں ہے۔ جو نئی چیز بنتی ہے۔ اس کے لئے سانچا بھی نیا بنا یا جاتا ہے۔ اور فوراً توڑ دیا جاتا ہے۔ چیزوں اور جانوروں سے زیادہ انسانوں میں تو اس کا التزام بہت غیر معمولی طور پر رکھا گیا ہے۔ کیا مجال ہے کہ ایک انسان دوسرے سے مل تو جائے اور اس سے بڑھ کر قدرت کا مذاق یہ ہے کہ اس نے ایسے بانکے ترچھے۔ ایڑے بیڑے، اینچے۔ کینچے۔ کالے۔ پیلے۔ اونچے نیچے۔ کانے۔ اندھے۔ لولے۔ لنگڑے وغیرہ وغیرہ پیدا کر دیے ہیں کہ کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ کسی چوراہے پر یا کسی بازار میں ذرا کھڑے تو ہو جایئے۔ چند منٹ ہی میں وہ وہ نمونے نظر پڑیں گے کہ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ کوئی اکڑا اچلا جاتا ہے۔ کوئی جھکا زمیں دوز۔ کوئی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہر ہر شخص کو گھورتا جاتا ہے تو کوئی راستہ ٹٹولتا ہوا، کوئی دوڑتا یا جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہے۔ تو کوئی بدقت لنگڑا لنگڑا کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔

کچھ اسی قسم کا مذاق قدرت نے میرے ساتھ بھی کیا ہے۔ یعنی مختصراً یہ کہ مجھکو بھی اتفاق سے صرف "ڈیڑھ" ٹانگ کا بنا دیا ہے۔ کہنے کو تو صرف ذرا سی بات تھی۔ جو چند لفظوں میں ختم ہو گئی مگر حضرت! ذرا مجھ سے پوچھئے کہ میرے اوپر کیا گذرتی ہے۔ اچھا میں اپنا سارا حال آپ کو سُنائے دیتا ہوں۔

تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات برس تک تو آدمی ایسی حالت میں رہتا ہے۔ جبکہ اس کو بچہ کہتے ہیں اور ایسا بچہ جو نا سمجھ ہو۔ اس عمر تک، آپ کا جی چاہے تو، مجکو بھی آپ ناسمجھ اور بچہ سمجھ لیجئے اور غالباً ایسا تھا بھی اس لئے کہ مجکو خود اس بات کا احساس نہ تھا کہ قدرت نے میرے ساتھ کیا ستم ظریفی کی ہے۔ مگر بالآخر ایک چھوٹے سے واقعہ کے ساتھ یہ تلخ حقیقت میرے قلب و دماغ پر دے ماری گئی کہ میں بھی خدا کے عام بندوں میں نہیں ہوں۔ بلکہ بالکل مخصوص بلکہ خاص... الخاص۔

آپ جانتے ہیں کہ بچہ بچہ ہی ہوتا ہے۔ وہ بوڑھوں کی طرح متین سنجیدہ نیر تخرک۔ نیر دلچسپ اور نیر شاعرانہ وغیرہ وغیرہ نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ نے مجکو بھی اس عمر میں بچہ فرض کر لیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میرے اوپر ایسے شدید و سنگین اتہامات لگائے جائیں۔ یقیناً ہرگز نہیں لگائے جا سکتے، بیشک میں بچہ تھا اور اس میں رتی برابر شک نہیں کہ میں ضرور بالضرور بچہ ہی تھا۔ اور مجکو یقین کامل اور میرا ظن غالب یہی اور مقرر یہی ہے کہ میں ضرور بچہ تھا پھر جب میں بچہ تھا تو آپ جانتے ہیں کہ بچہ تو بچہ ہی ہوتا ہے۔ وہ کھیلنا بھی چاہتا ہے۔ وہ دوڑنا بھی چاہتا ہے۔ وہ کودنا۔ پھاندنا۔ اور شرارت کرنا بھی اپنا فرض منصبی نہیں بلکہ اپنا قدرتی حق سمجھتا ہے اور میں نہایت دعوے کے ساتھ بلا ڈرے یا جھجکے یہ کہتا ہوں کہ میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔ مختصر یہ کہ میں کودنا۔ پھاندنا چاہتا تھا اور لوگ ٹوکتے تھے۔ میں شرارت کرتا تھا اور لوگ خفا ہوتے تھے۔ میں محلے کے بازاری لڑکوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا تو بھی لوگ دیکھ نہ سکتے تھے۔ مگر میں آخر مانتا کیوں۔ لوگ چھپاتے تھے وہ کہتے تھے اور میں جو چاہتا تھا وہ کرتا تھا۔

آخر میرے والد صاحب نے تنگ آکر ان تمام میں سے چند کے ساتھ کھیلنے کی مجھکو اجازت دے ہی دی اور مجھکو کرکٹ کا کل سامان یعنی گیند۔ تھاپی۔ ڈنڈے وغیرہ سب لا دیا۔ اب کیا تھا "جو ہمارے سوراج کے نہیں" والا معاملہ تھا گرمیوں کی دوپہر خیال فرمایئے۔ اور میرا چپکے سے نکل بھاگنا اور اپنے انہیں مخصوص ساتھیوں کو نہایت تحکمانہ انداز سے طلب کرنا اور اپنے ساتھ کرکٹ کھیلنے کا حکم دینا۔ مگر وہ بھی تو آخر بچے ہی تھے۔ فوراً گھر کے سامنے میدان میں ڈنڈے گاڑ دیئے گئے اور میں سب سے پہلے نہایت فاخرانہ و فاتحانہ انداز سے تھاپی لے کر کھیلنے کے لئے تیار ہوا۔ ایک لڑکا گیند پھینکنے کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوا۔ اور بالآخر اس نے گیند پھینک ہی تو دیا۔ اور میں، جو ایک کار آزمودہ شکاری کی طرح مع اپنی ڈیڑھ ٹانگ کے تیار کھڑا تھا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھپٹا اور "بہت تیزی کی" کچھ ایسی ضرب دست لگائی کہ گیند وہ گیا اور تھاپی وہ گئی اور خود میں ایک بار چکر گھنی بنا ہوا چت اڑا اڑا دھم ہو گیا......... جتنے لڑکے تھے سب ہی تو ہنسنے لگے اور گو کافی چوٹ آئی تھی۔ مگر میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک جھلاہٹ کے ساتھ۔ جھپٹ کر میں نے تھاپی اٹھائی اور اس کی ایسی کی تیسی کر دوں، ہاں مسعود! اب کی تو گیند پھینکنا" کہتا ہوا پھر ڈنڈوں کے سامنے

سو اڈ تا ۔ میری اس جھلاہٹ پر لڑکوں نے اور بھی زیادہ ہنسنا شروع کیا ۔ مگر میں نے ایک تحکمانہ انداز سے ڈپٹ کر کہا " مسعود! گیند پھینکو " میری ڈانٹ بے نتیجہ نہ ہوئی مسعود نے پھر گیند پھینکا اور اب کی پہلے سے کہیں زیادہ زور اور غصہ کے ساتھ میں نے اس نا معقول گیند پر تھاپی کا وار کیا جس کی وجہ سے اس میں شک نہیں کہ گیند پہلے سے زیادہ دور گیا ۔ مگر اس کے ساتھ تھاپی بھی پہلے سے زیادہ دور پر گری بلکہ ایک لڑکا بچ گیا ورنہ اس کا سر ہی پھٹ جاتا اور میں خود بھی پہلے سے کہیں زیادہ زور سے گرا کہ کافی چوٹ آئی اور ساتھ ہی محسوس ہوا کہ میری ٹانگوں میں غالباً کوئی ایسا نقص ہے کہ میں جھوک کو سنبھال نہیں سکتا ہوں ۔ میں یہ بات سوچتا ہوا نہایت جھنجلاہٹ کے ساتھ زمین سے اٹھ رہا تھا کہ میری نظر لڑکوں پر پڑی جو اب کی زیادہ ہنس رہے تھے ۔ یہ دیکھ کر مجھکو اور بھی غصہ آگیا ۔ اتنے میں گیند مسعود کے ہاتھ میں آچکا تھا ۔ البتہ وہ ہنسنے میں مشغول تھا اس لیے اب کی میں نے اور زور سے ڈانٹ بتائی کہ " ہنستا کیا ہے گیند پھینک ابھی تجھے بتاتا ہوں " میری ڈانٹ پھر بے اثر نہ ہوئی اور اس نے وہی کام کیا جو درجے میں ماسٹر صاحب کا لفظ " سائی لنٹ " (Silent) کرتا ہے ۔ تمام لڑکے یک قلم دم بخود رہ گئے اور میں پہلے سے زیادہ فاتحانہ انداز سے گیند پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا ۔

مجھکو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا مسعود نے فوراً ہی گیند پھینکا اور میں نے پہلے سے کہیں زیادہ پھرتی اور زور کے ساتھ ضرب (ہٹ) لگائی کہ اگر چیل جھپٹا مارتی یا باز کسی کبوتر پر جھپٹتا تو بھی غالباً یہ تڑپا اور یہ جھپک نہ دکھلا سکتا ۔ بس یوں کہیے کہ گیند کے قریب آتے ہی میں ایک باز تھا اور وہ ہاتھ مارا کہ گیند اب کی لڑھکتا ہوا مسعود کے پیچھے تقریباً پچاس قدم تک چلا گیا اور چونکہ دو بار کے تجربہ کے بعد اب کے میں نے تھاپی کو غیر معمولی مضبوطی کے ساتھ پکڑا تھا اس لیے وہ بھی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور میں چھلانگ مار کر اور ہٹ لگا کر جیسے ہی زمین پر آیا ۔ گو بہت سخت جھٹکا اور جھوک کھا گیا تھا ۔ مگر پوری کوشش اور کامل ارادے کے ساتھ میں نے اپنے کو سنبھالا اور فوراً دوڑتا ہوا مسعود کے پاس تک چلا گیا ۔ کیونکہ میں نے لوگوں کو رن کرتے ہوئے دیکھا ہی تھا میں آخر کیوں نہ کرتا ۔ مگر ہنوز میں پہنچا نہ تھا کہ دفعتاً پھر میری آدھی ٹانگ نے خدا جانے کس عجیب طرح سے بل کھایا کہ میں دھڑام سے منہ کے بل زمین پر گر ہی پڑا اور ایسا گرا کہ سخت چوٹ آئی جس کو میں برداشت نہ کر سکا اور رونے لگا ۔ میرے والدین جو اندر سو رہے تھے میرے رونے کی آواز سن کر جاگ اٹھے اور میرے والد دوڑ کر آئے ۔ انھوں نے مجھے اٹھایا اور گھر لے گئے ۔

میرے کافی چوٹ آئی تھی اس لیے اس وقت تو والد یا والدہ نے سوائے چمکارنے اور دلاسا دینے کے کچھ نہ کہا مگر دوسرے دن کہ ہنوز میری چوٹ پورے طور پر اچھی نہ ہوئی تھی ۔ البتہ چونکہ " بچگاں را علم نباشد " میں نے اس تمام تکلیف ، سبکی ندامت اور خفت کو نہایت فراخ دلی اور بلند حوصلگی کے ساتھ بھلا دیا تھا اور حسب معمول چاق و چوبند تھا ۔ میرے والد نے نہایت افسردگی کے ساتھ ایک ہمدردانہ لہجہ میں مجھ سے کہا " بیٹا دیکھو ! اب تم دوڑنا دھوپنا نہیں ورنہ پھر گر پڑو گے ۔ تم نہیں جانتے کہ تمہاری ٹانگیں کمزور ہیں اور چلنے ہی میں تم کو کبھی دقت ہوتی ہے "۔

میں نے ان کی باتوں کا تو کوئی جواب نہ دیا ۔ مگر میں نے نہایت تعجب کے ساتھ ان کو دیکھا پھر اپنی ٹانگوں کو اور پھر ان کی ٹانگوں کو اور دوسروں کی ٹانگوں کو اب واقعی مجھکو بھی محسوس ہوا کہ ہاں ! دوسروں کی ٹانگوں کی بناوٹ اور میری ٹانگوں کی ساخت میں بہت فرق ہے ۔ اور میری ٹانگیں ان کی ٹانگوں کے مقابلہ میں کمزور بھی معلوم ہوتی ہیں جس کا مجھ پر بے حد اثر ہوا ۔

ماہرین تعلیمات نے نفسیات اطفال کا مطالعہ اساتذہ کے لئے لازمی قرار دیا ہے ۔ واقعی بہت اچھا کیا ہے ۔ اور میری رائے تو یہ ہے کہ گورنمنٹ کو چاہئے کہ ہر انسان پر یہ قید لگا دے کہ باپ بننے سے قبل وہ نفسیات اطفال کی ضروری کتابیں پڑھ لے بلکہ اس کا امتحان پاس کرے ۔ دیکھئے ! میرے والد نے جو کچھ مجھ سے کہا ۔ خالص محبت اور سچی دلسوزی کی بنا پر کہا ۔ مگر نتیجہ کیا ہوا ۔ اس قدر اوائل عمری میں اپنی ایک ایسی بڑی کمی کا احساس میرے دل و دماغ میں راسخ ہو گیا اور ایک مستقل (Inferiority Complex) مجھ میں پیدا ہو گئی ۔ سچ ہے گڑ بھی زہر بن سکتا ہے ۔

اس روز کا واقعہ میری حیات کا اہم ترین واقعہ تھا اور یہ انکشاف ایک جادو جس نے مجھکو کچھ اور بنا دیا اور میری زندگی کے رخ کو ایک خاص سمت موڑ دیا ۔ یہ احساس میرے دل و دماغ پر ہر وقت طاری رہتا ۔ میں اپنی چال ڈھال ۔ وضع قطع اور قد و قامت کا دوسروں سے مقابلہ کیا کرتا ۔ میرا فرصت کا مشغلہ بس یہی رہ گیا تھا اور عرصہ تک میں اپنے والد کے قول کی تصدیق میں مصروف رہا ۔ بالآخر حقیقت حقیقت ثابت ہو کر رہی ۔ اور کوئی وہم ۔ کوئی خیال ۔ کوئی صبح ، کوئی شام ۔ حتیٰ کہ کوئی قوت اور بڑے سے بڑا انقلاب اس حالت کو بدل نہ سکا اور میرے یقین کو باطل نہ کر سکا ۔ میرا دل ہر وقت نہیں بلکہ ہر ہر لمحہ میرے کان میں کہتا رہتا تھا کہ " تم تو لنگڑے ہو " اور غالباً سوتے میں بھی میں اس بات کو فراموش نہ کر سکتا تھا ۔ واقعی عجیب تلخ حقیقت تھی اور ایسی ضدی کہ پیچھا ہی نہ چھوڑتی تھی اور اس کم عمری میں بھی میرے اس غیر معمولی احساس کی آپ کو بھی داد دینا پڑے گی کہ میں " Devil may care " کے اصول کے برخلاف جو کم عمری کا زریں ترین لائحہ عمل ہوتا ہے ، اس قدر حساس واقع ہوا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بن گیا تھا ۔ اس لئے کہ میں جہاں جاتا تھا ، بڑے اور سن لوگ تو صرف یہی کرتے مجھکو غور سے دیکھنے لگتے تھے اور اکثر اُن میں سے کبھی صرف نظر سے اور کبھی زبان کے ذریعہ سے اظہار ہمدردی کیا کرتے تھے جسکو بے شک اور بجا طور پر میں دشمنی سے کم نہ سمجھتا تھا ۔ مگر میرے ہم عمر یا وہ بڑے چھوٹے جو اپنے " بچہ " کے لقب پر ابھی پورا قبضہ رکھتے تھے ۔ مجھکو دیکھتے ہی نہایت سرگرمی کا اظہار کر دیا کرتے تھے اور فوراً ایک سخت گیر ڈرل ماسٹر کی طرح جس کی آواز کرخت اور کڑک ہوتی ہے گویا Attention یا Attention ...... کہہ کر سب کو میری طرف دیکھنے اور ہمہ تن گوش نہیں بلکہ نظر ہو جانے پر مجبور کر دیا کرتے تھے اور پھر تو سب کے سب میری طرف اشارہ کر کے آپس میں گفتگو کرنا اور ہنسنا شروع کر دیتے تھے اس شیطانی گروہ کا خاص کر یہ فعل مجھکو ہر وقت ہوشیار و تیار رکھتا تھا اور میں بھی ایک انتقامی جذبہ کے ساتھ اپنے بدلے ہوئے تیوروں کے تیر و نشتر لئے ہوئے تیار رہتا تھا اور ہر ایسے حملے کا جواب ایک ایسی بے توجہی سے دیا کرتا تھا جو ان کے لئے نہ سہی مگر میرے ذاتی اطمینان کے لئے کافی ہوتی تھی اور اکثر مجھکو اس خیال سے لطف بھی دے جایا کرتی تھی کہ میں نے بھی ان کو قابل تخاطب نہ سمجھا اور کیسا انتقام لیا ۔

اُن کے اس مستقل طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرصۂ دراز تک میں ان سے متنفر رہا اور میری ہمدردیاں کبھی ان کے ساتھ نہ رہیں۔ مجھے نہ خود ان سے ہمدردی کی اُمید ہوتی تھی ورنہ میں اپنے بڑوں سے زیادہ اپنے برابر والوں سے گھبرایا کرتا تھا کیونکہ اکثر تو وہ مجھے دیکھتے ہی ہنسنا شروع کرتے اور مجھکو بنانے لگتے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ میرے دوست بہت کم تھے اور آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ کیسے لوگ ہوں گے۔ بے شک وہ ایسے ہی لوگ ہیں جو متین اور مہذب ہیں اور کسی پر تمسخر کرنا ان کا شیوہ نہیں۔

شاید میرے اس بیان سے آپ یہ سمجھے ہوں کہ مجھکو ہر وقت یہی فکر اور رنج رہتا ہوگا۔ میں پہلے ہی بتا چکا بلکہ ثابت کر چکا ہوں کہ میں بچہ تھا اور اگر آپ اجازت دیجئے تو میں اب بھی اپنے کو یہ خطاب دیلوں کیونکہ اس نام میں عجب جادو ہے جو آدمی کے رگ و پے میں دوڑ جاتا ہے۔ تو بچہ ہونے کی وجہ سے بڑا فائدہ تھا کہ ہر وقت یہ خطرات مجھکو گھیرے نہیں رہتے تھے اور وہ تو بہت گھیرتے مگر میں ہی ان کو نکال پھینکتا تھا۔ بھلا آپ ہی سمجھئے کہ مجھکو اتنی فرصت کہاں تھی کہ میں سارا وقت اسی خیال کے نذر کر دیتا۔ مجکو کھیلنا بھی تھا۔ پڑھنا بھی تھا۔ شرارت بھی کرنا تھی۔ آخر یہ سب کیونکر ہوتا پھر میں ایسا بے وقوف یا عقلمند بھی نہ تھا کہ آئندہ کی فکر کرتا اور یہ سوچتا کہ زمانۂ مستقبل میں قدرت کی اس غلطی کا خمیازہ مجھکو کیا بھگتنا پڑے گا اور یہ کہ قدرت نے مجھ پر یہ ایک بڑا ظلم کیا ہے۔ البتہ جب لڑکے مجھکو چڑھاتے۔ مجھ پر ہنستے یا جب میں اس ڈر سے کسی ایسے کھیل میں شریک نہ ہو سکتا جس کے کھیلنے کو میرا جی چاہتا تو بے شک مجھکو قدرت پر بھی بڑا غصہ آتا تھا اور میں جھنجلا جھنجلا کر اور جھلا جھلا کر رہ جاتا تھا۔ کاش ایسے وقت قدرت مجسم ہو کر میرے سامنے آجاتی یا اللہ میاں ہی کہیں دکھائی پڑ جاتے تو جی کی بھڑاس تو نکل ہی جاتی اور اگر اللہ میاں تھوڑی دیر کے لئے ہی مجکو اختیار دیدیتے تو میں چاہے اپنی ٹانگ کو اچھا کرتا یا نہ کرتا۔ کم سے کم ایسے نامعقولوں کو تو سزا ضرور دیتا جو مجھ پر کبھی ہنسے ہیں یا جنھوں نے میرا مضحکہ اڑایا ہے۔ مگر واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ گنجے کو خدا ناخون ہی نہیں دیتا۔ اب تو سوختن و ساختن کا معاملہ ہے۔ اور "شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن" کی شکل میرے لئے سکون قلب کا نسخہ بن گئی ہے۔

اس کے علاوہ بھی کسی نے ایک نسخہ اور بتایا تھا۔ کہتے ہیں کہ بہت مجرب ہے۔ اکسیر کی صفت رکھتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ یعنی جب اس قسم کی دماغی حالت میں انسان مبتلا ہو اور کسی طرح دل نامعقول کو بہلانا یا دھوکا دینا ممکن نہ معلوم ہوتا ہو تو بس ایسے لوگوں کی یاد اپنے دل میں تازہ کر لینا چاہئے۔ جن سے قدرت نے اپنے سے زیادہ مذاق کیا ہو۔ اور کہتے ہیں کہ فوراً ہی آدمی کا برسرِ حساب دل ٹھنڈا ہو کر دب جاتا ہے۔ ہاں اہے تو یہ نسخہ بیشک مجرب اور آزمودہ مگر کچھ بے لطف سا ہے۔ اس لئے مجھکو ہرگز پسند نہیں اور نہ میں اس کو اپنے کشودِ کار کا ذریعہ بنا سکتا ہوں میں نے اپنے دلِ دردمند کو ایک دوسرے طریقے سے بہلایا ہے۔ میں نے اول تو اس کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ قدرت کے کاموں پر کسی کو اختیار نہیں، وہ ایک ایسا مُنہ زور بیل ہے۔ جسکو چاہے مار جائے کوئی اس کا کچھ نہیں بنا سکتا، پھر ایسی حالت میں اگر میرا زور اس سے نہیں چلا اور اس نے مجھکو مار دیا تو تعجب کیوں نہیں۔ ان کو اگر وہ مار دے تو وہ کیا کریں گے۔ رہا یہ کہ میں نے کوئی انتقام کیوں نہیں لیا اول تو خیال کرنے کی بات ہے کہ اگر گدہا آپ کے لات مار دے یا کتا آپ کے کاٹ کھائے تو کیا آپ بھی گدہے کو اُکٹ کر لات ماریں گے یا کتے کے کاٹ لینگے؟ محض یہی وجہ ہے کہ میں نے قدرت سے انتقام لینے کا خیال نہیں کیا۔ اور اگر آپ غور کریں تو یہ انتقام کیا کم ہے کہ اس نے میری ٹانگ میں صنعت دکھائی۔ میں نے بھی ٹانگوں کے استعمال کو بے حد کم کر دیا۔ گویا قدرت کی بنائی ہوئی ایک چیز کو بیکار ڈال دیا ہے اور اس کے ساتھ اس قدر ناقدری کا برتاؤ کیا ہے کہ خود قدرت کو بھی معلوم ہوا ہوگا اب میں نہ تو دوڑتا ہوں، نہ زیادہ چلتا ہوں اور نہ ایسے کھیل کھیلتا ہوں

(باقی صفحہ ۱۴۴ پر دیکھئے)

مسلمانوں سے خطاب

حضرت علامہ مولانا ابو محمد امام الدین صاحب (رام نگری)

قطرے قطرے مل کے ہو جاتے ہیں سیلِ بے پناہ
متحد ہو کر یہ دُنیا کو دکھا سکتے ہو تم

عزم دل میں، زور بازو میں اگر پیدا کرو
دامنِ مشرق کو مغرب سے ملا سکتے ہو تم

گنبدِ گردوں میں بھی جا ایک ہلچل ڈال دے
ہو کے ہم آہنگ وہ نعرہ لگا سکتے ہو تم

جذبۂ رفعت ہو دل میں، سر میں سودا علو
بن کے انجم آسماں پر جگمگا سکتے ہو تم

یہ زمیں کیا چیز ہے یہ آسماں کیا چیز ہے
عرش کو بھی جنبش میں لا سکتے ہو تم

کس طرح تاریخ دہراتی ہے اپنے آپ کو
اس عقیدے کو بروئے کار لا سکتے ہو تم

چھا گئے تھے سارے عالم پر مسلماں کس طرح
پھر وہی نظارہ دُنیا کو دکھا سکتے ہو تم

خالدؓ و فاروقؓ کی سیرت کے گر حامل بنو
پھر خدا والوں کی اک بستی بسا سکتے ہو تم

خواجۂ طیبہ کے بن جاؤ اگر سچے غلام!!
اپنے قدموں پر جہاں بھر کو جھکا سکتے ہو تم!

— (خاص برائے الاصلاح عید نمبر)

الاصلاح بمبئی
عید نمبر
قیدی کے خالق ڈائرکٹر حسنین کا غیر فانی جواہر پارہ
فضلی برادرز لمیٹیڈ کی اولین حسین و جمیل پیشکش
معصوم
MASOOM
قیدی اسلامی کلچر اور تہذیب
کا نقشِ جمیل تھا!
گناہ معصوم اسی کا
ایک دوسرا نقشِ حسن ہے!
آسمان فلم کے درخشندہ ستارے کا جھرمٹ
مظہر خان، انیس، رمولا، مہتاب، امجد
خواجہ صابر
وغیرہ!
عنقریب
آپ کے شہر کے ہر دلعزیز سینما
میں نمائش کے لیے پیش ہو کر ضیا
پاش ہونے والا ہے!!
منظر نامہ و مکالمہ:-
سید فضل احمد کریم بی لٹ آکسن
آئی سی ایس
مستقبل قریب کے ادبی و تاریخی جواہر پارے
پردۂ "سہراب رستم"
ہمایوں - اکبر
ہدایات:- حسنین
فضلی برادران لمیٹیڈ
کنٹ ہاؤس
مشن رو ایکسٹینشن
کلکتہ
ہمارا دوسرا زیر عمل شہ پارہ:-
"چورنگی"
افسانہ و ڈائرکشن:- سبطین فضلی (قیدی کے مصنف)
اداکاران:- انیس، مہتاب، امجد، خواجہ صابر، وغیرہ
یادگار مشاعرہ اور سراج الدولہ
ہدایات: سبطین فضلی!!
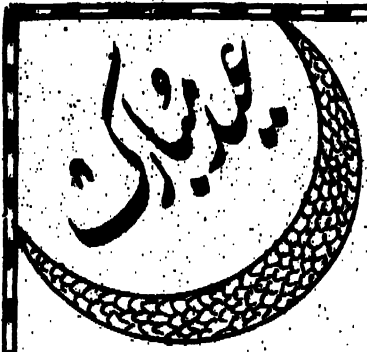
عید مبارک
اسلامی بہنوں کو خوشخبری !!
دی برائیڈل پیلس
بھلیشور تیسرا بھوئیواڑہ ، بمبئی نمبر ۲
بر مبارک و مسعود موقعوں پر ضرور تشریف لائیں !
انتہائی اور موجودہ ڈیزائنوں کی "اندوری" اور "بنارسی کناریں اور ان کے رنگ کے
مطابق کریکل اور طبع کردہ اور زری سے بھرا ہوا جارجٹ خریدنے کا بڑا مرکز
دلکش ڈیزائن کا فینسی زری کا مال مثلاً دستکاری "جھیک کب"
آری بھرت فینسی ڈیزائنوں کے سوٹ ، دوپٹے ، ساریاں نیز ہر قسم
کی فینسی کناریں ۔ جارجٹ کریکل ، طبع کردہ اور زری سے بھرا ہوا جارجٹ
کمخواب" کے علاوہ خالص چاندی کا زری کا مال خریدنے کا سالہا
سال کا قابلِ اعتماد مرکز۔
نوٹ :-
کثیر تعداد میں مال خریدنے والے بیوپاریوں کو مندرجۂ بالا ہر
مال بکفایت ارسال کیا جائے گا ۔ آزمائش کے لئے صرف ایکبار
آرڈر دیکر اپنا اطمینان کیجئے ۔

اعلیٰحضرت حضور نظام اور خان بہادر احمد علاؤالدین، او، بی، ای

خان بہادر احمد علاؤالدین او، بی، ای، ایک عرصۂ دراز سے ریاست حیدرآباد میں شہری اور فوجی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے فرقۂ اسمٰعیلیہ کے امور میں ہر ممکن امداد و اعانت اور جد وجہد کرتے رہتے ہیں آپ نہ صرف حکومتِ برطانیہ سے خطاب یافتہ ہیں بلکہ اعلیٰحضرت حضور نظام اور ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہٗ کے نزدیک بھی ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں اور ہمیشہ عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ آپ اپنے والد بزرگوار ہی کے زمانے سے سکندرآباد میں مقیم ہیں۔ آپ نے اعلیٰحضرت حضور نظام کی سلور جوبلی کے موقعہ پر باشندگانِ ریاست حیدرآباد کی جانب سے حضور نظام کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنیکا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اور آج بھی ریاست اور حکومتِ برطانیہ کے علاوہ اپنی قوم میں کافی ہر دلعزیز اور مفتخر ہیں۔

اس تصویر میں خان بہادر احمد علاؤالدین او۔ بی، ای، سپاسنامہ پیش کرنے کے بعد مؤدب ایستادہ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور حضور نظام باشندگانِ ریاست کے پیش کردہ پُرخلوص سپاسنامہ کو جشن سلور جوبلی کے عظیم الشان پنڈال میں بہ نفسِ نفیس پڑھ رہے ہیں۔ یہ تصویر اعلیٰحضرت حضور نظام کے اس جشن سلور جوبلی سے متعلق ہے جو سنہ ۱۹۳۷ء میں منائی گئی تھی !!

ISMAILI P PRESS, BOMBAY, 9.
COPY RIGHT
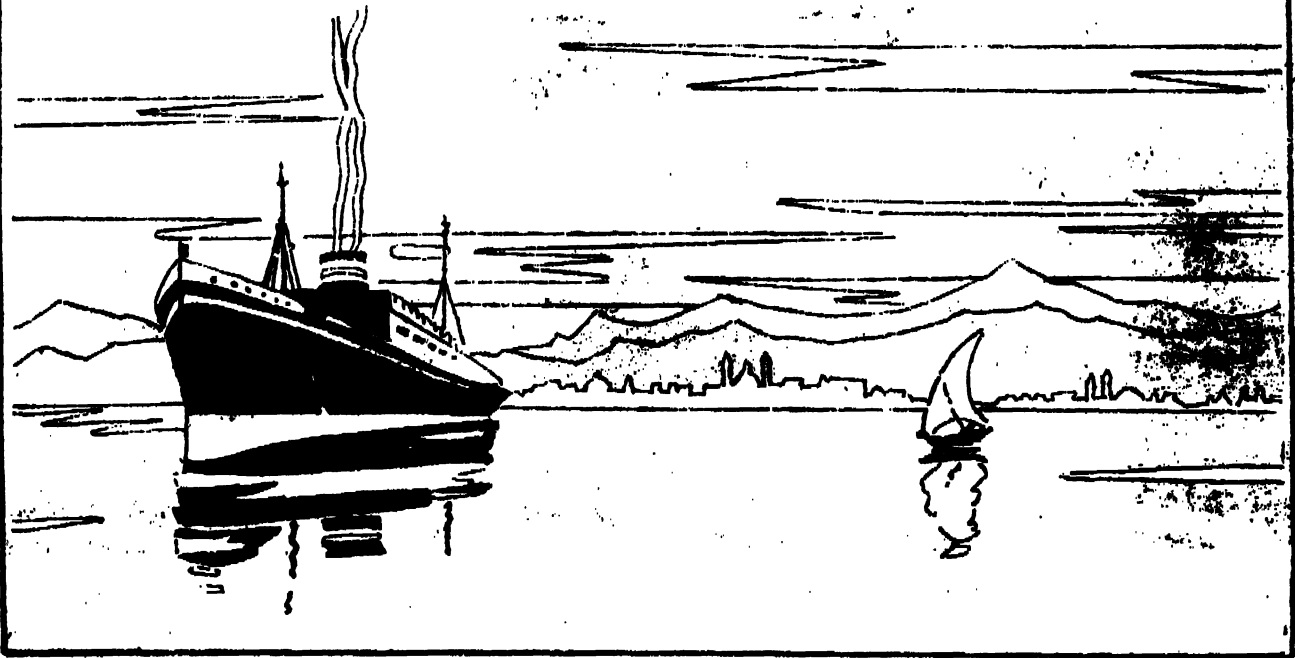
گذشتہ سال برطانوی اور ہندوستانی شاہی بحری بیڑہ اور رائل ایر فورس (شاہی فضائی بیڑہ) کی نگہداشت و اعانت کی وجہ سے حجاج کرام نے فریضۂ حج بخیر و خوبی انجام دیا۔ لہٰذا مغل لائن اس امر کے اعلان کے ساتھ کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے مشورہ اور اجازت کے تحت جہازات کی آمد و رفت کا معقول انتظام کیا گیا ہے۔ گذشتہ کی طرح تمام سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچانے کا یقین دلاتی ہے۔

موجودہ جنگ کی وجہ سے جہازات کے نام اور صحیح تاریخیں نہیں دی جا سکتیں۔ تاہم عازمین حج کو بمبئی اور کراچی سے حج کے ابتدائی سفر کے لئے ۱۰ نومبر ۱۹۴۱ء تک ان دونوں بندرگاہوں پر پہنچ جانا چاہئے۔ نیز پانچ ایک دن کی تاخیر کیلئے بھی مستعد رہنا چاہئے۔

جہازات کی اس ابتدائی روانگی کے بعد مزید جہازات ایک ایک ہفتہ کے وقفہ سے روانہ ہوتے رہینگے۔

شرح ٹکٹ عنقریب شایع کی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے لکھئے:۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی۔

TURNER MORRISON & Co., LTD. BOMBAY

رنگین ضیافت

از حضرت ماهر القادری!

وہ احباب کی بے تکلف ضیافت
بہت پرخلوص اور دلچسپ صحبت
وہ برکھا کی رُت اور پھولوں کا منظر!
مکاں کی سجاوٹ، نگاہوں کی جنت
ہر اک بات میں خوبصورت سلیقہ!
ہر اک چیز میں سادگی کی رعایت
یہی چار چیزیں تھیں واں کار فرما
نفاست، نزاکت، مسرت، محبت
تواضع میں ڈوبی ہوئی میزبانی
مدارات کا سلسلہ بے نہایت
مسرت اثر وسعتیں حوصلہ کی
وہ الوانِ نعمت۔ وہ کھانوں کی کثرت
وہ خوش انتظامی کہ ہر چیز حاضر،
ذرا اک اشارے کی تھی بس ضرورت
مجھی سے تخاطب کا اقدام پیہم،
وہ سب دوستوں کی مجھی پر عنایت
وہ باتوں ہی باتوں میں دل کے فسانے
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں رمز و اشارت

زہے دوستی! بزم میں میری خاطر!
بلائی گئی اک مجسم قیامت

وہ ظالم ادائیں وہ کافر جوانی
وہ آنکھیں کہ جام مئے ارغوانی
لبوں پر شایاں تبسم کی موجیں
وہ گلدستۂ عشرت و شادمانی
وہ آواز کا لوچ وہ نرم لہجہ
وہ دلچسپ فقرے وہ شیریں بیانی
وہ شوخی جو کردار کا راز کہدے!
اُسی کی حکایت اُسی کی زبانی

وہ نغموں کی بارش وہ جلوؤں کی یورش
اور اس پہ وہ برسات کی رُت سُہانی

وہ آنکھوں کے ڈورے شرابی شرابی،
وہ ہونٹوں کی رنگت گلابی، گلابی،
وہ رخسار کی دلفریبی کا عالم
کبھی ماہتابی، کبھی آفتابی
وہ رہ رہ کے انداز انگڑائیوں کے
وہ آنکھوں میں اک موجۂ نیم خوابی

وہ حسن و محبت کا رنگین دھوکا!
کبھی شرم طاری، کبھی بے حجابی

نزاکت کے لئے وہ منظم اشارے
ہرن کی طرح تیلیوں کے طرارے
وہ بدست بننے کی دلچسپ کوشش
وہ انگڑائیاں شوخیوں کے سہارے
وہ شفاف دنداں کہ سلک لآلی
وہ سچ مچ دمکتے چمکتے ستارے

بہ ہر طرز جادو، بہ ہر غمزہ محشر
بہ ہر خندۂ روح افزا بہارے

وہ ہر شعر پہ سوچ کر...... مسکرانا!
وہ میری غزل اُس کا رک رک کے گانا
وہ مہندی میں ڈوبی ہوئیں انگلیوں سے
ذرا جھوم کر اس کا چٹکی بجانا
وہ دام ہوس کے بڑے نرم حلقے
مسلسل وہ آنکھوں سے آنکھیں ملانا
وہ ہشیار انداز غارتگری کے
کبھی مسکرانا، کبھی جھینپ جانا
گلوبند کے موتیوں کی نمائش
کبھی ہاتھ کی چوڑیوں کو دکھانا

کبھی بے رخی اور کبھی خود ہی کہنا
ہمارے یہاں بھی کسی روز...... آنا

عجب پاک فطرت گنہگاریاں...... تھیں
کہ بے شیشہ و جام سرشاریاں تھیں
بہ ہر ناز و شوخی ستمگاریاں تھیں
بہ ہر شعر و نغمہ اداکاریاں...... تھیں
مرے دل کا اس وقت عالم عجب تھا
نہ بے ہوشیاں تھیں نہ ہشیاریاں تھیں
نگاہیں بھی مجرم، تخیل بھی...... ملزم
خطاکوشیاں تھیں، ہوسکاریاں تھیں

میں اس وقت اس راہ میں تھا جہاں پر
نہ مجبوریاں تھیں نہ مختاریاں تھیں

تصور ہی اس وقت کام آرہا ہے
کہ جیسے کوئی ٹھوکریاں کھا رہا ہے
بہ ایں عقل و دانش، بہ ایں قید و بندش
کوئی تجھ کو کھینچے لئے جا رہا ہے

جو دیکھا گیا رات کو جاگتے میں!
وہی خواب اب تک نظر آرہا ہے

ضروری التماس: قبل اس کے کہ "ایطاء" کے متعلق اپنے حقیر خیالات کا اظہار کروں یہ ظاہر کر دینا مناسب ہوگا کہ اس اظہار کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟۔

سرزمینِ بمبئی جہاں ضروریاتِ زندگی کے دیگر شعبوں میں پیش پیش ہے وہاں شاعر خیزی کے اعتبار سے بھی بہ نسبت دیگر بلادِ ہند کے سب سے آگے ہے۔ شاید یہ غلط نہ ہو کہ اگر کسی مشاعرے کی شرکت پہ "صلائے عام ہو یارانِ نکتہ داں کے لئے" اور یہ نکتہ داں بزرگ ایک ایک کر کے بہ آوازِ لبیک اس طرف توجہ فرما دیں تو مشاعرہ شبانہ روز کی مسلسل نشستوں کے بعد بھی کم از کم ایک ہفتہ تک تو ختم ہونے کا نام نہ لے۔

اس بزرگوار جماعت کی یہ خصوصیت قابلِ رشک ہے کہ اس کے افراد جب ایک دوسرے سے باہم ملاقی ہوتے ہیں تو معدودے چند نفوس کے سوا عموماً ان کے تبادلۂ خیالات کا آغاز فنِ شاعری کے نام سے ہوتا ہے جس میں بالخصوص پالے دے کر ایطاء ہی کا موضوع زیرِ بحث رہا کرتا ہے۔

اگرچہ ایطاء کے باب میں ان حضرات کے درمیان اتفاقِ رائے کی نوبت حسنِ اتفاق ہی سے آتی ہو تاہم ان میں کا ہر بزرگوار اپنی اپنی جگہ پر بخیالِ خویش اصابتِ رائے کا حامل ضرور نظر آتا ہے۔

مجھے خود ایطاء کے باب میں جن جن طرفہ حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے ان کی چند مثالیں بہ طورِ نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

(۱) اب سے دس بارہ سال پہلے بمبئی کے ایک مشاعرے میں حضرت آحمر ترمذی مرحوم اپنی غیر طرحی غزل ارشاد فرما رہے تھے۔ اس غزل کا اصل مطلع تو مجھے اس وقت یاد نہیں آتا البتہ اس کے قافیے یاد ہیں جو "انسان" اور "احسان" تھے۔

آحمر مرحوم چونکہ کہنہ مشق و خوش گو اور رنگِ جدید کے شائق ہونے کے علاوہ ایک کافی حد تک ماہرِ فن بھی تھے اور ان کا مطلع بھی نسبتاً زوردار تھا اس لئے دیگر حضرات کے علاوہ میں نے بھی محظوظ ہو کر اس مطلع کی خاطر خواہ داد دی۔

مشاعرے کے تیسرے ہی دن ایک پوسٹ کارڈ بایں مضمون مجھے موصول ہوا:۔

"واہ حضرت دیکھ لیا۔ قابلیتِ عالم بالا معلوم شد۔ باوجود اس کے کہ آحمر صاحب کے مطلع میں احسان اور انسان کے قافیوں میں دونوں جگہ سان۔ سان کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مگر آپ ہر مشاعرہ اس مطلع کی تعریف میں رطب اللسان تھے کہیے آپ کی ایطاء فہمی کہاں گئی ؟"

چونکہ مرسل صاحب نے اپنا نام اور پتہ تحریر نہیں کیا تھا اس لئے جواب دینے سے قاصر رہا۔

(۲) بمبئی کے ایک اردو روزنامے کے مدیرِ گرامی ہیں جو بہ سبیلِ صدارتِ مشاعرہ تیسرے چوتھے سال شاعری پر بھی کرم فرما دیتے ہیں ان کے بارے میں اخباری کالم اس امر کے شاہد نظر آتے ہیں کہ وہ مطلع چھوڑ کر شعر میں ایطاء تلاش کرتے ہیں۔ اور اب ایک مقامی جریدے میں تو موصوف کے متعلق یہاں تک تازہ انکشاف سے کام لیا گیا ہے کہ وہ شعر میں نہیں بلکہ صرف مقطع میں ایطاء کو معیوب سمجھتے ہیں۔

(۳) بمبئی میں ایک بزرگوار ہیں۔ جو چشمِ بد دور درجنوں تلامذہ کے اوستادِ گرامی بھی ہیں انھوں نے ایک مقامی اخبار میں اپنے ایک معتقد کے نام سے راقم الحروف کے اس مطلع میں ایطاء کا عیب وارد فرمایا تھا ؎

زیارت کرنے آتا ہے جنوں گورِ غریباں کی
لپیٹ ہی کفن میں کیا کوئی دھجی گریباں کی،

(یعنی گریباں۔ اور غریباں میں۔ دونوں جگہ یاں ہونے کے اعتبار سے)

(۴) ۱۲ اگست ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے جبکہ میں ایک اخبار فروش کی دکان سے گزر رہا تھا دیکھا کہ چند شعرائے کرام اخبار ہندوستان بمبئی مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۵۲ء میں شائع ہونے والی ایک نظم سے متعلق فٹ نوٹ پر بحث فرما رہے ہیں وہ فٹ نوٹ یہ تھا:۔

"ایطائے خفی و جلی کی بحث سے یہ نظم قصداً آزاد کر دی گئی ہے جذبات کی رو میں ایسی تعینات سے اکثر صرفِ نظر کرنا پڑتا ہے۔ اساتذۂ ادب اس جسارت کو بہ نظرِ عفو ملاحظہ فرمائیں"

اسی سلسلے میں نفسِ ایطاء کے متعلق ان حضرات میں گفت و شنید کی نوبت آ گئی۔ چونکہ (غالباً بمبئی کی رسم کے مطابق) یہاں بھی مطلع سے قطع نظر کرتے ہوئے شعروں میں ایطاء کا عیب ظاہر کیا جا رہا تھا۔ اس لئے میرے منہ سے نکل گیا "بھائی ایطاء شعر میں نہیں ہوتا بلکہ مطلع میں ہوتا ہے" جس کے بعد ان میں سے ایک صاحب اس قول کو ایک عجیب و غریب انکشاف پر محمول سمجھتے ہوئے گویا ہوئے کہ "جناب ہم تو آج تک شعروں میں ایطاء جانتے تھے یہ مطلع میں ایطاء آپ ہی کی زبان سے سن رہے ہیں۔ اس کے بعد شعرائے کرام کی باہمی بے محل گفتگو اور دخل در معقولات کی وجہ سے بحث قریب قریب ناگوار صورت اختیار کر گئی بارے خدا خدا کر کے میرے مخاطب صاحب نے اپنے مطمئن ہونے کی یہ صورت بیان

فرمائی کہ "بحر الفصاحت" میں دکھا دیا جائے۔ حسنِ اتفاق سے علاوہ دیگر کتبِ عروض و قافیہ کے بحر الفصاحت بھی میرے یہاں موجود تھی اس لئے سب کے سب حضرات بغرض ملاحظہ بحر الفصاحت غریب خانے پر رونق افروز ہوئے۔ بحر الفصاحت دیکھی گئی۔ مطلع اور ایطا کا تعلق راس آیا جس کے بعد یہ مختصر سی صحبت دیگر دلچسپ گفتگو کے بعد دوستانہ طریقہ پر برخاست ہوئی۔

لیکن ایطا کے مطلع سے وابستہ ہونے کے بعد بھی میں یہ معلوم کرنے سے قاصر ہی رہا کہ ایطا کا اصل مفہوم ان احباب کے ذہنوں میں کس حیثیت سے محفوظ ہے۔ لہٰذا صرف یہ اور اسی قسم کے دیگر تجربات و مشاہدات ایطا کے متعلق اظہارِ خیال کے محرک ہوئے ہیں۔ نہ کہ زعمِ ہمہ دانی۔ شباب۔

عیوبِ قافیہ:۔ قافیے کی تعریف کے خلاف جو صورتیں قافیے میں واقع ہوں وہ عیوبِ قافیہ[1] میں داخل ہیں۔ منجملہ ان کے قافیے کے ایک عیب کا نام "ایطا" بھی ہے۔

ایطا کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ایطائے جلی (۲) ایطائے خفی

چونکہ قافیے کی تعریف خود دو جزو پر مشتمل ہے۔ یعنی:۔

ا۔ قافیہ ان حروف[2] و حرکات[3] معینہ کا نام ہے جو مطلع کے دونوں مصرعوں یا مطلع کے علاوہ اشعار کے مصرعہائے ثانی کے اخیر[4] یا حکمِ اخیر[5] میں آئیں۔

ب۔ مطلع کے دونوں مصرعوں میں آنے والے قافیے باہم:۔

یا تو مختلف اللفظ و مختلف المعنی ہوں۔ جیسے ؎

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم ... کا

یہاں رقم اور قلم بہ اعتبارِ تلفظ بھی مختلف ہیں اور بہ اعتبارِ معنی بھی مختلف ہیں۔

یا متحد اللفظ و مختلف المعنی ہوں۔ جیسے ؎

اقربا کیوں رو رہے ہیں مجھ کو بے سر دیکھ کر
میں تو خوش ہوں زندگی کا مرحلہ سر دیکھ کر

یہاں تلفظ کے اعتبار سے دونوں جگہ سر اور سر ایک ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے مختلف ہیں یا مختلف اللفظ و متحد المعنی ہوں جیسے ؎

حقیقت میں زبان اُس کی زباں ہے
جو تیرے ذکر میں رطب اللساں ہے

یہاں زباں اور لساں تلفظ کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن معناً ایک ہیں۔

لہٰذا تعریفِ قافیہ کی دونوں حالتوں میں اختلاف نہ ہونے کی وجہ سے ایطائے جلی دو صورتوں میں واقع ہوگا۔ یعنی:۔

(۱) قافیہ میں اختلافِ روی کے ساتھ جب حروفِ اضافی یا اجزائے ترکیبی ایک ہی معنی پر دلالت کریں۔

(۲) جب قافیہ مختلف اللفظ و مختلف المعنی یا متحد اللفظ و مختلف المعنی یا مختلف اللفظ و متحد المعنی ہونے کے علاوہ متحد اللفظ بھی ہو اور متحد المعنی بھی ہو۔

ایطائے جلی باعتبار اختلافِ روی

مثال ؎

ہمیشہ اُسے ان خیالوں سے کام
غرض منتوں سے مرادوں سے کام

یہاں خیالوں اور مرادوں دونوں جگہ اضافی قافیے ہیں۔ جن کے زائد حروف واؤ اور نون علامتِ جمع کی حیثیت سے ہیں لہٰذا جب ان کو دونوں جگہ سے علیحدہ کیا جائے گا تو اصل لفظ خیال اور مراد باقی رہ جائیں گے۔ جو بہ اعتبار اختلافِ حرفِ روی باہم قافیہ بننے کی صلاحیت پیدا نہ کرسکیں گے کیونکہ مرکب قافیوں میں حرفِ روی کی شناخت یہ ہے کہ اس حرف تک پہونچنے کے بعد (الا قافیۂ معمولہ کے) لفظ با معنی ہوجائے یا بہ الفاظِ دیگر حروفِ اضافی یا اجزائے ترکیبی کو جدا کرنے کے بعد لفظ کا جو آخری حرف ہو وہ روی ہوگا۔

مثلاً خیالوں اور مرادوں میں خیال کے لام تک پہونچ کر اور مراد کے دال تک پہونچ کر دونوں جگہ لفظ با معنی ہوگئے یا خیالوں اور مرادوں میں سے علامتِ جمع واؤ اور نون کو جب علیحدہ کیا تو خیال اور مراد باقی رہ گئے یعنی خیال کا آخری حرف لام رہا اور مراد کا آخری لفظ دال رہا جن کو اپنی اپنی جگہ روی کا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔ لیکن حرفِ روی مستقل ہوتا ہے اور وہ بدلا نہیں جا سکتا۔ اس لئے اختلافِ روی کی وجہ سے قافیے میں بدترین عیب پیدا ہوگیا۔ اسی عیب کا نام "ایطائے جلی" ہے۔

اسی طرح دہلوی و لکھنوی کی یائے نسبتی۔ تیزی اور مرغی وغیرہ کی یائے تانیثی۔ مردک، ساحرک کنیزک کا کاف علامتِ تحقیر۔ صندوقچہ اور باغچہ کا چہ علامتِ تصغیر وغیرہ یعنی دہلوی اور لکھنوی سے یائے نسبتی دور کرنے کے بعد دہلی اور لکھنؤ باقی رہیں گے۔ جن کا یا اور واؤ میں اختلافِ روی کے بعد ایطا کا عیب پیدا ہوجائے گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

اسی طرح فتنہ گر اور بیدادگر یا پری پیکر اور حور پیکر یا خوش نما اور بدنما میں سے اُن کے ہم معنی اجزائے ترکیبی گر۔ پیکر۔ نما۔ کو الگ کرنے کے بعد فتنہ اور بیداد۔ پری اور حور۔ خوش اور بد۔ ہم قافیہ نہیں ہوسکتے لہٰذا ایسے قافیوں کے استعمال میں بھی بہ سبب اختلافِ روی ایطا کا عیب واقع ہو جائے گا۔

(۲) ایطائے جلی باعتبار تلفظ و معنی

جب قافیہ مختلف اللفظ و مختلف المعنی یا مختلف اللفظ و متحد المعنی یا متحد اللفظ و مختلف المعنی ہونے کے علاوہ متحد اللفظ بھی ہو اور متحد المعنی بھی ہو تو تعریفِ قافیہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس میں ایطائے جلی کا عیب مانا جائیگا۔ مثلاً

پروا نہیں مجھکو جو دنیا نظر آئے،
مرتا ہوں میں اس پر کہ مجھے تو نظر آئے

اس مثال میں دونوں جگہ نظر کا قافیہ ایک ہی تلفظ اور ایک ہی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں ایطائے جلی کا عیب پیدا ہوگیا۔ مگر یہ ایک ایسی مبتدیانہ غلطی ہے جس کا امکان بہت کم نظر آتا ہے۔

---

[1] عیوبِ قافیہ:۔ سناد۔ اقوا۔ اکفا۔ ایطا۔ شائگان۔ غلو۔ تحریفِ روی وغیرہ
[2] حروفِ قافیہ:۔ تاسیس۔ دخیل۔ ردف۔ قید۔ روی۔ وصل۔ خروج۔ مزید۔ نائرہ۔
[3] حرکاتِ قافیہ:۔ توجیہ۔ مجرا۔ رس۔ اشباع۔ حذو۔ نفاذ
[4] اخیر: جبکہ قافیے کے بعد ردیف نہ ہو۔
[5] جب قافیے کے بعد ردیف بھی ہو۔

ایطائے مستثنیٰ رہنے والے قوافی

(۱) مفرد قوافی مثلاً انساں و احساں یا فریاد و صیاد وغیرہ جو بزنگ انساں و احساں یا صیاد و فریاد کے قافیوں میں ساں یا یاد دونوں جگہ دیکھ کر ایطا کا عیب وارد کر دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اس لئے کہ انساں اور احساں میں دونوں جگہ نون حرف روی ہے اور صیاد و فریاد میں دال دونوں جگہ حرف روی ہے جو اپنی اپنی جگہ صحت کے ساتھ قائم ہے اور ایطا چونکہ اختلافِ روی کا نام ہے اس لئے یہاں ایطا کا احتمال بھی غلط ہے۔

(۲) اگر مطلع میں ایک قافیہ مفرد ہے اور ایک معمول مثلاً شیدا نہ کر۔ رسوا نہ کر۔ وغیرہ میں کہ شیدا اور رسوا قافیہ ہے اور نہ کر ردیف اگر یہاں نہ کر استعمال کیا جائے تو بھی اس پر ایطا کا اطلاق نہ ہوگا۔

(۳) اگر قافیئے میں حروفِ اضافی یا اجزائے ترکیبی باہم مختلف المعنی ہوں جب بھی ایطا کا اطلاق نہ ہوگا۔ مثلاً ؎

وہاں ہو یا یہاں انساں ہر حالت پہ نازاں ہے
اُدھر جنّت کی حوریں ہیں اِدھر بزمِ حسیناں ہے

اس مطلع میں مصرعۂ اول کا الف و نون جو نازاں میں شامل ہے علامتِ فاعلی ہے اور دوسرے مصرعہ کا الف و نون جو حسیناں میں شامل ہے علامتِ جمع ہے۔

(۴) یا قافیہ دونوں مصرعوں میں جو ترکیبی حیثیت سے بامعنی ہو۔ مگر معنی مختلف ہوں مثلاً ؎

سرو قامت ہے یاسمن بر ہے
دل کا دشمن ہر ایک دلبر ہے

(۵) یا قافیہ مطلع کے ایک مصرعے میں بامعنی لفظ کی حیثیت سے ہو اور دوسرے مصرعے میں لفظ بامعنی کا جزو مہمل ہو مثلاً ؎

فصلِ گل آتے ہی کیا خوفِ خزاں دل میں نہیں
شورِ فریاد و فغاں اب کیوں عنادل میں نہیں

ایطا کی دوسری قسم ایطائے خفی بیان کی جاتی ہے جس کی تعریف یہ ہے۔
ایطائے خفی وہ ہے کہ جس میں حروف قافیہ کی تکرار ظاہر نہ ہو۔ مثلاً دانا و بینا آب و گلاب وغیرہ۔

اس تعریف کو دیکھ کر پہلی گزارش تو یہ ہے کہ ایطائے خفی کو پردۂ خفا ہی میں رہنے دیا جائے۔ کیونکہ جب تکرار ہی ظاہر نہ ہو تو اس پر بحث بھی فضول ہے اور اگر نگاہ ہوں کی دوررسی کے بعد وہ تکرار ظاہر ہو گئی تو محالہ اُسے ایطائے جلی کی بحث میں آنا پڑے گا۔ دوسرے اس کے متعلق جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ خود اپنی جگہ پہ ایطائے خفی سے دور جا پڑتی ہیں مثلاً آب و گلاب اگر یہ دونوں لفظ پانی یا عرق ہی کے معنوں میں مستعمل ہوں تو ایطائے جلی صاف ہے اور اگر پانی اور گلاب کے پھول کے معنوں میں مستعمل ہوں تو مختلف المعنی ہونے کے بعد ان کا ایطائے جلی تک سے تعلق نہیں [illegible] ایطائے خفی!

[illegible] اگر دانا اور بینا میں سے دونوں جگہ معنی واحد پہ تکرار کرنے والے حروف یعنی الف فاعلیہ [illegible] دیا جائے گا۔ تو دان اور بین میں اختلافِ روی کے بعد صریحاً ایطائے جلی ہوگی۔ بہرحال ایطائے خفی کے وجود کو عنقا سے کم اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔

اور اگر ایطا میں خفی و جلی کی قسموں کو برقرار ہی رکھنا مقصود ہے تو زیادہ سے زیادہ اختلافِ روی والے ایطا کو جلی مان لیجئے اور متحد اللفظ و متحد المعنی والے ایطا کو خفی قرار دے لیجئے۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔

بقیہ قدرت کی چوک!

جن میں ٹانگوں کو استعمال کرنا پڑے۔ البتہ میں اکثر شام کو اسکول چلا جاتا ہوں۔ لڑکے فٹ بال اور ہاکی وغیرہ کھیلتے ہوتے ہیں اور میں دیکھ کر اپنی ٹانگوں کو دکھاتا ہوں اور تڑپاتا ہوں اور اس طرح قدرت سے بدلہ لیتا ہوں اور خود یہ محسوس کر کے لطف اندوز ہوتا ہوں کہ اس وقت میں نے قدرت کو شکستِ فاش دیدی اور یہ کہ یقیناً قدرت کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور پچھتا رہی ہوگی۔

آپ میرے اس انوکھے طریقۂ انتقام کو پسند کریں یا نہ کریں۔ آپ کی سمجھ میں یہ استدلال آئے یا نہ آئے مگر خود مجھکو تو اس سے پورا سکون کیا بلکہ ایک غیر معمولی لطف و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب مجھکو کسی کے چڑھانے یا ہنسنے کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی اور جب بھی تو میں ان کے ساتھ شریک ہو کر قدرت کی اس چوک کا مضحکہ اڑا لیتا ہوں اور آئندہ کے لئے بھی میں نے کچھ اسی قسم کی باتیں سوچ رکھی ہیں جو سراسر جذبۂ انتقام پر دلالت کرتی ہیں۔ یعنی میں نے اپنے مذاق ہی کو تبدیل کر لیا ہے میں دوڑ دھوپ کے کھیلوں کے بجائے تاش شطرنج وغیرہ میں اپنا فرصت کا وقت گزارتا اور ان سے پوری دلچسپی حاصل کر لیتا ہوں۔ اور آئندہ بھی یہی ارادہ ہے کہ زیادہ وقت میرا کتب بینی میں صرف ہوا کرے گا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر دلچسپ کوئی مشغلہ نہیں۔ رہا کام اور روزی کمانا۔ سو میں نے طے کر لیا ہے کہ میں ایسا کام ہرگز نہ کروں گا جس میں مجھکو ٹانگوں کا مرہونِ منت ہونا پڑے۔ میں دراصل ان سے بہت کم واسطہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں اور اپنے مشاغلِ معاش کا بھی اسی کو ذریعہ بناؤں۔

نوٹ:۔ آخر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں قارئین کرام کو یہ بتا دوں کہ یہ مضمون ایک خالص نفسیاتی مضمون ہے جس میں ایک لنگڑے یا کسی اور ایسے ہی نقص رکھنے والے کی نفسیات کی تحلیل کی گئی ہے اس کو اعتقادیات سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ نعوذ باللہ میں قدرت کی اہانت کی جرأت کر سکتا ہوں۔

قطعہ!

ہیں میرے جسقدر احباب و ہمدم ؛ مری کم التفاتی سے ہیں برہم
مگر خلق و وفا لاؤں کہاں سے ؛ کہ ہوں میں زر پرستوں کا "معزّم"

(یکتا)

باسی ہار

از حضرت
رعنا
اکبرآبادی

خاص الاصلاح
عید نمبر کیلئے

صبح نے روشن کیا جب حسنِ زیبائے بہار
نونہالانِ چمن اٹھلائے شاخیں ہل گئیں
آنکھ جھپکی تھی کہ سارے بوستاں میں پھول تھے
مستعد سب قوتیں سارا چمن بیدار تھا
قدر و قیمت بڑھ گئی، جانِ لطافت بن گیا
کردیا اور اک اضافہ دولتِ انداز میں
نیند کو اک اور کیفِ بیخودی دیتا رہا
رات یوں گذری، سحر کی داستاں ہی اور تھی
پھول ہیں سب حسن کی تابش سے کمہلائے ہوئے
چھن گئی وہ دولتِ دیدار سب لوٹی ہوئی،
بالش و بستر پہ یوں بکھرے ہوئے ہیں بیشتر
حسن کی رنگیں شبستاں کی فضا میں کھو گئے

فکرِ گلچینی میں اٹھا کارفرمائے بہار!
لی نسیمِ صبح نے اک سانس کلیاں کھل گئیں
ہاتھ بڑھنا تھا کہ دستِ باغباں میں پھول تھے
فصلِ گل کا ماحصل اُن کے گلے کا ہار تھا
شام ہونے ہوتے اس گردن کی زینت بن گیا
بے تکلف شب گذاری خوابگاہِ ناز میں،
رات بھر سینہ پہ مچلا کروٹیں لیتا رہا
چشمِ عبرت نے جو دیکھا وہ سماں ہی اور ہے
کچھ گلے میں ہیں تو کچھ بستر پہ مرجھائے ہوئے
رنگ وہ اڑتا ہوا وہ پتیاں ٹوٹی ہوئی
جیسے پروانوں کی لاشیں منزلِ فانوس پر
رات کے جاگے ہوئے تھے صبح ہوتے سو گئے

روح بھرتے ہیں یہی گل میرے قلبِ زار میں
اب بھی اتنی زندگی ہے، اُن کے باسی ہار میں

مقتل خبیب

ایک حمیت نواز تاریخی افسانہ

چاشت کا وقت ہے، آفتاب کی تمازت سے حجاز کا ریتلا صحرا بھڑ بھونجے کی بھٹی بنا ہوا ہے اس تپتی اور جھلساتی ہوئی زمین پہ مدینہ منورہ کے چند لوگ جو تعداد میں دس ہیں کسی خاص مہم پہ چلے جا رہے ہیں۔ ان کی رفتار و حرکات سے پایا جاتا تھا کہ کسی شئے کی تجسس میں ہیں۔ اس گروہ کے سردار کا نام عاصم بن ثابت ہے جسکو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۳ھ میں بہم رجیع کے موقع پر قریش کی سراغرسانی کے لئے روانہ فرمایا تھا (رجیع مکہ اور عسفان کے درمیان ایک کوئیں کا نام ہے) یہ جان فروش فرقہ ہے جو خوف و خطر اطمینان کے ساتھ بادیہ پیما ہے، جن کے دلوں میں نور ایمان کا فیضان ہے جس نور کو دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی، ان میں کا ہر فرد عزم بالجزم کیا ہوا ہے کہ رسول اللہ کی فرمانبرداری میں اپنی جانِ عزیز فدا کر دینے میں دریغ نہ کریگا۔ اس لق و دق صحرا میں اُن کا نڈر چلا جانا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو وہ تعداد میں تھوڑے ہیں دوم وضع قطع اپنے ہمجنس کے مشابہ ہے۔ جن پر کسی قسم کا شبہ عائد نہیں ہوسکتا۔

اثنائے راہ میں جب یہ گروہ "الھداۃ" (رجیع کے قریب عسفان سے سات میل کے فاصلے پر) پہنچا تو اتفاقاً انہیں ایک قریشی نے دیکھ لیا اور بنی لحیان کے کانوں میں آکر یہ خبر کردی کہ میں نے محمدؐ کے چند ساتھیوں کو اس طرف سے گزرتے دیکھا ہے۔ نہ معلوم کہاں اور کس غرض سے جا رہے ہیں۔

اس خبر کے سنتے ہی بنی لحیان میں ان کی جانب سے شکوک پیدا ہوگئے خاموش ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں شر کا ارادہ قایم کرکے تیر اور کمان، نیزے اور تلوار سے ہتھیار بند ہو کر مسلمانوں کے تعاقب میں روانہ ہوگئے جو تعداد میں تقریباً سو تھے، جن میں آدھے سے زیادہ تیرانداز تھے۔ عاصم اور اس کے ساتھیوں نے دور سے جو غبار اٹھتا دیکھا تو انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ دشمن تعاقب میں آ رہے ہیں۔ چنانچہ نجات کی فکر میں چند لحظے رک گئے۔ مگر عاصم نے کہا۔

"بھائیو! یہ وقت رکنے اور سوچنے کا نہیں ہے، چلو جلدی سے ہم اس سامنے کے ٹیلے کے پیچھے پناہ لے لیں۔ قبل اس کے کہ دشمنوں کے تیروں کا نشانہ بن جائیں۔

سردار کا حکم پاتے ہی سب بعجلت ٹیلے پر چڑھ کر اس کی آڑ لے لی اور قضا و قدر کے ارادے کے منتظر ہوئے۔

چند لمحے گزرنے نہ پائے تھے کہ تیرانداز دشمنوں نے ٹیلے کو اس طرح گھیر لیا جیسے کنگن کلائی کے گرد حلقہ بند رہتا ہے۔ اور مسلمانوں کو بھیڑیوں کے مانند گھورنے لگے۔ مسلمانوں نے بھی بکشادہ پیشانی موت کے استقبال کا تہیہ کرلیا۔ اور بہ اطمینان و شوق اس جنت میں داخل ہونے کے لئے تیار ہوگئے جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہے جہاں نعیم ابدی اور سعادتِ سرمدی حاصل ہونے والی ہے۔

کفار میں سے ایک شخص نے بہ آواز بلند کہا:-

"ٹیلے سے اتر آؤ۔ اور تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ ہمیں دیکر خود کو ہمارے سپرد کردو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کریں گے"

مسلمانوں نے یہ سُنا۔ اور پھر ایک بار جواب کے لئے رک گئے اور سوچنے لگے کہ کیا مشرک اپنے قول کے سچے ہوا کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی وعدہ وفا کیا ہے۔ کیا مسلمان ان کے وعدوں پہ بھروسہ کر سکتے ہیں؟ اس قسم کے سوالات پئے درپئے ان کے دلوں میں اس خطرناک گھڑی میں پیدا ہونے لگے جس گھڑی میں ان کی زندگی کا خاتمہ یقینی تھا۔

سبھوں کی نگاہیں سردار کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں کیا جواب دیتے ہیں۔

عاصم "قسم اللہ کی میں ہرگز خود کو مشرکوں کے حوالے نہ کروں گا۔ الٰہی! تو اپنے نبی کو ہماری گرفتاری کی خبر کردے"

مشرک بھی چند لمحے اپنے اعلان کا اثر مسلمانوں کے دلوں پہ دیکھنے کی غرض سے رُکے رہے۔ مگر جب دیکھا کہ وہ ماننے والے نہیں ہیں، تو دفعتاً تیروں کی بارش ان پر برسا دی۔ جن سے عاصم اور اس کے سات ساتھی اللہ کی راہ میں شہید ہوگئے۔ ان کی پاک روحیں خلد بریں کی جانب پرواز کرگئیں۔ جہاں انہیں ابدی زندگی حاصل ہونے والی ہے۔ ٹیلے پہ صرف دو مسلمان زندہ رہ گئے۔ جن کی قسمت میں اس وقت شرفِ شہادت حاصل ہونا نہ تھا۔ ان دونوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ ہم اس تجربے میں اپنے کو قربان کر دیں اور دیکھیں کہ مشرک قول کے سچے ہوتے ہیں یا جھوٹے۔ تاکہ آئندہ مسلمانوں کیلئے سبق ہو جائے کہ مشرک ہرگز قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اب چونکہ ہم موت کے گھاٹ پر ہیں چلو یہ تجربہ بھی حاصل کریں۔ چنانچہ اس ارادے سے ٹیلے پر سے اتر آئے اور مشرکوں کے عہد و پیمان کی بنا پر خود کو ان کے حوالے کر دیا۔ دشمنوں نے مسلمانوں کو جب اپنے قبضے میں پایا تو فوراً کمانوں کی تانتیں نکال کر انہیں باندھنے کے لئے آگے بڑھے۔ ایک مسلمان نے بگڑ کر کہا:-

"یہ پہلی غداری ہے۔ قسم اللہ کی میں اس ذلت کو ہرگز قبول نہ کروں گا بہتر

ہے کہ میں بھی اپنے شہید بھائیوں کا ساتھ دوں۔ مجھے ان کا اسیر ہونا منظور نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی کافروں نے اسے بھی شہید کر دیا۔ اب فقط خبیب بن عدی باقی رہ گیا۔ اس نے بھی مصمم ارادہ کر لیا کہ دیکھوں مشرک اپنے عہد و پیمان پر کہاں تک قائم رہتے ہیں۔

:(۲):

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

(اقبال)

" اری ماویہ! یہ تیرے یہاں کون ٹھہرا ہوا ہے؟ (ماویہ، حجیر بن ابی اہاب کی کنیز ہے جو بعد میں مسلمان ہو گئی)

ماویہ:۔ یہ ایک قیدی ہے۔ دیکھتی نہیں اس کے پیروں میں بیڑیاں جوڑی ہوئی ہیں،

" اس کا نام کیا ہے؟"

ماویہ:۔ خبیب بن عدی الانصاری۔

" مگر یہ تیرے یہاں کیوں لایا گیا؟

ماویہ:۔ ہمارے گاؤں کے مردوں نے چند مشتبہ آدمیوں پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیا۔ یہ ایک زندہ بچ گیا تھا اسے الحارث بن عامر کی اولاد گرفتار کر لائی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قیدی نے جنگ بدر میں الحارث کو قتل کیا تھا۔ اب اسے میرے یہاں اس لئے قید رکھا ہے کہ اشہر الحرام (حج کے مہینے) ختم ہونے کے بعد اس سے قصاص لیا جائے گا۔

" تو نے اس کے عادات و اطوار کیسے پائے؟

ماویہ:۔ بہن! میں یقینی طور پر کہتی ہوں کہ نہایت شریف و نیک نہاد شخص ہے کبھی اسے جھوٹ بولتے اور فحش بکتے نہیں سنا۔ ہمیشہ میرے ساتھ نہایت لطافت و خوش اخلاقی برتتا ہے۔ دن میں یا رات میں جب اسے دیکھوں تو اٹھتا بیٹھتا اور سجدے کیا کرتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو یہ کیا کرتا ہے تو کہا کہ " میں اللہ کی عبادت میں نماز پڑھتا ہوں" راتوں کی نمازوں میں خوش الحانی سے کچھ پڑھتا ہے جسے وہ قرآن کہتا ہے اس پڑھائی سے میں اور اڑوس پڑوس کی عورتیں بے حد متاثر ہوتی ہیں۔ اکثر میرے یہاں آ کر جمع ہو جاتی ہیں اور اس کا قرآن سن کر رو یا کرتی ہیں۔ جب کبھی میں اس سے پوچھوں " تجھے کسی چیز کی ضرورت ہے؟ تو کہتا ہے " نہیں صرف ٹھنڈا اور میٹھا پانی پلا دے کسی قسم کے چڑھاوے کا گوشت مجھے کھلانا اور میرے قتل کی خبر مجھے پہلے سے کر دینا۔

" شاید بیچارہ موت سے ڈرتا ہوگا؟"

ماویہ" او نھو موت سے ڈرتا ہوگا؟ اری! وہ تو موت کے ذکر سے خوش ہو جاتا ہے اور رات دن دعا کرتا ہے کہ وہ دن جلد نصیب ہو جائے، ایک مرتبہ میں نے تعجب سے دریافت کیا۔

" خبیب! میں دیکھتی ہوں کہ تو موت کے نام سے خوش ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔؟

خبیب" اچھی ماویہ! وہ شخص کیوں مسرور و شاداں نہ ہو۔ جو اس دکھی دنیا سے نکل کر ابدی آرام و آسائش کی دنیا میں جا بسے جہاں راحت ہی راحت ہے

جب میں مرونگا تو اس باغ میں منتقل ہو جاؤں گا۔ جس کی وسعت زمین و آسمان سے بڑھ کر ہے تو پھر میں کیوں نہ خوشی ظاہر کروں۔

آنے والی عورت نے ماویہ کے اسیر مہمان کے چہرے کو بغور دیکھ کے کہا،

" فی الحقیقت اس شخص کا حال حیرت انگیز ہے۔ محمد کے ساتھیوں کے سوا کسی میں ایسی خوبیاں نہیں پائی جاتیں"

ماویہ" (سرگوشی کرتی ہوئی) قسمیہ کہتی ہوں، ایک مرتبہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے جس میں سے انگور چن چن کے کھا رہا ہے۔ باوجودیکہ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ کوئی اس کے پاس نہیں جاتا۔ شاید تو میری بات کو سچ نہ مانیگی۔

عورت" اری! میں کیسے تیری بات کو سچ مان لوں۔ اس موسم میں انگور کہاں؟ آج کل تو مکہ میں بھی کسی قسم کا میوہ نہیں ہے۔

ماویہ" یہی تو اچنبھے کی بات ہے۔ مگر حلفیہ کہتی ہوں میری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا۔ میں خود متعجب ہوں۔

عورت کے چلے جانے کے بعد ماویہ نے جو کچھ پکایا تھا لے کے قیدی کے پاس پہونچی دیکھا کہ نماز میں مشغول ہے تو خاموش کھڑی رہ گئی۔ یہاں تک کہ خبیب نماز سے فارغ ہو کر مسکراتا ہوا اس کی طرف ملتفت ہوا اور تھال اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ایک لفظ بھی نہ کہا۔ ماویہ کو اس کی خاموشی پسند نہ آئی۔

" اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے آؤں؟"

خبیب " شکریہ! کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف آب شیریں پلا دے چڑھاوے کا گوشت مجھے نہ کھلانا۔ میرے قتل کی خبر کر دینا۔

ماویہ نے دیکھا کہ خبیب کا ایک ہی جواب ہوتا ہے۔ تو اسے چھوڑ کر اپنی جگہ پر چلی آئی۔

:(۳):

" خدایا میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں؟ خبیب! میری مہمان نوازی حسن سلوک اور تجھ پر بھروسا کر لینے کا یہی صلہ ہے؟

خبیب" ماویہ! درست میں تیری خوش گمانی کا خون کرنے والا نہیں ہوں۔

ماویہ" تو ایسا کہتا ہے اور میرا بچہ تیری گود میں اور استرا تیرے ہاتھ میں ہے کاش کہ میں استرا تیرے ہاتھ میں نہ دیتی۔

خبیب" (ہنستا ہوا) ماویہ اس قدر خفا نہ ہو میں نے تجھ سے استرا اس لئے نہیں مانگا کہ اس سے میں تیرے بچے کا خون کر دوں۔ معاذ اللہ ایسا برا فعل مجھ سے ہرگز نہ ہوگا۔ نہ میرا دین ایسے جرائم کی اجازت دیتا ہے۔ میں جبتک زندہ رہوں گا کبھی خون ناحق سے ہاتھ نہ رنگوں گا۔ انشاءاللہ۔ تیرا بچہ خود رینگتا ہوا آ کر میری گود میں بیٹھ گیا۔ اتفاق سے استرا بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ مگر میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے کہ میں تیرے بچے کو کسی قسم کی اذیت پہونچاؤں۔ شاید تو نے کل کا واقعہ یاد کر لیا ہوگا جس سے تو ڈر گئی تھی۔

خبیب" افسوس ماویہ! تو نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں۔ اور اس وقت تک نہ پہچانے گی۔ جب تک کہ تو مسلمان نہ ہوگی۔ مسلمان ہونے پر تجھے مسلم کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ لے اب مجھے تنہا چھوڑ دے تاکہ میں مرنے کی تیاری کروں۔ تو نے کہا ہے نہ کہ آج تیرے لوگ مجھے قتل کرنے والے ہیں؟

ماویہ" بیشک خبیب! آج وہ ظالم تیرے ساتھ برا سلوک کرنے والے ہیں

یہ کہہ کے رونے لگی۔

خبیب:۔ رو نہیں ہمارے معبودِ حق کا فرمان ہے کہ (وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا)

"کوئی شخص بے حکم خدا کے مر نہیں سکتا۔ ہر ایک کی موت کا وقت مقرر لکھا ہوا ہے۔"

ایک گھنٹہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ کفار ہتھیار بند خبیب کے خیمے میں داخل ہوئے اور اس کی بیڑیاں اُتار کر کہا۔

"چل اُٹھ اور مرنے کے لئے تیار ہو جا۔ ہمیں افسوس ہے کہ آج تک تو زندہ رہا کیا کریں اشہر الحرم درمیان میں آگئے تھے۔ ورنہ اسیری کے پہلے دن تجھے قتل کر چکے ہوتے۔"

خبیب سر اُٹھا کے دیر تک ان کے چہروں کو بغور دیکھتا رہا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہ ہوتی تھی۔ پھر گردن جھکالی۔ چنانچہ اس کو لئے ہوئے کشاں کشاں مقتل میں پہونچے۔ جہاں مجمع عام تھا جب ایک نیزہ باز جماعت اس کے قتل پر آمادہ ہوئی تو کہا

"مرنے سے پیشتر مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مل سکتی ہے؟"

اس سوال سے مجمع حیرت زدہ ہو گیا ایک نے کہا۔

"اس حالت میں تو نماز ادا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس ستون کو نہیں دیکھتا جس سے تو باندھا جائے گا۔ اور ہمارے نیزے تیرے جسم کو چھلنی کر دینے کے لئے تیز ہیں۔ تجھے تو چاہئے کہ اس وقت گریہ وزاری کیا کر ... سے معافی اور جان بخشی طلب کرے۔"

خبیب "یہ باتیں اُسے سُناؤ جو موت سے ڈرتے ہیں، ہم تو موت کو بہترین زندگی سمجھتے ہیں۔"

"جو تجھے جو کچھ کرنا ہو کر لے۔"

اجازت پاتے ہی خبیب دل و جان سے بارگاہِ ذوالجلال میں رجوع ہوا اور بنہایت خشوع و اطمینان سے دوگانہ ادا کرنے لگا۔ اس کے دل میں پریشانی تھی نہ زبان میں لکنت نہ اس کا چہرہ متغیر ہوا تھا۔ بلکہ اس پر خوشی کے آثار ہویدا تھے۔ نماز ختم کر کے قاتلوں کی طرف ملتفت ہوا اور دلکش آواز سے کہنے لگا:-

"قسم اللہ کی۔ اگر تمہیں یہ گمان نہ ہوتا کہ موت کے خوف سے میں وقت ٹال رہا ہوں تو دو رکعت اور ادا کر لیتا۔ الٰہی تو ان کی تعداد دیکھ لے۔ ان سبھوں کو قتل کروا دے تاکہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے خداوندا میں نے تیرے رسولؐ کا پیغام پہونچا دیا تو اُسے میری حالت سے مطلع کر دے اور گواہ رہ۔ اشہدان لاالٰہ الا اللہ و اشہدان محمد......"

مشرکوں میں اور زیادہ اس کی باتیں سننے کی تاب نہ رہی فوراً اس پر تیروں کی بوچھار اور نیزوں کی مار شروع کر دی جس سے اس کے تمام جسم سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے اور وہ سسکنے لگا۔ اس پر بھی سفاکوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب بھی تو محمد کو چاہیگا"

خبیب:۔ (مرتے مرتے)

بیشک ...... ہم سبھوں کی ...... جانیں محمد ...... صلی اللہ علیہ وسلم ...... پر قربان ہو جائیں ...... مگر انھیں ایک کانٹا بھی ...... چبھنے نہ پائے ...... یہ کہتے ہی اس کا سر ڈھل گیا اور اس کی پاک رُوح شہدائے اسلام کے زمرے میں شامل ہو گئی۔ رضی اللہ عنہ

اللہ اکبر! ایمان ہو تو ایسا ہو۔ ایقان ہو تو ایسا ہو، محمد رسول اللہ صلعم کی محبت ہو تو ایسی ہو۔ نہ کہ "اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے"

خبیب کے زندہ جاوید شرف و افتخار کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ موت و حیات کے درمیان بہ ثبات و اطمینان مشرکوں کو ایسا جواب دے، یہ ہے حقیقی مسلم۔ اور اسلام کا معنا یہی ہے ایسے ہی مسلمانوں نے اسلام کا بول بالا کر دیا۔ شرک و عصیان ظلم و طغیان کو زیر

حسن تغزل

از خامۂ محترمہ شفیق بانو صاحبہ شفق!

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

یوں اسیرانِ قفس آہ و فغاں کرتے رہے
کیا کہیں کیونکر بسر ہم ناتواں کرتے رہے
ان کے اندازِ ستم حکمِ فغاں کرتے رہے
درسِ ناکامی کو ہم وردِ زباں کرتے رہے
دل لیا ایماں لیا وحشی کیا رسوا کیا
رنگِ رسوائی نگاہوں میں کچھ ایسا چھا گیا
آہ بے تاثیر نالہ بے اثر ہو جائے ...گا
جلوۂ گل کا گماں تھا ان کو رنگِ خار پر

چپکے چپکے آشیاں ہی آشیاں کرتے رہے
آشیاں میں رہ کے فکرِ آشیاں کرتے رہے
لاکھ عذرِ ناتوانی ناتواں کرتے رہے
گو دوائے دردِ دل سب مہرباں کرتے رہے
عمر بھر وہ امتحاں ہی امتحاں کرتے رہے
رازِ اُلفت کو برابر ہم نہاں کرتے رہے
وہ اگر توہینِ ترکیبِ فغاں کرتے رہے
وحشت پیمائیوں بھی سیرِ گلستاں کرتے رہے

کیا سنائیں داستانِ غم تمہیں ہم اے شفق
سچ تو یہ ہے عمر بھر آہ و فغاں کرتے رہے

برادرانِ اسلام کو عید مبارک!

۱۸ اکتوبر سے شروع

بتاریخ ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱ اور ۲۳ دوپہر کو ۱½ بجے زائد کھیل

آج وطن کا وہ عزو وقار نہیں رہا۔ آج وہ لباس کی قیمت نہیں رہی، آج وہ عزت اور یکدلی نہیں رہی، آج وہ والدین نہیں رہے، آج وہ شادی شدہ شوہر اور بیویاں نہیں رہیں

کیوں؟

مغرب کے اتباع نے زندگی کا پانسہ الٹ دیا ہے۔ والدین نے بیٹی کو لاڈو پیار سے تعلیمیافتہ بنایا اور بیٹی اپنے ماں باپ اور شوہر سے بیوفائی کرنے لگی؟

R.R. NO. 16

SWAMI

سوامی

رائل ریلیز ۱۶

آج ہی معہ اہل و عیال ایسی تعلیمیافتہ لڑکی اور شوہر کی بیوی کو دیکھنے کیلئے ضرور تشریف لائیے

افسانہ:- ایس امتیاز علی تاج

میوزک:- رفیق غزنوی!!

ڈائرکٹر: اے آر کاردار

اردو زبان میں!

فلمی ستارے:- ستارہ، چراغ، یعقوب، رادھا رانی، جیون اور اجمل

پروڈیوسر:- ایم، شری نواس، ریسیور اینڈ منیجر سرکو پروڈکشن بمبئی

بکنگ کے لئے رائل فلم سرکٹ - بمبئی نمبر (۴)

اوقات روزانہ:- ۴، ۷، اور ۱۰ بجے

میجسٹک سنیما (گرگام)
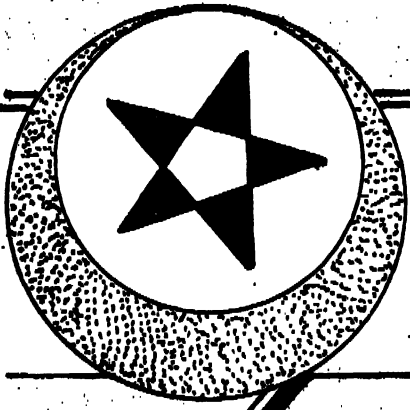
عید مبارک
آرہا ہے
بریلینٹ پکچرز لمیٹڈ کی مرہٹی مزاحیہ تصویر
میونسپلٹی
افسانہ:- مادھوراؤ جوشی
یہ فلم ایک ایسے مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہے جس کا تعلق تمام ہندوستان سے ہے یعنی میونسپلٹی کا انتظام اور شہری بیداری ہی قوموں کی تمام بیداری کی پہلی سیڑھی ہے
میوزک:- ڈاؤ زیکر (H.M.V)
ڈائرکٹر:- باپوراؤ آپٹے
اداکار:-
اوشا منتری
ول سردیسائی - سروج بورکر
(بمبئی ٹاکیز) باپوراؤ آپٹے وغیرہ!
म्युनिसिपालिटी
ब्रिलियंट चित्र
MUNICIPALITY
بکنگ کیلئے:- بریلینٹ پکچرز لمیٹڈ سنڈھرسٹ برج بمبئی نمبر (۷)

عالمگیر اور ہاتھی کی جنگ شاہجہاں کے حضور میں

تیموری خون کی شجاعت و گرمی کا اندازہ دیگر واقعات سے قطع نظر صرف اسی ایک تاریخی واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جس طرح شہنشاہ اکبر مست ہاتھیوں کو عین لڑائی کی حالت میں سونڈ پکڑ کر پیچھے ہٹا دیتے تھے اور شاہجہاں نے شہزادگی کے زمانہ میں بکمال دانشمندی شیر کو تلوار سے ہلاک کر دیا تھا اسی طرح عالمگیر نے بھی ہاتھی کو تلوار سے زک پہنچائی تھی۔ زیر نظر تصویر ۱۶۳۹ء کے اس تاریخی واقعہ سے متعلق ہے۔ کہ جب شہنشاہ شاہجہاں ہاتھیوں کی جنگ دیکھنے میں محو تھے، اتفاق سے شہزادہ عالمگیر مع اپنے دستہ کے شکار سے واپسی میں لال قلعہ کے نیچے سے گزرتے ہوئے گھوڑوں کے اصطبل کی طرف جانے لگے کہ ناگہاں ایک ہاتھی آپ کی طرف لپکا۔ لیکن آپ ذرہ برابر بھی سراسیمہ و ہراساں نہ ہوئے اور اس کے باوجود کہ ہاتھی نے آپ کے گھوڑے کو سونڈ میں پکڑ کر گھوڑے کے ساتھ آپ کو بھی دور پھینک دیا تھا۔ آپ نے ہمت نہ ہاری اور فوراً سنبھلتے ہوئے ہاتھی کے نیزہ آر پار کر کے ضرب کاری کے لئے تلوار اٹھائی اور ہاتھی کو لہولہان کر دیا۔

اس تاریخی واقعہ کو نہ صرف مورخین نے بلکہ ابوطالب کلیم ملک الشعراء شاہجہاں نے بھی نظم کیا ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ عالمگیر کی اس چودہ سالہ شجاعت جوانمردی اور علوہمتی سے شاہجہاں اتنے خوش اور متاثر ہوئے کہ جب ہاتھی کا کام تمام ہوا تو عالمگیر کو بلا کر اپنے سینہ سے لگا لیا اور اس پر سے موتی اور روپے نچھاور کئے۔ مختصر یہ کہ تیموری خون کے اس حقیقی اور غیور حصہ دار، شجاعت کے دھنی اور ہندوستان کے عظیم المرتبت شہنشاہ نے ہندوستان پر کل ۵۰ سال تک حکومت کی اور بعمر ۸۲ سال ۱۷۰۷ء میں اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

از شاعرِ حریت حضرت شاعر لکھنوی!

تجدیدِ محبت

ایک رومانی نظم!!

(۱)

اس رات کے منظر کو نہ بھولیں گی نگاہیں | لی تھیں ترے جلووں نے مرے دل میں پناہیں
تھیں دور حدود دلِ فریاد سے آہیں | کھینچے لئے جاتی تھیں مجھے عشق کی راہیں

دوشیزۂ تخییل تھی شرمائی ہوئی سی
جذبات کو تھی شوق کی نیند آئی ہوئی سی

معصوم تمنا کے ترانے تھے زباں پر | ہر سانس تھی احساسِ محبت سے منوّر
منزل کے تصور سے ہم آغوش تھے رہبر | جذبات کو آئینہ دکھاتا تھا سکندر

فطرت کے تبسم کا ہر اک نقش تھا گہرا
تھا گلشن و وادی پہ حسیں چاند کا پہرا

اٹھا تھا نگاہوں سے کوئی پردۂ اسرار | سوئی ہوئی دنیا کی ہر اک چیز تھی بیدار
ذرے تھے ترے رُخ کی ضیاؤں میں گرفتار | نرگس تھی تری مست نگاہی کی خریدار

ہر لے میں محبت کا اک انداز تھا گویا
اس رات کو فردوس کا در باز تھا گویا

اس ڈر سے کہ پردہ کہیں چہرہ پہ نہ ڈالے | چلتی تھیں ہوائیں ترے آنچل کو سنبھالے
ہونٹوں پہ تبسم کے تھے انداز نرالے | جیسے کوئی دوشیزہ قدم گھر سے نکالے

ہر ایک ادا دل کی گرہ کھول رہی تھی!
پردہ میں خموشی کے نظر بول رہی تھی!

گفتار میں اک لوچ با اندازِ ترنم | جیسے کسی نوخیز سے غنچے کا تبسم
کلیوں کے چٹکنے کی صدا طرزِ تکلم | رفتار کا، اٹھتے ہوئے محشر سے تصادم

آنکھوں میں وہ کیفیتِ صہبائے گلابی!
میخانہ میں جس طرح بہکتے ہوں شرابی

بیدار تھی سوئے ہوئے جذبات کی دنیا! | فردوس بداماں تھی خیالات کی دنیا
اللہ رے وہ لطف و عنایات کی دنیا | ہر سانس تھی اک حسن و محاکات کی دنیا

گاتی تھیں ہوائیں تو فضا جھوم رہی تھی
محور پہ تمنا کے زمیں گھوم رہی تھی

وہ جلوۂ رنگیں ہے نگاہوں کی ضیافت | نظروں کو وہ گستاخیٔ دیدار کی دعوت
آواز میں رس رخ پہ حیا زلف میں نکہت | وہ حسن جسے دیکھ کے شرمائے قیامت

دیرینہ محبت کی یہ تجدید تھی گویا
جو سانس تھی پیغامِ عید تھی گویا

(۲)

اس شان سے اس رنگ سے تم آئے نظر میں | جس طرح کہ ہو پرتوِ خورشید قمر میں
عارض پہ وہ زلفیں کہ نہاں شام سحر میں | رخ پر وہ ملاحت نہ ملے جو گلِ تر میں

اک لفظ کے پردے میں کہانی کو چھپائے
چہرہ کے حجابوں میں جوانی کو چھپائے

اس طرح پڑی تم سے مری پاک محبت | اس طرح ہوئی اصل میں بے باک محبت
پروان چڑھی کچھ نہ مگر خاک محبت | سنتا تھا کہ ہوتی ہے خطرناک محبت

نقشہ انہیں الفاظ کا اب پیشِ نظر ہے
پھیکی ہے اگر شام تو بے کیف سحر ہے

کیا یاد نہیں تم کو وہ رنگین... زمانا | وہ چاندنی راتوں میں مجھے گیت سنانا
نغمے وہ پپیہے کے وہ کوئل کا... ترانا | سوئے ہوئے جذبات کو رہ رہ کے جگانا

برساتی تھی جلوے نگہِ ناز تمہاری
کانوں میں ابھی تک ہے وہ آواز تمہاری

گلشن کی وہ تفریح وہ سبزہ کا لہکنا | چڑیوں کا سرِ شاخ وہ خوش ہو کے چہکنا
پھولوں کا کبھی صبح کے دامن میں مہکنا | خوشبو کا کبھی موجِ ہوا بن کے بہکنا

فطرت کی نگاہوں سے وہ معصوم اشارے
چلنا وہ تمہارا مرے شانوں کے سہارے

چھوٹے سے وہ چشمے کا چھلکتا ہوا پانی | موجوں کے ہر انداز میں انداز روانی
ہر صبح اک آئینۂ اسرارِ معانی | ہر شام محبت کی اک آزاد نشانی

شانوں پہ مچلتے ہوئے آنچل کا وہ منظر
طوفان کے آغوش میں جس طرح سمندر

ساحل پہ وہ سرمست بہاریں ہی بہاریں | سبزہ کے حسیں فرش پہ شبنم کی قطاریں
وہ مست ہوائیں جو طبیعت کو ابھاریں | وہ شوخ فضائیں جو قیامت کو پکاریں

سب بھول گئے تم یہ لبھانا نہیں اچھا
دیوانے کو دیوانہ بنانا نہیں اچھا

پردے میں اب اتنا نہ چھپو سامنے آؤ | نظروں سے ذرا دل کے حجابات اٹھاؤ
بجھتی ہوئی محفل میں نئی شمع جلاؤ | پھر سے مرے احساس کو احساس بناؤ

بے باک ہے معصوم محبت ہے تمہاری
شاعر کے تخیل کو ضرورت ہے تمہاری

از حضرت وجدی الحسینی - فاضل دیوبند، منشی فاضل (بھوپال!)

آج جبکہ دنیا کا ہر مخزونا خطہ بھی کوہِ آتش فشاں بنا ہوا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب پھٹے؟ اور اس علاقہ کے بچے بچائے امن کو اپنے آتشیں مادوں سے جلا کر بھسم کر دے۔ جنگ کا ہیب و خونخوار دیو تا تمام عالم انسانیت پر تسلط جمائے ہوئے ایک خونیں ہولی کے چھینٹوں سے ہر فرد بشر کو رنگین کرنے میں سرگرم کارزار ہے آتش و آہن کے طوفان بنی آدم کے ذہنی، دماغی اور عمرانی متاع ہائے گرانمایہ کو خاکستر بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور تباہی و بربادی کا سیلاب نہ صرف پست اخلاق و خود غرض انسانیت کے خس و خاشاک کو اپنے رو میں بہالیجانے پر آمادہ بلکہ شرافت نوع انسانی کے جواہر کو بھی غرقاب کر کے نیست و نابود کرنے کے لئے بیقرار ہے۔ ضرورت ہے کہ بڑی سے بڑی قربانی دیکر انتہائی بلند فداکاری و جانفروشی کا مظاہرہ کر کے اور عظیم الشان جاں سپاری و سرفروشی کو اختیار فرما کر اس عالمگیر ہلاکت و بربادی سے اپنی حفاظت و نجات کا سامان اور تمام بنی نوع کے بچاؤ کے اسباب فراہم کرنے کی سعی بلیغ کی جائے۔

اس ہمہ گیر تباہی سے بچنے کے لئے ہم کو اولیں فرصت میں بین الاقوامی بغض و نفرت اور بین الملی تصادم کے اسباب و علل پر غور و فکر کر کے معرض بحث میں لانا چاہئیے تاکہ ان ناگفتہ بہ اسباب شقاق کا ازالہ اور ان کا نعم البدل پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔

جہاں تک مفکرین اقوام کے غور و فکر اور بصیرت کا تعلق ہے سب اس پر متفق الرائے نظر آتے ہیں کہ

دنیا کے قدیم و جدید ہلاکت خیز تمدنوں کی تین بنیادیں تصادم بشری کی علل رہی ہیں شخص پرستی۔ قوم پرستی۔ جماعت پرستی۔

قدیم تمدنوں میں ہر ملک، ہر براعظم غرض ہر اقلیم میں مذکورالصدر نوع (شخص پرستی) کارفرما رہی ہے۔ جو افراد و املاک (جاگیروں) کو ایک شخص کی ملکیت قرار دے کر باہمی حقوق کی مساوات قائم کرنے کی سخت دشمن رہی ہے۔ چنانچہ عہد عتیق میں کہیں بادشاہ کو خدا یا مظہر خدا (اوتار) تسلیم کیا جاتا تھا اور کہیں اس کو خدا کا سایہ مان کر خود مختار اور بلاشرکت غیرے مالک بنا دیا گیا۔ ان کے مقابل ہمیشہ اولوالعزم افراد اپنی فطری مساوات کی تحریک سے برانگیختہ ہو کر دنیا کو عرصۂ کارزار، میدان گیر و دار اور معرکۂ قتل و قتال بناتے رہے ہیں۔

یورپ (جس کا فلسفۂ حکومت اس وقت دنیا پر حاکم ہے) شخصیت پرستی سے نکل کر اس سے بھی زیادہ گہرے اور خطرناک قومیت پرستی کے غار میں جا گرا۔ شخصیت پرستی بشریت کے افراد میں مساوات حقوق جس طرح نہ دیکھ سکتی تھی ایسے ہی قومیت پرستی بنی نوع کی اقوام میں تساوی حقوق کو برداشت نہیں کر سکتی ہے۔

شخص پرستی کی طرح قوم پرستی کی طبیعت بھی یہی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی قوت حاکمہ اور قدرت اعلیٰ (قوم) کی حکومت دنیا کے چپہ چپہ پر قائم کرنے اور ہر ملک کی دولت و ثروت اور جہان کے جملہ منافع کو اپنی ضروریات حیات میں شمار کرنے اور ہر قوم کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ بند کرنے کو اپنا نصب العین سمجھتی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے تمام اخلاق کش اصول۔ انسانیت سوز قوانین اور ہلاکت انگیز مظالم کو حق بجانب بتاتی ہے اور عالم کے امن و سلام کے خواب کو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیتی۔

قوم پرستی ایک تباہ کن تمدنی حماقت ہے۔ اس کی تباہ کاریوں اور بربادیوں سے متاثر ہو کر یورپ کے ایک حصہ نے کمیونزم کا سرخ جھنڈا بلند کیا ہے۔ مگر اس کے مقابل اسی کے سوشلزم نے سر ابھار کر کمیونزم کو محصور کر لیا ہے۔ اس کا اصلاحی قدم اور بھی فساد پرور ثابت ہوا ہے۔

اشتراکیت کے خونیں قلم نے اپنے اعمال کے جلی حروف سے ہمارے دلوں میں منقوش کر دیا ہے کہ وہ قومیت پرستی سے بھی زیادہ گہری پستی (جماعت پرستی) ہے اگر شخصیت پرستی سے اشخاص میں۔ اور قومیت پرستی سے اقوام میں منافرت اور خونیں تصادم پیدا ہوتے تھے۔ تو کمیونسٹی بشریت کے دو ٹکڑے کر کے ان میں دائمی اور لازوال طبقاتی جنگ و عداوت برپا کر دینے کی حامی ہے۔ ہاں اشتراکیت کا عمل حسن یہ ہے کہ وہ جمعیت غرباء کو مسلح کر کے دنیا کی دولتمند جماعت کو حرف غلط کی طرح محو کر دینے کی قائل ہے۔ لیکن تمام عالم کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے ان میں ابدی منافرت کی خلیج کو وسیع کر دینا کیا امن و سلامتی کے خواب کو خواب پریشاں بنانے کے مرادف نہیں؟ اور کیا یہ انسانیت کے لئے باہمی ابدی جنگ کا چیلنج نہیں؟

دنیا میں شخصیت پرستی کے نظریہ کے ضعف کے ساتھ یہ دونوں اصول (قوم پرستی جماعت پرستی) یکے بعد دیگرے پروان چڑھ رہے ہیں۔ آج دنیا کا کوئی فرد بھی ایسا نہ ہوگا جو ان میں سے کسی کا پرستار نہ ہو۔

اس کے ساتھ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسانیت عظمیٰ کے سلیم الطبع افراد شریف اقوام اور معزز جماعتیں باہمی حقوق اور قانونی مساوات کی ابدی طرفدار ہیں۔ ان میں سے کوئی فرد۔ کوئی قوم۔ کوئی جماعت ایسی دستیاب نہیں ہوسکتی جو اپنی بنی نوع کے کسی فرد کسی قوم و جماعت سے دوسرے نمبر پر رہنے کے لئے تیار ہو اسی لئے جب کبھی بھی کسی فرد و قوم کو پیغام غلامی و محکومی دیا جاتا ہے تو وہ میدانِ کارزار میں سینہ سپر ہوکر اس پیامی کے ساتھ پورے جوش سے خون کی ہولی کھیلنے لگتی ہے جس کے لئے روزمرہ کے واقعات سیاسی اور جنگ عظیم کا عمومی ہنگامہ شاہد ہے جس سے ہم اس امر کے قائل ہونے میں حق بجانب ہیں کہ مساوات قانونی کا عقیدہ ہر عقیدہ سے مستحکم ہے اور اس عقیدہ کے نشر کے آثار نے کے لئے کوئی ترکیب آج تک ایجاد پذیر نہیں ہوسکی ہے۔

عہد قدیم و حاضر کے بادشاہوں اور فقراء نے اس کے لئے ان تھک کوششیں کی اور کر رہے ہیں کہ اپنے زیر اثر انسانوں کو ذہن نشیں کرادیا جائے کہ ان میں اور ان بادشاہوں اور فقیروں میں ما فوق الانسان خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن ان کی تمام مساعی آج تک مشکور نہ ہوسکیں۔ ہر چند انھوں نے محکوم افراد کو علم کی روشنی سے محروم رکھ کر اس کے باور کرانے کی بے حد جد و جہد کی لیکن وہ تمام کاوشیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ اولاً تو اس بنا پر کہ ان کی خباثت بنی نوع کے دل و دماغ کو اس قدر مسخر نہ کرسکی کہ فطری مساواتی نظریہ کے نقوش کو لوحِ قلب سے محو کردیتی۔ ثانیاً یہ کہ ان فرعون صفت افراد کے مقابلہ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی موسیٰ سرشت انسان پیدا ہوکر ان کی پوری سرکوبی کرکے آوازۂ حق کو بلند کرتا رہا ہے۔ جس کی گونج صدیوں تک دعوتِ مساوات دیتی رہی ہے۔

موجودہ مہذب و مستبد اقوام نے ان مغرور افراد کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے جہالت کے بجائے علم کو آلۂ خیانت بنایا۔ چنانچہ ان کی زیر سرپرستی آجکل فلسفۂ تفوق رنگ و نسل اور برتریٔ تہذیب و تمدن عالم ایجاد میں آئی ہے۔ لیکن سعید قائم اقوام کا یہ جادو چل نہیں سکا۔ اس لئے کہ اول تو خود ہی مسلم مساوات حقوق تھے۔ دوئم انسانیت کی سیاسی بصیرت پہلے کے نسبت زیادہ ترقی کرچکی ہے۔

بدامنی کی یہ تینوں علتیں چونکہ مساواتِ حقوق کو نظر انداز کرنے سے علل فساد بلکہ تمام فتنوں کی جڑ بن گئی ہیں اس لئے ہم اس امر کے ماننے پر مجبور ہیں کہ شخص و قوم و جماعت پرستی میں فتنہ پروری اور فساد انگیزی کی یہ خاصیت مساوات سے انکار کے دروازہ سے داخل ہوتی ہے۔

فلسفۂ امن و سلام

پس خالص امن وہی دولتی فلسفہ اور نظام ہوسکتا ہے کہ جس میں مساوات بین الناس کا سدِ باب کرکے اس کی جگہ عقیدہ اور مساوات افراد و اقوام اور جماعتہائے انسانی کا دروازہ کھولا جائے۔ اسی نظام عمل اور فلسفہ دولتی کو پیدا کرکے اس کی عملی تبلیغ و علمبرداری بندوبست ہی دراصل امن عالم کی ایک تدبیر ہے جسکو اختیار کئے بغیر عالم انسانی سے فتنہ و فساد کا استیصال و بیخکنی ناممکن ہے

قرآن حکیم کا یہ دعویٰ کہ

" دنیا میں صرف اسی کا نظام دولتی عدالت و حقیقی۔ مساوات افراد و اشخاص و نسل بشری کا تنہا علمبردار ہے " بالکل صحیح اور ترجمانِ حقیقت ہے اور اس ایک نظام کے علاوہ دوسرا نظام موجود نہیں ہے جو اس میدان میں رائستبازانہ قدم رکھ سکے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک مخلص و صادق۔ انسانیت کا ہمدرد اور صائب الرائے طبقہ آگے بڑھ کر دولتی نظام امن کو سمجھنے اور سمجھ کر عملی تبلیغ کا سررشتہ قائم کرنے کی تدبیر کرے بلکہ اس رشتہ کو انہیں جیسے بے لوث بے غرض کار آگاہ حضرات کے ہاتھوں سے نہ نکلنے کا بھی انتظام کرے مبادا وہ دستور دولتی غرضمند لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ کر قوتِ اجرا کی ناپاکی و غرض پرستی سے نظام عمل کی پاکی کو بھی بے اثر بنادے اس سلسلہ میں مولٰنا منصور صاحب مدظلہ کی زبان میں ان شرائط کا ذکر کردیا جائے جن سے اس مضمون کے سلسلہ میں استفادہ کیا گیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

اول بے عیب مساوات پرور اور حامیٔ عدل و انصاف نظام عمل دستور سیاسی قرآنی کا کافی علم حاصل کریں دوم اساسِ انقلاب کے ذریعہ سے سمجھدار لوگوں کی ایک کافی جماعت کی تہذیب اخلاق و اعمال اور عقائد سیاسی کی پختگی کا بندوبست کرکے نظام عمل کی پاک قوت تنفیذ تیار کرکے باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں دیجائے سوم ایسا نظام قائم کیا جائے کہ یہ نظام غرضمند لوگوں کے ہاتھوں میں نہ پہونچ سکے۔ چہارم ہفت سالہ بچوں کو مخلص اساتذہ کی زیر تربیت دیکر اس پروگرام کو جاری رکھنے کی سعی کیجائے۔ فقط۔

بقیہ چار نوشی!

بے خوابی کی شکایت لاحق ہوجاتی ہے۔ چنانچہ بکثرت چار پینے سے اشخاص کثرت سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

یہ نہایت اہم بات ہے کہ چار ہاضم نہیں ہے۔ اس لئے اس کو فوراً کھانا کھانے کے بعد نہیں پینا چاہئے۔ دیکھا گیا ہے کہ بمبئی میں عموماً اس کو کھانا کھانے کے بعد ہی استعمال کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہاں ۹۰ فیصدی لوگ فتورِ ہضم کمزوری معدہ۔ قبض وغیرہ میں مبتلا نظر آتے ہیں اور یہ شکایتیں مرض جریان کا پیش خیمہ ہیں۔ لہٰذا بمبئی میں مرض جریان کی کثرت بھی چار کی زیادتی کے اثرات کا نتیجہ ہے یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ چار کو زیادہ عرصہ تک جوش دینے سے .... (جوہر قابض) زیادہ خارج ہوجاتا ہے۔ اور ہاضمہ پر جوہر قابض کا نہایت ہی خراب اور خطرناک اثر پڑتا ہے۔ زیادہ پکی ہوئی یعنی دیر تک جوش کی ہوئی چار پینا قطعی مضر صحت ہے۔

چار کو کم مقدار میں پینا چاہئے تاکہ اس سے صحیح اور مفید نتائج حاصل ہوں چار میں دودھ اور بالائی کا اضافہ اس کو لطیف اور خوش ذائقہ اور کسی حد تک مقوی کردیتا ہے۔ ہمارے نزدیک صبح و شام دو وقت چار پینا ٹھیک ہے یا زیادہ سے زیادہ صبح۔ سہ پہر اور شام یعنی تین وقت استعمال کی جاسکتی ہے اس سے زیادہ استعمال کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے بلکہ خلافِ اصول اور قطعی مضر صحت ہے۔

از جناب ڈاکٹر محمود علی صاحب بریلوی سکریٹری انڈین میڈیکل سوسائٹی بمبئی

چاۓ (TEA) دنیا کے تمام ممالک میں کم وبیش استعمال کی جاتی ہے ہندوستان میں بھی اسکا کافی رواج ہوگیا ہے اور خاص طور پر بمبئی میں تو اس کثرت سے پی جاتی ہے کہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جس قدر بمبئی میں چاۓ استعمال کی جاتی ہے دنیا کے کسی مقام پر حتی کہ سرد حصوں میں بھی اس زیادتی سے استعمال نہیں کی جاتی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بمبئی میں اس درجہ چاۓ نوشی ۵۰ فی صدی امراض کا سبب ہے۔ اگر بمبئی میں اس قدر زیادتی سے چاۓ نہ پی جاۓ بلکہ طبی اصولوں کے ماتحت صرف ضرورتاً استعمال کی جاۓ تو ہزاروں ایسی بیماریاں جو محض چاۓ کی کثرت کا سبب ہیں خود بخود کم ہو جائیں گی۔

دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ کسی چیز کو برابر استعمال کرتے رہتے ہیں وہ اس کے تمام افعال وخواص سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔ لیکن بمبئی میں اس کے خلاف ہے یہاں لوگ اس درجہ چاۓ پینے کے باوجود بھی اس کے فوائد ونقصانات سے اچھی طرح واقف ہونا تو درکنار عام لوگ تو اس کے صحیح استعمال اور باقاعدہ بنانے کا طریقہ تک نہیں جانتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مفید چیز بھی اگر زیادتی یا بے قاعدگی سے استعمال کی جاۓ تو خطرناک ثابت ہوتی ہے مثلاً پانی اگر بلا ضرورت بے وقت یا مسلسل.. استعمال کیا جاۓ تو وہ بھی یقینی تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ مچھلی گوشت۔ گھی۔ دودھ، دہی وغیرہ یہ سب طاقتور چیزیں مانی گئی ہیں لیکن ان کو بھی صحیح مقدار میں کھانے سے اچھے نتائج حاصل ہوتے ہیں اور اگر ان ہی چیزوں کو بے قاعدگی یا زیادہ مقدار میں استعمال کیا جاۓ تو نہ صرف یہ کہ غیر مفید ثابت ہوں گی بلکہ یقینی مضر صحت اور سخت تکلیف کا باعث ہوں گی۔

معلوم ہونا چاہئے کہ چاۓ اثرات کے اعتبار سے خالی نہیں ہے بلکہ نہایت گہرا اثر رکھنے والی ایک ایسی عمدہ شے ہے جس کو اگر ضرورتاً اور صحیح مقدار میں استعمال کیا جاۓ تو صحت کو قائم رکھنے۔ طبیعت کو بحال وبشاش کرنے اور اکثر امراض کو جسم انسانی سے دفع کرنے میں اس کی مدد سے پوری پوری کامیابی حاصل کی.. جاسکتی ہے اور اسی لئے حکماۓ قدیم نے بمبئی کی مرطوب آب وہوا کے پیش نظر چاۓ کا مناسب استعمال جائز ومفید قرار دیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صبح سے شام تک برابر چاۓ پی جاتی رہے اور بجاۓ فوائد کے اس سے سراسر نقصانات.. حاصل کئے جائیں۔

میرے مطب میں ایسے بہت سے لوگ بسلسلہ علاج آۓ جو تمام دن میں پچیس تیس پیالی پیتے تھے اور وہ مناسب علاج اور چاۓ کی مقدار کم کر دینے سے بہت جلد ٹھیک ہو گئے۔ مجھے ایسے لوگوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو کھانا تک کھاتے اور ایک ایک دن میں چالیس پچاس پیالی اور اس سے بھی زیادہ چاۓ پی جاتے ہیں۔

ایسے لوگ اپنی صحت کو بہت جلد کھو بیٹھتے ہیں۔ نہایت کمزور ولاغر ہو جاتے ہیں۔ ان کی ناتوانی ولاغری امراض کو دعوت دیتی ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ وہ.. بہت جلد کسی نہ کسی مہلک یا غیر مہلک مرض میں مبتلا ہو کر یا تو فوراً ہی جان بحق ہو جاتے ہیں یا زندگی کے اخیر سانس تک اگر بڑے آدمی ہیں تو ڈاکٹروں کا شکار اور اگر غریب ہیں تو عزیز واقارب کے لئے وبال جان ہو کر رہتے ہیں۔

اس مضمون میں چاۓ کے افعال وخواص اور فوائد ونقصانات پر تھوڑی سی روشنی ڈال دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ چاۓ اقسام کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اور اسی لئے اثرات میں کم وبیش ہوتی ہیں۔ عام طور پر دو قسمیں ہیں۔ ایک سبز دوسری سیاہ چاۓ کی چھوٹی چھوٹی پتیوں کو ایک خاص طریقہ پر بھوننے سے سبز چاۓ بن جاتی ہے۔ اور جب بڑی پتیوں کو بریان کرتے ہیں تب وہ سیاہ چاۓ تیار ہوتی ہے۔ سبز چاۓ نسبتاً سیاہ چاۓ کے اچھی اور قوی ہوتی ہے۔ سبز چاۓ میں تھی نین (Theine) یعنی چاۓ کا کھار کسی قدر زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ محرک اعصاب ہے چاۓ میں مختلف معدنی ونباتی مادے پاۓ جاتے ہیں اور لطیف روغن بھی موجود ہے اس کا کھار تھی نین محرک ومقوی ہے لیکن دوسرا جز جس کا نام ٹےنین ہے۔ سخت قابض ہے۔ عمدہ چاۓ میں تھی نین زیادہ پائی جاتی ہے اور اس لئے وہ مقابلتاً بہتر ہے اور خراب وسستی چاۓ میں ٹےنین زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہر اعتبار سے خراب اور مضر ہے۔

اگر اعتدال سے چاۓ پی جاتے تو نہایت مفید ہے۔ خاصکر بمبئی میں تو اس کا مناسب استعمال بہت ہی ضروری ہے۔ اس کو کم مقدار میں پینے سے نہایت بہتر نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ چاۓ کا اثر نظام عصبی ونظام دموی کو تحریک دیتا ہے جس سے تکان اور کاہلی دور ہو کر طبیعت نہایت چست ہو جاتی ہے دماغ کی جانب خون کا دورہ تیزی سے ہونے کے سبب حواس وقواۓ چست ہو جاتے ہیں۔ اور دماغی کام کرنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زیادتی سے چاۓ پینا نہایت خطرناک ہے اس سے ہضم خراب ہو جاتا ہے قبض کی شکایت ہو جاتی ہے۔ دل دھڑکنے لگتا ہے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔ مزاج وہمی ہو جاتا ہے۔ نیند کم آتی ہے۔ حتی کہ کبھی کبھی تو مستقل

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر ملاحظہ ہو)

ٹھہر اے ہمنشیں، کچھ یادِ عہدِ بوستاں کرلیں
ہم اپنے قصۂ ماضی کو تازہ اور جواں.... کرلیں
وہ رنگیں ساعتیں جب گلستاں مینائے فطرت تھا
وہ زریں دور جب ساغر بکف تھا ہر گل.... گلشن،
بہاریں پھوٹتی تھیں جب حجاب لالۂ و گل سے
جوانانِ چمن جب شوخیاں آپس میں کرتے تھے
وہ جب نرگس وفورِ کیف سے مخمور..... رہتی تھی
وہ جب چمپا کی بھینی بھینی خوشبو فرحتِ جاں تھی
وہ نغمے آبشاروں کے وہ نغموں کی طرب خیزی
چنبیلی اور بیلے کا وہ رنگ و نور کیا کہنا
وہ سبزہ کی لہک، وہ سبزۂ شاداب کیا کہنا؟
وہ پانی کی روانی ہر کیاری میں ارے توبہ!!
وہ شوقِ انتظارِ دید کا عالم معاذ اللہ
یکایک وہ دبے قدموں کسی کا چھپ کے آجانا
گلوں کا اور کلیوں کا وہ پھر بے نور ہو جانا
وہ دل کی تیرگی کا یک بیک کافور ہو جانا،
جمال و حسن عالمتاب کی وہ نور افروزی!
وہ احساسات کی دنیا میں اک دم حشر انگیزی
وہ سرگوشی کا عالم، وہ نیاز و ناز کی دنیا
عرق آلود چہرے کی وہ رعنائی و زیبائی
نگاہوں سے وہ پیغامِ محبت کی فسوں..... کاری
اداؤں میں وہ معصومیت و پندارِ رسا مانی،
وہ حرفِ مدعا کا لڑکھڑانا لب کی جنبش پر
وہ رفتہ رفتہ مہر و رحمت و انعام کی بارش
بطرزِ خاص پھر اقرارِ الفت کی ضیا باری،
وہ باتوں باتوں میں "کچھ کہہ کے" ان کا مسکرا دینا
فضائے گلستاں کا عالمِ انوار ہو جانا...
طرب کے بادلوں کا قلبِ غمگیں پر امنڈ آنا
تمام عالمِ امکاں کا عشرتگہ بنا دینا

عنادل کو بھی اپنے ساتھ سرگرمِ فغاں.. کرلیں
انہیں لمحاتِ رفتہ سے مرتب داستاں کرلیں
ہر اک غنچہ مئے حسنِ ازل سے جامِ جنت تھا
کلی کھلتی تھی یوں جیسے سحر کو ہو کنول روشن
چمن رنگیں نوا ہوتا تھا جب نغماتِ بلبل سے
اُبھرتے تھے۔ سنبھلتے تھے۔ نکھرتے تھے بپھرتے تھے
تماشائے چمن کی دید سے مسحور..... رہتی تھی
شمیم انگیز و نکہت ریز تھی اور عیش ساماں تھی
سُریلی گنگناہٹ میں وہ موجِ زمزمہ ریزی
وہ لپٹیں عطر کی سی۔ وہ جمال طور کیا کہنا؟
ہوا کے زور سے پتوں کا پیچ و تاب کیا کہنا؟
وہ جوشِ نوجوانی ہر کیاری میں ارے توبہ
طلوعِ نورِ صبحِ عید کا عالم معاذ اللہ
کنول کے قمقموں کا جگمگا کر جھلملا جانا
شرابِ نابِ فطرت سے سراپا چور ہو جانا
سوادِ طور بن جانا، شعاعِ نور ہو جانا
وہ دل کے گوشہ گوشہ میں مذاقِ کیف اندوزی
محبت کی ہر اک شے میں وہ یکسر رنگ آمیزی
وہ حسن و عشق کی دنیا، سراسر راز کی دنیا
وہ شبنم ریز رخساروں کا رنگ جلوہ پیرائی
خموشی، بے زبانی، شرمگینی، میکدہ.... باری
سکوں بخشی و دلداری، جگر دوزی و حیرانی
وہ چلتے چلتے رک جانا زباں کا عرض کاوش پر
لبوں کی جنبشوں سے چپکے چپکے حسن فہمائش
تنِ مردہ میں روحِ سرخوشی کی شعبدہ کاری
کلی کا کھلکھلا پڑنا۔ گلوں کا سر جھکا دینا
ہر اک برگ و شجر کا جھوم کر سرشار ہو جانا
امنڈ آنا، بکھر جانا۔ بکھر کر پھر برس جانا
زمانہ بھر میں گنجینہ مسرت کا لٹا دینا

مگر افسوس واپس وہ زمانہ آ نہیں سکتا
مجھے تڑپا تو سکتا ہے مگر بہلا نہیں سکتا

از حضرت ... (بھوپال)

عہدِ رنگین کی یاد

خاص برائے الاصلاح عید نمبر

از حضرت علامہ
مولنا ابو محمد امام الدین !
رام نگری

حمیدہ شاہی باغ کے مالی کی گل اندام اور پیکر جمال بیٹی اور شہنشاہ ہند جہانگیر کی منظور نظر خادمہ تھی وہ دن میں کئی کئی بار بیلے چنبیلی اور گلاب کے پھولوں سے جہانگیر کے مسند اور پلنگ کو سجاتی اور اس کی عنایت بھری نظر اور پیار بھری مسکراہٹ انعام پاتی۔ قصر شاہی حسن وجمال اور رنگ ولطافت کا خارزار تھا۔ پھر بھی حور وش حمیدہ رشک رقابت اور یاس وحسرت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی وہ جس وقت اپنی آسمانی اوڑھنی کا زرتار پلو اڑاتی ایک طرف سے دوسری طرف نکل جاتی تو کتنی نازنین لونڈیاں اور مہ جبیں باندیاں رشک و حسد سے جل کر خاک ہو جاتیں لیکن اف نہ کر سکتیں کیونکہ حمیدہ جہانگیر جہاں پناہ شہنشاہ عالم کی منہ لگی خادمہ تھی........

حمیدہ اور جہانگیر ایک ساتھ کھیلے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب جہانگیر جہانگیر نہ تھا۔ شہزادہ سلیم تھا اس زمانے میں دونوں نے آرزوؤں اور تمناؤں کی کتنی کشتیاں بنائیں اور بہائی تھیں سادگی اور بھولے پن کے کتنے کبوتر پکڑے اور اڑائے تھے ہنسی اور کھیل کے کتنے ہار گوندھے اور نوچ کھسوٹ کر پھینک دئے تھے

اگر مہرالنسا ایران سے ہندوستان آکر نورجہاں نہ بنتی تو حمیدہ ہی جہانگیر کے دل کی ملکہ اور تاریخ ہند کی نورجہاں ہوتی۔

نورجہاں کی محبت میں جہانگیر حمیدہ کی محبت کو بھول گیا۔ مگر حمیدہ سلیم کی محبت کو نہ بھلا سکی۔ وہ نورجہاں کی موجودگی میں جہانگیر کی محبت کا لفظ بھی زبان پر لاتی تو زبان جل کر خاک ہو جاتی۔ مگر وہ دل سے ہمیشہ جہانگیر کی محبت کا کلمہ پڑھا کرتی تھی۔ وہ بھولے سے جہانگیر کے پاس آتی تو ایک بار کن انکھیوں سے دیکھ کر جیسے اشارے سے اتنا ضرور کہہ دیتی کہ تم اپنی بچپن کی حمیدہ کو بھول جاؤ سو بار بھول جاؤ لیکن حمیدہ اپنے بچپن کے سلیم کو نہیں بھول سکتی۔ زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ اس نے جس طرح تمہیں ایک بار پیار کیا۔ اسی طرح زندگی بھر پیار کرتی رہے گی وہ تم سے محبت کر کے کبھی کسی اور سے محبت نہیں کر سکتی۔ وہ ایک دفعہ تمہاری ہو چکی ہے۔ اب وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ وہ تمہاری ہے تمہاری ہی رہے گی۔

حمیدہ جو کہتی تھی۔ وہی اس نے کیا بھی وہ جہانگیر کی محبت میں زندہ رہی اور اسی کی محبت میں اس نے جان دیدی۔

(۲)

برسات کا جذبات خیز موسم تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش دلوں میں کیف ونشاط کی تخلیق کر رہی تھی جہانگیر پری پیکر اور ماہوش نازنینوں کے جھرمٹ میں بیٹھا جام صہبا سے شغل کر رہا تھا یکایک اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی اس نے تمام خادماؤں اور باندیوں کو رخصت کر دیا صرف گلشن رہ گئی تھی۔

جہانگیر نے گلشن کے ہاتھ سے ساغر لیتے ہوئے کہا "گلشن!"

"جہاں پناہ!"

"ملکہ کہاں ہیں؟"

"حمام میں جہاں پناہ!"

"اس قدر ٹھنڈ میں!"

"جہاں پناہ! حمام میں صندل کی لکڑیاں جل رہی ہیں۔ وہاں سردی نہیں بلکہ ایک راحت بخش گرمی ہے!"

"اچھا گلشن تم جاکر ملکہ سے عرض کرو بادشاہ سلامت یاد کر رہے ہیں۔ یہ موسم یہ ہوا۔ یہ فضا مجھے ملکہ کے بغیر بڑی بے کیفی محسوس ہو رہی ہے"

شاہی محل بیلے چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو سے عطر آگیں ہو گیا۔ کسی کی گہرے آسمانی رنگ کی اوڑھنی کا زرتار پلو ہوا میں لہرا اٹھا۔ کالے بادل میں بجلی کوند گئی۔

جہانگیر کی نظر اس طرف پھری تو دیکھا کہ حور جمال حمیدہ اس کے مسند کو عطر بیز پھولوں سے سجا رہی تھی جہانگیر کی نظر سے حمیدہ کی نگاہ مل گئی۔

جہانگیر کے دل میں نہ جانے کیا آئی اس نے کہا "حمیدہ!"

"جہاں پناہ!"

بادشاہ نہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا جو کہتے کہتے رک گیا پھر ٹھہر کر بولا "میں تم سے بہت خوش ہوں"

"کنیز کی خوش قسمتی ہے"

"ایک بات پوچھوں بتاؤگی؟"

"جہاں پناہ کا ہر ارشاد کنیز کے سر آنکھوں پر ہے"

بادشاہ کی نگاہیں حمیدہ کے افسردہ چہرے پر جمی ہوئی تھیں بادشاہ نے پوچھا "تم ہمیشہ افسردہ اور غمگین کیوں رہتی ہو؟"

"کوئی بات تو نہیں ہے جہاں پناہ!"

نہیں حمیدہ مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ بچپن میں تم مجھ سے اپنی کوئی بات پوشیدہ نہ رکھتی تھیں بچپن کی باتیں یاد ہیں یا نہیں؟ مجھے تو یاد آتا ہے تم سے کافی ساتھ رہ چکا ہے۔

"ہاں جہاں پناہ! اور مجھے اس وقت کی ایک دو نہیں بہت سی باتیں یاد ہیں۔ کنیز اس وقت جہاں پناہ کو سلیم کہا کرتی تھی۔ سلیم ہی نہیں نہ جانے اور کیا......"

حمیدہ یکایک خاموش ہوگئی۔

"تنہائی میں تو اس وقت بھی تم مجھے سلیم کہہ سکتی ہو حمیدہ!" بادشاہ نے ایک خاص انداز سے مسکرا کر کہا

"یہ جہاں پناہ کی عنایت اور کنیز نوازی ہے لیکن کنیز اس کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ کسی زمانہ میں جہاں پناہ سے لونڈی کا ساتھ رہ چکا ہے لیکن آقا ہر حال میں آقا اور لونڈی ہر حال میں لونڈی ہے اگر کنکر اور موتی دریا میں کچھ دنوں ساتھ رہ جائیں تو کنکر کا اپنے کو موتی کے برابر سمجھنا نادانی ہے۔"

"حمیدہ! میں تو سمجھتا تھا تیرے بچپن کے ساتھ تیری باتیں بھی رخصت ہوگئیں۔ لیکن تیرے منہ سے تو آج بھی اسی طرح پھول جھڑتے ہیں۔ تجھے کون کنکر کہہ سکتا ہے؟"

بادشاہ کی ہلکی ہنسی سے محل گونج اٹھا۔ حمیدہ کے لب ہائے ناز پر بھی تبسم کی ایک دلفریب لہر دوڑ گئی۔

"اب کنیز کو رخصت کی اجازت ہے جہاں پناہ؟"

"ابھی کیسے اجازت ہو سکتی ہے؟ تم نے میرے سوالوں کا جواب تو دیا ہی نہیں؟"

"کس سوال کا جہاں پناہ؟"

"ارے وہ میں نے تم سے کیا پوچھا تھا؟ —— ہاں یاد آیا تم ہر وقت اداس اور غمگین کیوں رہتی ہو اور تم نے ابھی تک اپنی شادی کیوں نہیں کی۔

حمیدہ کے چہرے کی افسردگی اور بڑھ گئی۔ اس نے عرض کیا۔ کنیز جس حال میں ہے۔ اچھی ہے۔ اسے شادی کی ضرورت نہیں"

"نہیں ضرورت کیوں نہیں ہے؟ تمہارا حسن و شباب اس قابل نہیں ہے کہ یوں ضائع ہو۔ تمہاری شادی ہوگی میرے دربار کے کسی بڑے منصب دار کے ساتھ ہوگی۔ اپنے ساتھ کھیلی ہوئی حمیدہ کا خیال رکھنا میرا فرض ہے"

جہانگیر کو کیا خبر تھی کہ اس کی یہ ہمدردانہ باتیں حمیدہ کے دل کے ساتھ تیر و نشتر کا کام کر رہی تھیں۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا۔

"جہاں پناہ کنیز کو جانے کی اجازت ہو"

حمیدہ خاموش تھی

"بے جا شرم و حیا کو راہ نہ دو حمیدہ! تم اپنی عمر کی طرف خیال نہیں کرتیں۔ اب تمہیں بے توقف شادی کر لینی چاہئے"

حمیدہ کہاں تک اپنے دل کو پتھر بناتی۔ بہت صبر و ضبط کرنے پر بھی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کہا "میں شادی کر چکی ہوں جہاں پناہ!"

جہانگیر کو بہت تعجب ہوا بولا "کب۔ کب۔!"

"بچپن ہی میں جہاں پناہ؟"

"مجھے تو نہیں معلوم۔ بچپن میں کب اور کس سے؟"

"کبھی عرض کروں گی حضور!"

"کبھی نہیں آج ہی آٹھ بجے رات کو خضر منزل میں تمہاری باتیں سنوں گا اور اگر مجھے اطمینان نہ ہوا تو اپنی تجویز کے مطابق تمہاری شادی کر دوں گا"

اتنے میں ایک لونڈی نے حاضر ہو کر عرض کی "جہاں پناہ! ملکۂ عالم تشریف لا رہی ہیں"

حمیدہ اشک آلود آنکھیں اور غمناک صورت لئے چلی گئی۔ جہانگیر مسند کے سہارے بیٹھ کر نہ جانے کس خیال میں غرق ہوگیا۔

:(۳):

آٹھ بجے رات کا وقت تھا جہانگیر کے حکم کے مطابق حمیدہ خضر منزل میں اس سے ملی۔ اوپر ستاروں کے جھرمٹ میں چاند مسکرا رہا تھا۔ نیچے جھیل کے شفاف اور سیمیں پانی میں ستاروں کا عکس پڑنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا زمین پر بھی ستاروں کی ایک بستی بس گئی ہے۔

روپہلی چاندنی نے سیم تن حمیدہ کے حسن و جمال میں اور بھی رعنائی و دلفریبی پیدا کر دی تھی۔ جہانگیر نے فرط نشاط سے کہا "حمیدہ!"

"جہاں پناہ!"

"آج تو تم بلا کی حسین معلوم ہو رہی ہو۔ کتنا نکھار ہے۔ آج تمہارے چہرے پر!"

"جہاں پناہ کی یہ کنیز نوازی کچھ نئی نہیں ہے۔ بچپن میں جہاں پناہ بارہا اس طرح فرما چکے ہیں" حمیدہ خضر منزل کے مرمریں زینے پر کھڑی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے پانچ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ بادشاہ نے بھی بڑھ کر زینے پر قدم رکھ دیا۔

حمیدہ نے کہا "جہاں پناہ آپ ان سیڑھیوں پر نہ چڑھئے۔ یہ سیڑھیاں بہت خطرناک ہیں میں تو ان پر چڑھنے اترنے کی خوگر ہو گئی ہوں۔ کئی بار تو بار گوندھتے گوندھتے گنبد تک چلی گئی ہوں۔ آج بھی اسی طرح جہاں پناہ سے باتیں کرتے گنبد تک جاؤں گی" وہاں ایسی فرحت افزا ہوا چلتی ہے۔ ایسا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ نیچے اترنے کو دل نہیں چاہتا۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے۔ کہ شعاعوں کی کمند کے سہارے چڑھ کر چاند کی دنیا میں چلی جاؤں"

بادشاہ بولا "تمہیں کچھ یاد ہے حمیدہ!"

"کیا جہاں پناہ؟"

"آج میں نے یہاں تمہیں کیوں بلایا ہے؟ چلو اپنی زندگی کی داستان سناؤ"

"بہت اچھا جہاں پناہ! لیکن وہ داستان نہیں ہے۔ وہ تو ایک حقیقت ہے"

ایسی ہی حقیقت جیسی آج کی ہماری ملاقات۔ یہ چاندنی رات۔ یہ سین جمیل"
"اچھا وہ کچھ بھی ہے۔ اسے سناؤ۔ شاعری نہ کرو۔ جانتی ہو نہ میرا وقت کتنا قیمتی ہے؟"
"کنیز شاعری کیا جانے جہاں پناہ! وہ تو واقعات وحقائق عرض کرے گی۔ کنیز شہنشاہ کے وقت کی قیمت کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ وہ آج کے بعد پھر کبھی جہاں پناہ کا وقت ضائع نہ کرے گی"

یہ کہتے کہتے حمیدہ چھ زینوں سے ساتویں سیڑھی پر پہونچ گئی۔ اس کی اوڑھنی سر سے کھسک کر شانے پر آگئی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا "تو ہاں جہاں پناہ! بچپن کے دن تھے۔ ایک لڑکے سے میرا بیاہ طے ہوگیا۔ وہ نہایت شکیل وجمیل لڑکا تھا اور مجھے بہت پسند تھا۔ شاید یہ پسند ہی محبت کی تمہید ہوتی ہے۔ میں پہلے اُسے پسند کرتی تھی۔ بعد میں اس سے محبت کرنے لگی۔ مجھے پسند اور محبت کا صحیح فرق نہیں معلوم۔ میں اپنے دل کی حالت کا خیال کر کے عرض کر رہی ہوں۔ میں پسند کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ محبت کی آگ پہلے عورت ہی کے دل میں سلگتی ہے۔ اور اس کے دل میں اس آگ جل مرنے کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے"

حمیدہ تین زینے طے کر گئی۔ جہانگیر نے بے تاب ہو کر سوال کیا "کیا یہ واقعات میری تمہاری ملاقات سے پہلے کے ہیں؟"

حمیدہ بولی "پورے حالات سن لیجئے۔ جہاں پناہ!"
"اچھی بات ہے چلو کہو"
"میں ایک غریب لڑکی تھی۔ اور وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں نے ایک روز شادی کا کھیل کھیلا وہ دولھا بنا اور میں دلھن۔ وہ گھونگھٹ کھول کر میری صورت دیکھنا چاہتا۔ میں شرماتی ناز کرتی منہ نہ دیکھنے دیتی۔ جب وہ بہت مضطرب ہوا تو میں نے اسے ملین کے کنارے اپنے ہاتھ سے اپنا گھونگھٹ ہٹا کر اسے اپنے گلے سے لگایا اور کہا تم میرے شوہر ہو میں تمہاری بیوی۔ پھر بھلا شوہر سے بیوی کو کیسی شرم؟ میں تو صرف ناز کر رہی تھی اور دیکھنا چاہتی تھی کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ لیکن یہ بتاؤ تم مجھ سے ہمیشہ محبت کرتے رہو گے؟ مجھے چھوڑ تو نہ دو گے لڑکے نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر کہا "حمیدہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ تم سے محبت کروں گا۔ بھلا شوہر بھی کبھی اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے"

جہانگیر نے کہا "اس بے وفا کا نام تو بتاؤ حمیدہ! وہ جہاں بھی ہوگا میں تمہارے لیے اس کی تلاش کراؤں گا۔ اور اُسے بلوا دوں گا"

"اچھا بتاؤں گی جہاں پناہ!" یہ کہہ کر حمیدہ پانچ زینے اور اوپر چڑھ گئی۔ اب وہ بارہویں زینہ پر تھی۔ جہانگیر نے کہا "آخر تم کہاں چڑھتی جا رہی ہو کیا سچ مچ چاند کی دنیا میں چلی جاؤ گی کیا؟"

"دل تو یہی چاہتا ہے جہاں پناہ! اچھا واقعہ سنیئے۔ وہ لڑکا ایک اقبال مند باپ کا بیٹا تھا اور خود بھی اقبال مند تھا وہ غریب حمیدہ کے بچپن کا شوہر تاج وتخت کا مالک بن گیا اس کی لونڈیوں اور خادماؤں کی انتہا نہ رہی۔ اس کی شبستان عشرت مہ جبینوں اور حوروشوں کی جنت بن گئی۔ وہ لڑکا حمیدہ کا بچپن کا وہ ساتھی اس کا وہ دولھا۔ اس کا وہ شریک زندگی جس نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہمیشہ باوفا رہنے کا عہد کیا تھا۔ اس جاہ وجلال دولت وثروت رنگ جمال اور عیش وعشرت میں حمیدہ کو بھول گیا لیکن حمیدہ اُسے نہ بھول سکی وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی! مرد بیوی کو بھول سکتا ہے۔ مگر عورت شوہر کو نہیں بھول سکتی"

جہانگیر کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ (باقی صفحہ ۱۰۴ پہ دیکھئے)

ایگل برانڈ تھرماس
اور
فوڈ جار استعمال کرکے
مطمئن ہو جائیے......... کیونکہ
مسافرت۔ پکنک (دعوت) مدارس اور دفاتر میں آپ کا کھانا ۲۴ گھنٹے تک گرم رہ سکتا ہے۔ سرد چیزیں
مثلاً پانی، شربت وغیرہ ۲۴ گھنٹے تک سرد اور تازہ رکھنے کے لئے ایگل برانڈ "ویکیوم بوتل ہر جگہ بکتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے لکھئے۔
K. S. Shivji & Co.
کے ایس شیوجی اینڈ کمپنی!
BOMBAY,
144-46, Chakla, Street.
CALCUTTA,
33, Canning Street.
MADRAS,
Patobo 5.
بمبئی ۱۴۴-۴۶ چکلہ اسٹریٹ
کلکتہ ۳۳ کیننگ اسٹریٹ
مدراس پوٹوبو ۵
کراچی کیمپ بیل اسٹریٹ
ہندوستانی صنعت میں ایک اور اضافہ
سنجر کمپنی نے صنعتِ کلاہ سازی میں جو ترقی کی ہے آپ اپنی مثال ہے۔ سنجر کمپنی میں ٹرکی ٹوپی و
فیلٹ کیپ وغیرہ کی بانات تیار ہوتی ہے۔ سنجر کمپنی کا بنا ہوا مال (بانات) جن سے ٹرکی ٹوپیاں اور فیلٹ۔ بنگلور کیپ وغیرہ تیار ہوتی ہیں
ہندوستان کے بڑے بڑے بیوپاریوں نے پسند کیا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ غیر ولایت سے اس صورت میں مال آنا بند ہو گیا ہے جس
صورت میں سنجر کمپنی بانات (فیلٹ) تیار کر کے مارکیٹ میں پیش کرتی ہے۔ سنجر کمپنی کے نمدہ کی ٹوپیاں یعنی ٹرکش کیپ فلٹ بنگلور
وغیرہ ہر جگہ بڑے بیوپاریوں سے بہ آسانی ملجائیں گی سنجر کمپنی کی جو بنی ہوئی ٹوپیاں ہونگی ان کے اندر آپ ایک لیبل پائیں گے جس پر
سنجر کمپنی لکھا ہوا ہوگا۔ یہی اصل نشانی ہے بوقت خریداری ٹوپی کی پٹی اٹھا کر سنجر کمپنی لکھا ہوا آپ ضرور دیکھ لیجئے یہی اصلی ہونے کا ثبوت ہے!!
ایجنسی سنجر اینڈ کو
نیشنل کیپ مارٹ۔ بھنڈی بازار پاٹھکا بلڈنگ بمبئی ۳

قلعہ الموت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ اسمٰعیل کے پیرو جو اسمٰعیلی فرقہ کے افراد کے نام سے آج بھی مشہور ہیں اسی فرقۂ اسمٰعیلیہ میں حسن بن صباح جیسی ایک نامی گرامی شخصیت گذری ہے جس نے قلعۂ الموت کی اساس اسمٰعیلی اماموں کیلئے ڈالی تھی اس قلعہ کی اونچائی گیارہ ہزار فٹ ہے اور اس کے اطراف میں متعدد چھوٹے چھوٹے پہاڑ واقع ہیں، الموت کے مختصر سے نام سے یہ قلعہ اب بھی مشہور اور موسوم ہے اور تاریخ اس نام کی اس طرح توضیح کرتی ہے کہ یہ نام الوہ (عقاب) آموت (تعلیم) کا مخفف ہے اور معنوی حیثیت سے "عقاب" کی تعلیم کا ماخذ ہے۔ ایران میں دیلمی بادشاہوں کے عہد میں شکار کا بہت شوق تھا۔ ایکدن ایک بادشاہ اپنے ساتھ ایک عدد عقاب اور فوجی دستہ لیکر شکار کیلئے اس قلعہ کی طرف گیا اور شکار کے پیچھے عقاب کو چھوڑ دیا لیکن وہ جانور اپنی جان بچانے کیلئے پہاڑ پر چڑھنے لگا عقاب بھی تعاقب کرتا ہوا پہاڑ پر جانے لگا انجام کار بادشاہ نے جو ان دونوں جانوروں کے پیچھے پہاڑ پر چلا جا رہا تھا۔ اس قلعہ کو دیکھ لیا اور اسے آباد کیا لہذا اس سے یہ مطلب اخذ کیا جاتا ہے کہ چونکہ عقاب نے اسے تعلیم دی اور اس نے اپنی حکومت قائم کی اس لئے اس قلعہ کو "قلعہ الموت" کہتے ہیں اور اسی واقعہ کی روشنی میں مورخ کامل ابن اثیر بھی "قلعہ الموت" کی وضاحت کرتا ہے۔ حسن بن صباح جب "قلعۂ الموت" پر پہونچے تو اس وقت سلجوقی بادشاہوں کیطرف سے مہدی نامی شخص الموت کا گورنر مقرر تھا اور اس سے حسن بن صباح کے اچھے اور گہرے مراسم تھے بنا بریں حسن بن صباح اس قلعہ کو خریدنے میں کامیاب ہوئے اور اس کے دام "گرد کوہ" اور رودام گام کے اسمٰعیلی حاکم رئیس منظفر سے حاصل کرنے کیلئے ایک خط تحریر فرمایا اور اس قلعہ پر قبضہ کر کے آئمہ اسمٰعیلی کی خدمات بجا لانے کیلئے وہاں اپنا کاروبار رکھا بعد ازاں انہوں نے ایک قابل اعتماد دوست اسد کو مصر کی طرف روانہ کیا جو مصر میں مقیم حسن سدی سے ملکر امام حضرت شاہ نزار سے جنہیں ان کے چھوٹے بھائی مستعلی نے عسکری طاقت سے قید رکھا تھا۔ جا ملے اور آپ سے پتہ اور رقعہ لیکر جہاں آپ کے صاحبزادہ حضرت شاہ ہادی کو ان کے چچا مستعلی نے اپنی نگرانی میں رکھا تھا جا پہونچے، حضرت شاہ ہادی اپنے والد بزرگوار کا رقعہ دیکھ کر ان دونوں نو واردوں کے ہمراہ ایران کی طرف روانہ ہوئے، جب حسن بن صباح کو آپکی آمد کی اطلاع ملی۔ تو آپ معہ معززین شہر اور احباب کے بڑی دور تک استقبال کے لئے پہونچے اور آپکا شاہانہ استقبال کرتے ہوئے آپ کو "الموت" لے گئے، حضرت شاہ نزار نے سن ۴۹۰ھ میں مصر ہی میں قیدخانہ میں وفات پائی اور ان کے انتقال کے بعد حضرت شاہ ہادی جب تخت امامت پر متمکن ہوئے تو یہ مژدۂ جانفزا الموت ہو یا ایران ہو جس جس جگہ اسمٰعیلی آباد تھے انھیں پہونچا دیا گیا کہ الموت میں، اسمٰعیلی امام کی حکومت قائم ہے اور تخت امامت پر حضرت شاہ ہادی متمکن ہو کر اپنے فیضان امامت سے اسمٰعیلیوں کو مستفیض فرما رہے ہیں۔

قلعہ الموت سن ۴۸۳ھ سے سن ۶۵۴ھ تک اسماعیلیوں کے تصرف میں رہا اور بعد میں منگولیم تاتاری ہلاکو خاں جو منگولیا سے اپنا لشکر لیکر مسلمانوں کی سلطنتوں کو تباہ کرنے کیلئے نکلا تھا۔ قلعہ الموت پر حملہ آور ہوا اس جنگ میں بارہ ہزار اسمٰعیلی سپاہی قتل ہوئے اور فریق ثانی کا بھی نقصان بہت زیادہ ہوا لیکن عساکر اسمٰعیلیہ کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے بالآخر اسمٰعیلیوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے الموت کے بعد ہلاکو خاں اپنے ظالم لشکر کے ساتھ بغداد پر ٹوٹ پڑا اور بنی عباسیہ کے حکمراں کو شکست دیکر خود حکمراں بن بیٹھا اور جب موت نے اس کے ظلم وستم کا استیصال کیا تو ایلا خان نے اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا لیکن ایلا خاں زیادہ عرصہ تک ضلالت و گمراہی میں نہ رہا اور بہت جلد مشرف بہ اسلام ہوا اور اسطرح یہ تاتاری مسلمان کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

ISMAILI P. PRESS, BOMBAY, 9.

Vi-Spring Mattress

THESE MATTRESSES SPELL COMFORT

THE "RESTANZA"
A new Vi-Spring, Interior Spring Mattress, covered Blue floral ticking and hand sewn walls.
Sizes: 6'-3" × 3'-6" Rs. 110 each.

VI-SPRING PILLOWS
Sizes: 26" × 18" Rs. 30 each
" 28" × 18" Rs. 3ɔ each
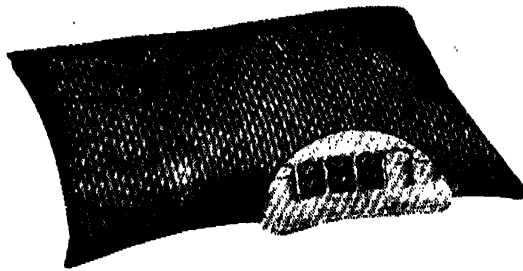
"VITO" MONARCH
A Vi-Spring Product luxurious spring overlay mattress covered Pink Floral Ticking.
Size: 6' 3" × 3' Rs. 110 Each
" 6' 3" × 3' 6" " 125 "
" 6' 3" × 4' 6" " 150 "

"Vito" Mattress
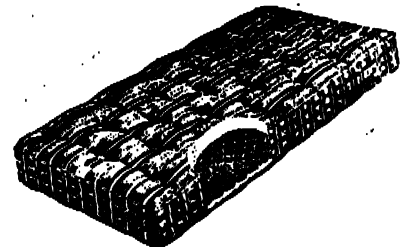
Elegant Napery from the Leading Manufacturers.
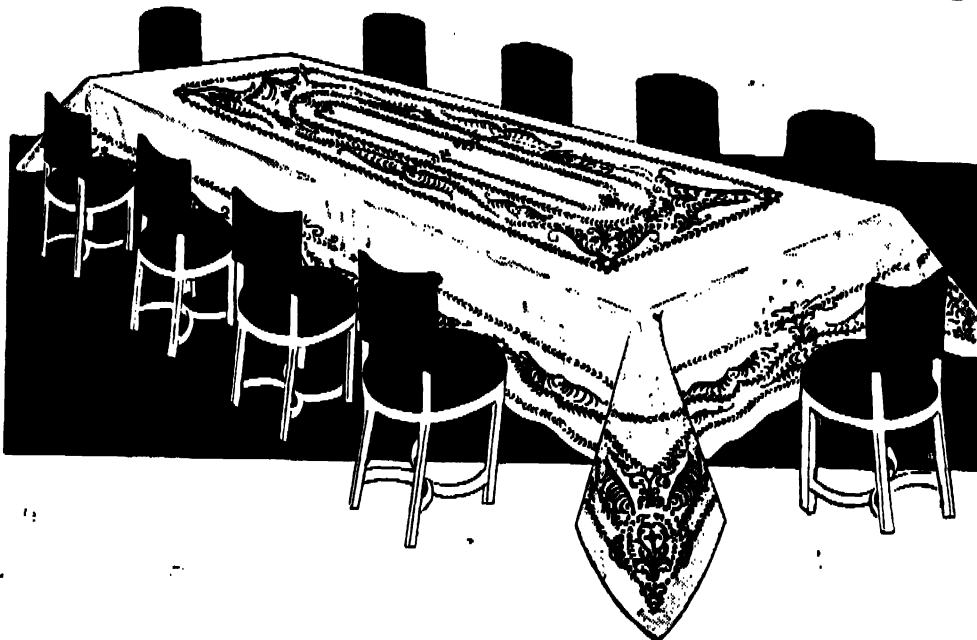
THE "TULLERIES" DOUBLE LINEN DAMASK
A beautiful quaility double linen Damask with rich satin finish in a pure and faultless weave Cloths. Sizes: 72 x 72, 72 x 90, 72 x 108, 72 x 126, 72 x 144 ins.
Rs. 39-8, 49-8, 57-8, 67-8, 79-8 each.

THE "DURATA" COTTON DAMASK
Highly mercerised and with a rich satin finish.
Napkins. Sizes: 22 x 22, 24 x 24 ins.
Rs. 22-8, 24-8 doz.
Cloths. Sizes: 72 x 72, 72 x 90, 72 x 108 ins.
Rs 21/-, 26 8, 32-8 each.

THE "COLLEEN" COTTON DAMASK
A heavy double cotton Damask highly mercerised as sketch on left.
Napkins. Sizes: 22 x 22, 24 x 24 ins.
Rs 24-8. 27-8 doz.
Cloth Sizes: 72 x 72, 72 x 90, 72 x 144 ins.
Rs. 14-8. 18-8. 39-8 each.

THE "ADAMS" LINEN DAMASK.
Highly finished double linen Damask in Adam design. Napkins. Size. 24 x 24 ins.
Rs. 39-8 doz.
Cloths. Sizes: 72 x 72, 72 x 90, 72 x 108 ins.
Rs. 29-8, 38-8, 45-8 each.
Cloths. Sizes: 90 x 90, 90 x 108, 90 x 126, 90 x 144, 90 x 180, 90 x 216.
Rs. 52-8, 62-8, 75/-, 87-8, 107-8, 129 each.

THE "ADAMS" LINEN DAMASK

EVANS, FRASER & Co. FORT HOUSE, Bombay

بیگم سر آر کی بالڈوِل اور پرنس علی خان!

ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہ نے ۱۹۱۰ء میں مصر میں اطالوی شہزادی پرنسس تھریسا کے ساتھ شادی کی تھی جس کے بطن سے پرنس علی سلمان خان ۱۳ جون ۱۹۱۱ء کو اٹلی میں واقع شدہ تورین شہر میں تولد ہوئے۔ جن کا پیارا نام علی رکھا گیا۔ اور پورا نام پرنس علی سلمان خان ہے۔ آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو اپنا ولیعہد مقرر کیا ہے۔ یہ نامی گرامی اور خوش سیرت و نیک طینت جوان صاحب پرنس علی خان جب موجودہ جنگ چھڑی۔ اس وقت فرنچ لمڑی میں بحیثیت لمڑی کپتان کے شامل ہوئے لیکن جب فرانسیسی فوجوں نے ہتھیار ڈالدئے تو اس اطلاع سے جبکہ آپ سیریا میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے آپ کا دل مکدر ہوا اور فرنچ عسکری سردار ڈی گولے کے ہمراہ سیریا چھوڑ کر قاہرہ پہونچے اور عساکر برطانیہ میں کپتان کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اور چند ہی روز کے بعد کمانڈر ان چیف نے آپ کی خوبیوں اور بہترین خدمات سے متاثر ہو کر آپ کو میجر کا اعلیٰ وارفع عہدہ تفویض کیا۔ آپ فی الحال قاہرہ میں جنگی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور آپ کی اہلیہ محترمہ پرنسس علی سلمان خان بھی میدانِ جنگ میں انتہائی دلیری سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں سرگرم ہیں۔ اس تصویر میں پرنس علی سلمان خان کمانڈر انچیف سر آر، کی بالڈوِل کی بیگم سے گفتگو میں مصروف نظر آرہے ہیں اور آپ کی پشت پر پرنسس علی خان عینک لگائے ہوئے دکھائی دے رہی ہیں!!!

اوائل جنگ یورپ میں جس کی بنا گذشتہ جنگ عظیم میں شکست خوردہ جرمنوں کی نازی کشتی کے ناخدا اور دشمن جمہوریت ہرہٹلر نے اپنی ہوس عالمگیری کو پورا کرنے اور امن عالم کو خاک میں ملاکر دنیا کی آزاد قوموں کو اپنا حلقہ بگوش بنانے کے لئے ڈالی ہے۔

برطانیہ عظمیٰ کی حکومت کے اس مجاہدانہ جذبہ عمل کے ماتحت جس میں یورپ اور دنیا کی آزاد طلب اقوام کی امن و آزادی کا راز مضمر ہے فرزندان اسماعیل یعنی اسماعیلیوں کے روحانی پیشوا اور مظہر اقدس ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہ کے لخت جگر نور نظر اور جانشین ولی عہد پرنس علی سلمان خان نے اپنے قبلہ گاہی محترم کے بہ جذبات فرزند اور خاندان شجیع اسماعیل کے ایک بہادر نونہال کی حیثیت سے اپنی ملی ملکی مدافعت کے لئے جو اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ پیش کیا ہے وہ اس بے شمار مالی امداد کے بعد جو ان کے قبلہ گاہی محترم ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہ نے برطانیہ عظمیٰ کے تاجدار محترم کے حضور میں جنگی امداد کے لئے پیش کیا ہے موصوف کا تاریخی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اپنی ذات اقدس کو ایک نوجوان بہادر محب ملک وملت حکومت سپاہی کی صورت میں پیش کرتے ہوئے آپ... پہلے پہل برطانوی لشکر میں کپتان کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ بعدہٗ ترقی کرتے کرتے ماشاءاللہ آج میجر کے اعلیٰ عہدے پر فائز المرام مصر میں برطانی افسران علیٰ کے ساتھ مدافعانہ سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

ہز سیرین ہائی نس میجر پرنس علی شاہ آغا خان کی ذاتی پیش کش اور ایک سپاہی کی حیثیت سے دنیا کے مسلمان اور باجذبات نوجوانوں کے لئے جو اپنی بہادری کے جوہر پیش کرنے کے متمنی ہوں۔ ایک فقید المثال پیش کش کہی جا سکتی ہے تاریخ میں ایسے باپ اور بیٹے مشکل ہی سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی بہترین وفاداری وہمدردی کا ثبوت دیتے ہوئے کبھی اپنی دوست حکومت کی ایسی مالی وجانی خدمت کا فریضہ ادا کیا ہو۔ جو تاریخ میں یادگار رہنے والا ہے۔

برطانیہ عظمیٰ کی بالآخر اپنے دشمنوں پر فتحیابی کی یہ بھی ایک بین دلیل کہی جا سکتی ہے کہ اس کی مالی وجانی خدمات اس کو اپنے دشمنوں کے مقابل میں حق بجانب دیکھ کر ہز ہائی نس سر آغا خان جیسے ایک عظیم الشان اور وسیع الخلقت وملت کے روحانی پیشوا ادا کر رہے ہیں ہز سیرین ہائی نس پرنس علی سلمان خاں آغا خاں جہاں تک علم وادب سیاست وفراست اور فنون سپہ گری کا تعلق ہے اپنے والد ماجد کی طرح جو مشرق ومغرب میں اپنی شہرت وعزت سے یکتائے روزگار کہے جا سکتے ہیں آفتاب آمد دلیل آفتاب کی مصداق ہیں۔ ان کو اسپورٹ سے بھی زیادہ دلچسپی ہے اس کے علاوہ اپنے معتقد ملت اسماعیلیہ کے فرزندوں کی تعلیمی ترقی سے بھی اتنی ہی جس کی مثال ان کی متعدد اسماعیلی درسگاہوں کو قابل قدر مالی پیش کش اور اپنی جیب خاص سے ہو سکتی ہے آج کل آپ کا بہترین مشغلہ ہے وہ دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کی تدابیر پر غور وخوض اور آپ کی جنگی اور سیاسی خدمات ایک بہترین تجربہ کار نوجوان کی حیثیت سے یقین ہے کہ حکومت برطانیہ عظمیٰ کے تاجدار معظم اور وزرائے جنگ وامرائے لشکر کی نگاہوں میں قابل داد ہوں گی۔

دنیا کی موجودہ اور آئندہ اسمٰعیلی نسلوں کے نوجوان اور مجاہدانہ جذبات کے حامل فدائی نوجوانوں کے لئے جس طرح ان کے روحانی تاجدار ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہ کی ذات اقدس واعلیٰ اپنی دینی ودنیوی عظیم المرتبت خدمات سے قابل فخر ہے اسی طرح یقین کامل ہے کہ ان کے جانشین ولی عہد ہز سیرین ہائی نس میجر پرنس علی سلمان خاں کی ذات والاصفات بھی قابل فخر وتقلید ہوگی۔ برطانیہ عظمیٰ کی حکومت کے لئے ہز ہائی نس سر آغا خاں بالقابہ اور ان کے فرزند محترم کی ذاتی قربانیاں اس عظیم الشان پیش کش اور کامیابی کی حامل ہیں جن میں اس کثیر التعداد قوم کی تقلید وتائید کا راز پنہاں ہے۔ جو اپنے روحانی پیشوا کے ایک اشارہ پر دشمن کے بالمقابل ہو کر قیامت برپا کر سکتی ہے۔

ہمیں امید واثق ہے کہ اسمٰعیلیوں کے روحانی تاجدار اور ان کے نور نظر کی دلی ہمدردی اور بیش بہا خدمات بالآخر حکومت برطانیہ عظمیٰ کی عظیم الشان فتوحات کی باعث ثابت ہوں گی اور ہماری یہی دلی دعا ہے کہ حکومت برطانیہ عظمیٰ کو جلد سے جلد اپنے دشمن پر فتح حاصل ہو۔

آغا محشر شیرازی

محسوساتِ ماہر

شاعر حیات حضرت ماہر القادری کے کلام کا پہلا مجموعہ حال میں عبدالحق اکاڈیمی شاہراہ عثمانی حیدرآباد دکن نے بہترین گلیزڈ پرنٹنگ پیپر اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شایع کیا ہے حجم (۲۴۴) صفحات مجلد قیمت دو روپیہ حضرت ماہر القادری کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں آپ ملک کے ایک مشہور ادیب اور قادر الکلام شاعر ہیں آپ کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو نفسیات کے تمام پہلوؤں پر قابل رشک عبور حاصل ہے ورنہ محسوسات کی مصوری آسان کام نہیں اس کے لئے ذوق فکر اور وجدان صحیح کی ضرورت ہے اور اس پر دہلی کی پاکیزہ ٹکسالی زبان گویا سونے پر سہاگہ ہے ہم ناظرین الاصلاح کو یقین دلاتے ہیں کہ اس مجموعہ میں آپ کو وہ تمام خوبیاں نظر آئیں گی کہ جن کو شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھا گیا ہے اس لئے ہم اس کے مطالعہ

عسیر الحصول تصاویر!
زیر نظر عید الفطر نمبر میں شائع شدہ مندرجہ ذیل سہ رنگی، تاریخی، رجالی، دلکش اور عسیر الحصول تصاویر سے اپنے مکانات، محافل، دفاتر اور دکانوں کی زینت اور آرائش بڑھائیے۔
فہرست تصاویر
(۱) خانۂ کعبہ میں جشن عید الفطر
(۲) سر آغا خاں اور ملکہ معظمہ
(۳) بیگم سر آغا خاں بالڈویل اور پرنس علی خان
(۴) صاحبقران تیمور یا تیمرلنگ ابن امیر طراغان کا دربار
(۵) ملکۂ نور جہاں کی شہنشاہ جہانگیر کی رہائی کے لئے مہابت خاں سے معرکہ آرائی
اور حمیدہ بانو بیگم
(۶) قلعۃ الموت
(۷) شیواجی دربار عالمگیر میں
(۸) فاطمی سپہ سالار غازی جوہر
(۹) معز دین اللہ خلیفۂ بنی فاطمی اور باشندگان مصر
(۱۰) شیر افگن اور شیر کی جنگ
(۱۱) میری (مریم) دربار اکبری میں
(۱۲) بیگم سلطان اور سلطانہ چاند بی بی محاربۂ احمد نگر میں
(۱۳) شہنشاہ جہانگیر اور ملکۂ نور جہاں
(۱۴) شہنشاہ اکبر اور ملکۂ جودھا بائی
(۱۵) عالمگیر اور ہاتھی کی جنگ شاہجہاں کے حضور میں
(۱۶) محمد بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار ہند اور غازی محمد بن قاسم ہندوستان کا فاتح اول
(۱۷) کنور کرن سنگھ ملکۂ نور جہاں کے حضور میں
(۱۸) زین خان کوکا اکبر کا چھوٹا رتن
(۱۹) تان سین اور دیپک راگ
(۲۰) اعلیٰ حضرت حضور نظام اور نواب بہادر اعظم جاہ علاؤالدین او، بی، ای،
اگر آپ درحقیقت اپنے عشرتکدہ اور دفاتر وغیرہ کو عریاں اور مخرب اخلاق تصاویر سے پاک رکھنا چاہتے ہیں تو آج ہی مندرجہ بالا تصاویر خرید کر انہیں اپنے فریم کی زینت بنائیے یہ تصاویر زر کثیر صرف کرنے کے بعد حاصل کی گئی ہیں اور جن کا بازار میں دستیاب ہونا ناممکن ہے دکانداروں اور ایجنٹوں کے لئے یہ ایک زریں موقع ہے لہذا اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں اور اپنی اولین فرصت میں آرڈر دیکر خاطر خواہ فائدہ اٹھاویں
شرح نرخ
ایک ہزار تصاویر ۔۔۔۔۔ ۶۰ روپے۔ پانچسو تصاویر ۔۔۔۔۔ ۳۵ روپے۔ سو تصاویر ۸ روپے۔ پچاس تصاویر ۵ روپے
پچیس تصاویر ۳ روپے ایک درجن ڈیڑھ روپیہ فی تصویر ۴
(نوٹ) ۲۵ عدد سے کم کا وی پی نہ ہوگا۔ ۲۵ عدد سے کم تصاویر طلب کرنے والوں پر تصاویر کی قیمت اور محصولڈاک کی پیشگی ترسیل لازمی ہے۔
ٹیلیفون نمبر ۲۳۴۵۰
(مزید تفصیل کے لئے لکھئے)
ٹیلیفون نمبر ۲۳۴۵۰
اسماعیلی پرنٹنگ پریس ڈونگری بمبئی نمبر ۹

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

خیامیات

از نوری [illegible]

(۱)

تھوڑی سی شراب اور دیدے ساقی! ہاں رُوحِ شباب اور دیدے ساقی
تلوار ابھی ذہن کی بے جوہر ہے دیدے اسے آب اور دیدے ساقی

(۲)

ہستی ہے شرابِ ارغوانی میری، شیشے کی پری ہے زندگانی میری
مستی ہستی ہے اور ہستی مستی ساقی کی نگاہ ہے جوانی میری

(۳)

مے ہی سے کھلے ہیں مجھ پہ رازِ ہستی اب میں نے سُنی صدائے سازِ ہستی
بیہوش پڑا ہوا ہوں میخانہ میں... کرتا ہوں ادا آج نمازِ ہستی

(۴)

دنیا سے جو بہ حال تباہ جائیں گے افسوس کہ سب وہ بے نشاں جائیں گے
سمجھا ہی نہیں کبھی انھوں نے یہ راز آئے تھے کہاں سے اور کہاں جائیں گے

(۵)

اک جام ہے لاکھ عالمِ دیں کا جواب اک گھونٹ ہے اس کا شاہیٔ چیں کا جواب
دُنیا میں شراب سے زیادہ کیا ہے یہ تلخ ہے لاکھ جانِ شیریں کا جواب

(۶)

مے قوتِ جسم و قوتِ جاں ہے مجھکو مے کاشفِ اسرارِ نہاں ہے مجھکو
اب میں نہ کروں فکرِ دین و دنیا کی تلاش اک گھونٹ حصولِ دو جہاں ہے مجھکو

(۷)

معلوم ہے کچھ کہ او زمانہ پرور تو کب سے گیا ہے ہم سے رخصت ہوکر
بھیجا ہے کسی کو اور نہ پوچھا ہم کو جو کچھ کہ گزر رہا ہے تجھ بن ہم پر

(۸)

آلام سے پاک ہو ہی جانا ہے ہمیں، مرکھپ کے ہلاک ہو ہی جانا ہے ہمیں
تو آبِ حیات میں ڈبو دے ساقی آخر کو تو خاک ہو ہی جانا ہے ہمیں

(۹)

اے مایۂ نازِ زندگانی آجا اے زینت و عیشِ عمرِ فانی آجا
مرتے ہیں ہم اور تجھکو آتا نہیں رحم آجا کسی طرح اے جوانی آجا

(۱۰)

ہم حسرتِ شباب ہو کر گزرے عالم سے بہت خراب ہو کر گزرے
یا سیلِ شراب تھی... جوانی.... نوری یا سیلِ صدائے آب ہو کر گزرے

(۱۱)

بچپن کا وہ دورِ امتحانی ....گزرا ہنگامۂ مستیٔ جوانی......گزرا
پیری تھی، سو پیری بھی گئی اے نوری القصہ تمام عہدِ فانی.... گزرا

(۱۲)

کیسے ہو نماز اور وضو کیوں کر ہو دامانِ خیال میں رفو کیوں کر ہو
عریاں جذبات اور آغازِ شباب ایسے میں خیالِ آبرو کیوں کر ہو

(۱۳)

اے نوریٔ بیتاب ٹھہر جا... دم بھر.. نومید نہ ہو جان نہ کھو گھبرا کر،
ممکن ہے کہ آجائے نہ آنے والا کھاتا ہے فلک طرح طرح سے چکر

(۱۴)

بیخود ہوں مگر خودی کا اثر باقی ہے دیدار بقدرِ یک نظر باقی ہے
ہے اب بھی دماغ عجز عالی.... نوریؔ تکمیلِ جنوں میں کچھ کسر باقی ہے

(۱۵)

سرشار زمانہ کو بنانے والے مخمورِ نظر سے مُسکرانے والے
آغازِ سرور پہ تبسم مت کر انجامِ خمار بھول جانے والے

(۱۶)

اک کیفِ نظر ہے گو جوانی میری اک دورِ سرور ہے گو جوانی میری
سرگرمیٔ عمر کو بڑھا دیتا ہے اک رقصِ شرر ہے گو جوانی میری

(۱۷)

کچھ لطفِ سرور و بے ہوشی لینے دے تھوڑی سی شراب اور پی لینے دے
مایوسیٔ سرمدی بجانِ حسرت دو چار گھڑی مجھے بھی جی لینے دے

(۱۸)

گھبرے ہے کہاں کی تنگ دستی توبہ جاتا رہا لطفِ مے پرستی... توبہ
فطرت کی ستم ظریفیاں کیا کہیئے مہنگی ہے شراب اور سستی توبہ

(۱۹)

پروازِ خیال کو دکھاؤں کیوں کر معراجِ کمال کو دکھاؤں کیونکر
تجھ بے تو عروسِ معنیٰ... نوری میں اس کے جمال کو دکھاؤں کیونکر

میرزا غالب کی آخری جھلک

خاص برائے الاصلاح عید نمبر

از حضرت خواجہ عبداللطیف شمیم بھیروی مدیر ہفت روزہ سنیما بمبئی

ایک مختصر تمثیل

مکالمے اور گانے .... از میرزا غالب
افسانہ۔ مناظر و ترتیب .... از شمیم بھیروی
نمائش کنندگان .... ادارہ الاصلاح بمبئی

پیشکش شمیم !!

افراد :۔ میرزا غالب .... ہندوستان کا شاعر اعظم
فرخ میرزا .... لوہارو کے نواب
میرزا کے کچھ دوست :۔ جمعدار۔ کمشنر۔ ہیکش (میرزا کا ایک شاگرد) ایک سپاہی۔ مہاجن۔ رئیس وغیرہ۔

نوٹ :۔ یہ تمثیل نہایت عجلت میں لکھی گئی ہے۔ الاصلاح کا عید نمبر مرتب ہو رہا ہے وقت کم۔ صفحات کی قلت۔ مدیر الاصلاح کے ارشاد کی تعمیل۔ بہرکیف موضوع نیا ہے نامکمل تمثیل لکھ رہا ہوں جو عید نمبر کے بعد مسلسل الاصلاح میں چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ موجودہ مضمون کے لئے ارباب نظر سے اپنی کوتاہیوں پر معذرت خواہ ہوں (شمیم)

منظر ـــــ غالب

حکیم محمد حسن خان کا مکان صحن میں ایک پرانا ایرانی قالین بچھا ہے۔ ایک کونے میں گاؤ تکیہ کے سہارے مرزا غالب لیٹے ہیں۔ زردی مائل سفید رخسارے۔ بڑی بڑی چوڑی پیشانی۔ گالوں پر چیچک کے انڈے کہیں کہیں تلوں کے ہلکے نشان۔ سر منڈا ہوا وضع مغلئی قطع ایرانی۔ بادام کے شیرے کی پیالی سامنے رکھی ہے۔ سامنے کے طاق پر اولڈ ٹام کی گرد آلود بوتلیں رکھی ہیں۔ دروازے کی طرف نگاہیں لگی ہیں۔ قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی چونک اٹھتے ہیں۔

میرزا :۔ کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں جو پوچھنے آ گئے۔

نووارد :۔ (ہاتھ جوڑ کر) حضرت آپ میرے داتا اور میں آپ کا پوتا ہوں۔

میرزا :۔ تمہاری تنخواہ آئی۔

نووارد :۔ میری تنخواہ نہیں آئی حضرت روز آ کا جان سے کہتا ہوں لوہارو چلو اپنی

حکومت چھوڑ دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے۔

میرزا :۔ سبحان اللہ! یہ فہم درست اور یہ طبع سلیم۔ فرخ میرزا! تم فرخ سیر ہو۔

فرخ سیر :۔ آپ کی عنایت ہے قبلہ!

(میرزا فرخ لوہارو کے والی۔ بچپن کا زمانہ تھا۔ غالب سے مراسم تھے اور بہت قریبی۔ وہ میرزا کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ ہیکش داخل ہوتے ہیں)

ہیکش :۔ آداب بجا لاتا ہوں۔

میرزا :۔ جیتے رہو۔ کہو کیسے ہو۔

ہیکش :۔ قبلہ! بی بی کو اور لڑکے کو بہرام پور میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہوں۔

میرزا :۔ کچھ ہاتھ آیا۔

ہیکش :۔ حضرت بہت دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔

میرزا :۔ میاں! کتاب کوئی سی ہو۔ اس کا پتہ کیوں کر لگے لوٹ کا مال کھتریوں میں بک گیا اور اگر سڑک پہ بکا تو میں اور تم کیا دیکھو ؎

بر دل نفس اندوہ گیتی بسر آرید ٭ گیرید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آرید

فرخ میرزا :۔ حضرت! کتابوں کا کیا رونا یہاں تو ؎

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

قصہ مختصر یہ ہے کہ قصہ ہی تمام ہوا۔

میرزا :۔ وہ جمعدار صاحب بھی آ گئے۔

(جمعدار صاحب آداب بجا لا کر بیٹھ جاتے ہیں اور میرزا سے مخاطب ہوتے ہیں)

جمعدار :۔ نواب صاحب! تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے حضور کے متعلق جو ... ارشاد ہو۔

میرزا صاحب :۔ بھائی! مجھے نقشے میں نہ رکھو۔ میری کیفیت کی عبارت یہ لکھو اسداللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا اور نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنیل براون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔

(جمعدار صاحب اور فرخ مرزا قرینے سے اٹھتے ہیں میرزا صاحب کے ہاتھ چومتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں)

میکش پاؤں داب رہے ہیں میرزا آہستہ آہستہ سو جاتے ہیں۔

دوسرا منظر ــــــ صبح کا وقت

(میرزا کی قیامگاہ بادام کا شیرہ پی رہے ہیں۔ اور آنسو بہا رہے ہیں)

میرزا صاحب :- اس چرخ کجرفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا ملک و مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے آہ! ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے

بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

(ایک سپاہی داخل ہوتا ہے)

سپاہی :- نواب صاحب کو کمشنر صاحب نے بُلا بھیجا ہے۔

(نواب صاحب پالکی منگاتے ہیں اور سپاہی کے ہمراہ ڈپٹی کمشنر کے یہاں پہنچتے ہیں)

تیسرا منظر ــــــ کمشنر کے حضور میں

(میرزا صاحب کو کرسی دی جاتی ہے اور مزاج پرسی کے بعد!)

کمشنر صاحب :- غدر میں تم اول تھے!

میرزا صاحب :- میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ دس برس سے حکیم احسن خاں کے مکان میں رہتا ہوں حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں۔ روپوشی نہیں۔ بلایا نہیں گیا دار و گیر سے محفوظ ہوں۔

کمشنر صاحب :- حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب تمہارے باب میں لکھتے ہیں ان کا حال دریافت کرکے لکھو سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکۂ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو۔

میرزا صاحب :- حضور! قدیم سے پنشن اور خلعت پاتا ہوں۔ بحال ہو جائے۔ دعا گو ہوں۔

کمشنر صاحب :- (ذرا ہنس کر) تم نے بادشاہ پر سکہ کہا

میرزا صاحب :- میں نے سکہ کہا نہیں۔ ذوق نے دونوں سکے گزرانے اور بادشاہ نے پسند کئے یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت کئے جاتے ہیں۔ اور اگر سکے کہے تو اپنی جان اور حرمت بچانے کے لئے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں ہاں! صاحب گولہ کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالہ بھی جانب دار نہیں۔

(کمشنر صاحب قہقہہ لگاتے ہیں۔ میرزا صاحب کو گلے سے لگا کر رخصت کرتے ہوئے کہتے ہیں)

کمشنر صاحب :- تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار رہے گا۔

میرزا صاحب :- سبحان اللہ ؎

کارساز ما بفکر کار ما ❊ فکر ما در کار ما آزار ما

چوتھا منظر ــــــ پنشن کی بحالی کے بعد

(غالب اپنی قیامگاہ پر۔ چند پرانے ملنے والے بیٹھے ہیں)

ایک :- میرزا صاحب! شکر ہے آپ کے استقلال نے فتح پائی۔ پنشن بحال ہوئی۔

میرزا صاحب :- ہائے! صفدر کیا پوچھتے ہو۔ پنشن پانے کا استحقاق بھی رکھتا تھا

میکش :- حضور! مجموعہ بے آب و رنگ چھپنے میں دیر کیوں ہو۔

میرزا صاحب :- نہیں کتابیں چھپنے کی پڑی ہے۔ ہائے وہ محفل ہی اجڑ گئی۔ کچھ دوست کچھ معشوق۔ کچھ شاگرد سودہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔

میکش :- ع اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔

میرزا صاحب :- ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مرونگا تو میرا کوئی رونیوالا بھی نہ ہوگا۔

میکش :- میرزا صاحب! کیا کیا قیامتیں نہ ٹوٹیں۔ مگر آپ کو تو وبائے عام میں مرنا بھی عار رہا۔

میرزا :- میری جان کیا کہوں وہ کیفیت تھی کہ نہ جزا نہ سزا نہ لطف نہ قہر۔ روٹی ملے تو شراب بند کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ہے اس کی فکر نہیں۔ کتابیں چھپوانے کو کہتے ہو کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں شراب پینے کو نہیں جاڑے آتے رہے اور لحاف و توشک کے لئے گرمی اندیشہ میں جلتا رہا۔

(میکش اٹھتے ہیں کہ میرزا کا ایک پرانا ملنے والا مہاجن آجاتا ہے)

میرزا صاحب :- خوب آئے۔ پنشن بحال ہو گئی۔ تمہاری پائی پائی چکا دی جائے گی آج کی شراب کے لئے دام قرض دیدو۔

مہاجن :- نواب صاحب کے دم قدم کی خیر۔ روپیہ کی کیا کمی۔ پنشن کی بحالی کی مبارک (جیب سے روپئے نکال کر میرزا صاحب کے قدموں میں رکھ دیتا ہے۔ میکش شراب لاتے ہیں۔ دور شروع ہو جاتا ہے۔)

غالب :- اب پینے کا کیا مزا آہ (اور غزل بہم سروں میں چھیڑ دیتے ہیں)

ظلمتکدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے ❊ اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال ... ❊ مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی ... ❊ مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ❊ دامان باغبان و کف گلفروش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق نوائے چنگ ❊ یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں ... ❊ نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ❊ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

(اس شعر پر میرزا کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ مہاجن نبضوں پر ہاتھ رکھتا ہے اور آہستہ سے کہتا ہے ؎

مہاجن :- اسد اللہ خاں تمام ہوا

آہ دریغا وہ رند شاہد باز

(میرزا کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں ہاتھ میں جام جم کر رہ گیا ہے اور لبوں سے ایک مرتعش صدا نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔)

(بقیہ صفحہ ۶۴ پر دیکھئے)

خاص برائے الاصلاح عید نمبر

مغالطہ

چند ادبی رنگین اور رومان انگیز خطوط

از حضرت رشدی مدیر معاون روزنامہ "ندیم" (بھوپال)

میں ابھی اپنے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ڈاکیہ نے چار چھ اخبار۔ دو تین رسالے اور ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ اخبارات اور رسائل کو تو میں نے میز پر رکھدیا۔ اور لفافہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ لفافہ ارغوانی رنگ کا تھا جس پر نہایت خوشنمائی کیساتھ میرا پتہ درج تھا۔ جو رسالہ "مریخ" کی معرفت آیا تھا۔ بڑی دیر تک میں اسکو دیکھتا رہا۔ اس پر لکھا ہوا پتہ کسی نسوانی قلم کی تراوش معلوم ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں نے لفافہ چاک کیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

محترمی تسلیم !!

میں نے گذشتہ ہفتہ کے "مریخ" میں آپ کا افسانہ "عروس حیات" پڑھا۔ افسانے تو میں پڑھا ہی کرتی ہوں۔ مگر آپ کے اس افسانے تو کچھ اور ہی حقائق کا انکشاف کیا اور میں ایک نئی دنیا میں کھو گئی۔ پلاٹ کی ندرت اور نازک تشبیہات کچھ اس قدر بھلی معلوم ہوئیں کہ میں بلا ارادہ یہ خط لکھنے بیٹھ گئی۔ افسانہ کے ہر ہر کردار سے واقعیت ٹپک رہی ہے۔ اگر آپ کا افسانہ سچ مچ کوئی اصلی واقعہ ہے تو اس سے مجھے ضرور مطلع فرمایئے ـــ جی ہاں مبارکباد تو قبول کیجئے اس کی کامیابی کی ! جواب کی منتظر رہوں گی۔

ص۔ خ

معرفت "مریخ" دہلی

مجھے اس خط کے انداز تحریر سے بڑی حیرت ہوئی اور سب سے زیادہ تعجب انگیز یہ امر تھا کہ یہ کس طرح اندازہ لگایا گیا کہ افسانہ سچا ہے خیر ! میں "ص، خ" کی نظمیں اور افسانہ اکثر مریخ میں پڑھا کرتا تھا۔ اور میں اس میں شمس انصاری کے نام سے افسانے لکھا کرتا تھا۔

اب میرے سامنے یہ سوال تھا کہ اس انوکھے خط کا جواب دوں [illegible] ـــ ! ایک دل [illegible] کبھی یہ خیال ہوتا [illegible] کیا ہے۔

آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل اس کا جواب لکھ دونگا۔ اس کے بعد میں اخبارات کے مطالعہ میں محو ہو گیا

دوسرے دن میں نے مندرجۂ ذیل خط روانہ کیا :-

محترمہ "ص، خ"

تسلیم !!

خط ملا، آپ نے میرے افسانے کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کا شکریہ ! "عروس حیات" کو بڑی حد تک حقیقت سے لگاؤ ہے آپ کی "حقیقت شناس" نگاہ کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا زندگی کے راز ہائے پنہاں کی جو جھلک آپ نے افسانہ میں دیکھی ہے اس کی اہمیت بھی کچھ ایسی ہی ہے !

شمس انصاری

اب مجھے اپنا اخلاقی فریضہ ادا کر دینے کے بعد ایک خفیف سی بےچینی اس امر کے لئے تھی کہ جواب آئے گا یا نہیں۔ مجھے جواب میں یہ خط موصول ہوا :-

محترمی !

آپ کے جذبات کی تہہ دل سے قدر کرتی ہوں میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ہندوستان کا مشہور افسانہ نگار میرے خط کا جواب بھی دیگا یا نہیں ؟ لیکن اب مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ نہایت بلند اخلاق اور اعلیٰ کیریکٹر کے انسان ہیں۔ میں ایک بات اور پوچھنا چاہتی ہوں ـــ بشرطیکہ آپ بھی منظور کریں میں جانتی ہوں کہ آپ اس کو نہ ٹالیں گے ! جی ـــ میری استدعا ہے کہ آپ میرے افسانوں کی اصلاح فرما دیا کیجئے گا ـــ میں یہاں سے آپ کی خدمت میں افسانے بھیجا کروں گی۔ اور آپ اصلاح کے بعد مجھے روانہ کر دیا کریں۔

تکلیف دہی کی معافی چاہتی ہوں !

"ص، خ"

مجھے ان خطوط سے ایک قسم کی دلچسپی سی ہو گئی تھی اور میں ہر خط لکھنے کے بعد ایک نئی خوشی اور ایک نیا جذبہ اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ میں نے اس کا جواب ارسال کر دیا۔

محترمہ "ص، خ"

آپ نے افسانوں کی اصلاح کا بار مجھ پر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے خوب ! مبارکباد پیش کر کے اب آپ نے مجھے اور شرمندہ فرمایا ہے "کل مریخ" آیا تھا اس میں آپ کا افسانہ شمع بہت خوب ہے۔ اس میں آپ نے "فلسفۂ محبت" کا جس خوبی کے

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ)

عہدِ رفتہ کی یاد!

خاص الاصلاح عید نمبر کے لیے

از حضرت علامہ
مولانا محمود اسرائیلی

گل کی آشفتہ سری کو نہیں بھولا ہوں ابھی (۱) حُسن کی جلوہ گری کو نہیں بھولا ہوں ابھی
اپنی اُس بے خبری کو نہیں بھولا ہوں ابھی۔
کچھ نہ کچھ سر میں محبت کا جنوں ہے اب تک

چشمِ الفت نہ رہی، ذوقِ نظر بھی نہ رہا (۲) سوزِ دل بھی نہ رہا، دردِ جگر بھی نہ رہا
نالہ کیا! نالے کا مشتاق اثر بھی نہ رہا
ٹیس سی پھر یہ مرے سینے میں کیوں ہے اب تک؟

حُسن گلزار کو مٹی میں ملا دیکھا ہے (۳) مہر کو چادرِ ظلمت میں چھپا دیکھا ہے
چہرۂ ماہ کو محرومِ ضیا دیکھا ہے
حُسن بے مثل ہے اِن کا کہ فزوں ہے اب تک!

بزمِ گردوں میں کوئی جلوہ عیاں دیکھا تھا (۴) مشتری کو وہاں کیا رقص کناں دیکھا تھا؟
تم نے ان شوخ نگاہوں سے کہاں دیکھا تھا؟
تارے ہیں سکتے میں اور چرخ نگوں ہے اب تک!

لبِ غنچہ میں صبا نے جسے پھونکا تھا..... کبھی (۵) گوشِ الفت میں وفا نے جسے پھونکا تھا کبھی
جسمِ آدم میں خدا نے جسے پھونکا تھا کبھی
میرے کانوں میں وہ جاں بخش فسوں ہے اب تک

رنگِ بیداد کہیں آہ نہاں ہوتا ہے؟ (۶) آہی جاتا ہے وہ نظروں میں جہاں ہوتا ہے
سات پردوں سے بھی چھن چھن کے عیاں ہوتا ہے
چرخ کو دیکھ کہ آلودۂ خوں ہے اب تک!!

ٹھوکریں بخت کی ٹلتی ہیں سنبھلنے سے کہیں (۷) چرخ رکتا ہے نئی چال کے چلنے سے کہیں؟
فطرتِ دہر بدلتی ہے بدلنے سے کہیں
جیسے پہلے تھا وہی حال زبوں ہے اب تک!

سا تھ تجربہ کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

شمس انصاری

اچھے انصاری صاحب !

میں یہ خط ذرا تاخیر سے لکھ رہی ہوں۔ وجہ یہ ہوئی کہ میں اپنی خالہ جان کے یہاں مہمان چلی گئی تھی۔ مجھے یہ معلوم کرکے از حد خوشی ہوئی کہ آپ نے "اصلاح" کا "حق" وعدہ کسی نہ کسی طرح کر ہی لیا ہے۔ بہت بہت شکریہ! ایک بات اور ڈرتے ڈرتے پوچھنا چاہتی ہوں دیکھیے کہیں ناراض نہ ہو جایئے گا۔ کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ ؟؟ افسانہ ارسال خدمت ہے جواب کی طالب

"ص۔ خ"

میں یہ خط پاکر "محترمہ" کی جرأت اور استفسار سے بڑا چونکا۔ کچھ نہ کچھ چھپا ہی جاتا ہے۔ میں نے تیسرے دن اس کا جواب لکھ دیا:۔

"ص، خ !"

اُمید کہ آپ بعافیت ہوں گی۔ آپ نے اصلاح کے لئے جو افسانہ بھیجا تھا۔ اس کو بعد اصلاح روانہ کر رہا ہوں۔ آپ نے تو شادی کا سوال کرکے مجھے حیرت زدہ ہی کر دیا۔ اب تک میرے ذہن میں یہ سوال ہی نہیں آیا تھا "ازدواجی زندگی" میں ابھی تو بندہ نے قدم ہی نہیں رکھا ہے۔ آگے کی خبر خدا جانے !۔ اور کیوں کیا یہی سوال میں آپ سے کر سکتا ہوں ؟؟؟

شمس انصاری

مجھے اب "ص، خ" کے وجود سے ایک حد تک محبت ہو گئی تھی۔ جب خط آتا تو میرا دل نہ معلوم کیوں۔ زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ ہر وقت خط کا منتظر رہتا۔ آج چوتھا دن تھا میرے خط کا جواب ندارد تھا۔ صبر و قرار میں ایک کشمکش سی ہو رہی تھی۔ شام کی ڈاک سے جواب آیا :۔

انصاری صاحب !

افسانہ مل گیا۔ "اصلاح" کا شکریہ آپ کے "خلوص" نے میرے دل پہ ایک "روشن" نقش ثبت کر دیا ہے۔ کل میں شملہ گئی تھی۔ برف پوش چوٹیوں پہ بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ رومان انگیز ہوا کے جھونکے دل و دماغ کو معطر کیے دے رہے تھے اور ان وقت نہ جانے "کس کا" تصور مجھے آ رہا تھا اور ایک ٹیس سی اٹھ رہی تھی۔ ارے یہ میں نے بیخودی میں کیا لکھ دیا معاف کیجیے گا ! ہاں میری بھی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں ایک ہی درجہ پر ہوں ؟

آپ کی

"ص۔ خ"

ان خطوط نے اب عشق و محبت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی غائبانہ شکل سے محبت ہو گئی تھی۔ کبھی یہ کہتا کہ نا معلوم وہ کیسی ہو؟ کیا پتہ کس شکل و صورت کی ہے۔ مگر ایک چیز مجھے صاف نظر آ رہی تھی وہ تھا طبائع کا اشتراک ! دل میں ایک خلش تھی ایک چنگاری جسکو میں جس قدر بجھانے کی کوشش کرتا تھا اس سے اور زیادہ شرارے نکلنے لگتے تھے۔ پندرہ بیس روز سے اس کا بھی کوئی خط نہیں آیا تھا۔ (باقی صفحہ ۹۰ پر دیکھیے)

خاص برائے الاصلاح عید نمبر!

فرزندانِ اسلام متوجہ ہوں

از حضرت خالد اختر افغانی مُدیر طارق ویکلی بمبئی!

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ✤ ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی، ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی، ایک ✤ کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی، ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں
علامہ اقبالؒ

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم (ترجمہ:- تحقیق مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ پس اصلاح کر دو اپنے بھائیوں کی) یہ مسئلہ ایک مدت سے مسلم قائدین اور مسلم عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے کہ مسلمان متفرق کیوں ہیں گروہ درگروہ کیوں ہیں۔ فرقوں اور ذاتوں میں کیوں اُلجھے ہوئے ہیں۔ حنفی۔ وہابی۔ شیعہ اور اسی قسم کے دیگر فرقوں میں کیوں بٹے ہوئے ہیں۔ مسلمان کے لئے تو قدرت کا حکم تھا۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (ترجمہ:- اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور گروہ اور ٹولوں میں منقسم نہ ہو) پھر اس حکم خداوندی کے بعد مسلمانوں کا فرقوں کی صورت میں نظر آنا ہماری سمجھ سے کہیں بالا ہے۔ آج سے پہلے ہزارہا مضامین اس مسئلہ پر لکھے جا چکے ہیں۔ اور ابھی یہ معلوم اور کتنے لکھے جائیں۔ ہزارہا لکچر دئے جا چکے ہیں اور نہ معلوم اور کتنے دئے جائیں۔ لیکن افسوس مسلمان ابھی تک وہیں نظر آرہا ہے۔ جہاں آج سے سو سال پہلے تھا۔ اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ یہ مضامین پڑھنے اور تقریریں سننے میں محو رہے اور دیگر قومیں نہ صرف بیدار ہوئیں بلکہ منزل کو جا لیا۔

میں سب سے پہلے اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ کہ مسلمان جنھیں اقلیت سمجھ لیا گیا ہے وہ اقلیت نہیں۔ بادی النظر میں ہندوستان میں انھیں اقلیت کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر صوبۂ بلوچستان کو ملا کر گنا جائے تو مسلمان ہندوستان کے پانچ بڑے صوبوں میں اکثریت کے مالک ہیں۔ اور اگر اس طرح بھی نہیں تو دوسری صورت میں بھی وہ ہندوستان میں ہی سب سے بڑی۔ سب سے اہم۔ سب سے غیور۔ سب سے زیادہ با اثر اور سب سے زیادہ بہادر اقلیت ہیں اور اقلیت بھی وہ اقلیت جو ہمیشہ اکثریت پر غالب آئی۔ آج کا مسلمان بھی انھیں غازیوں کی اولاد ہے جو "بدر" "خندق" "احد" "حنین" "قادسیہ" "یرموک" اور "بیت المقدس" میں اقلیت میں تھے۔ مگر دنیا کی آنکھوں نے دیکھا۔ کہ اس اقلیت نے دنیا کی اکثریتوں کو اپنے قدموں پر جھکایا ظالموں کو ان کے کیفر کردار تک پہونچایا۔ مظلوموں کی حفاظت کی راعی اور رعایا کو صحیح طریقہ پر زندگی گذارنے کے گر بتائے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو آج ہندوستان میں اقلیت کا خیال ہوا کیوں کھائے جا رہا ہے۔ انہیں ہندوستان کی دوسری اقلیتوں پر قیاس کرنا کھلی ہوئی نادانی اور دانستہ حماقت ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ خود اس قوم میں اب "جوہر قابل" ہی نہیں۔ ورنہ اس کی سطوت وشوکت میں کسکو کلام تھا۔ ہے، اور ہوگا۔

آج ہندوستان کا مسلمان کلام الٰہی سے روگرداں ہوکر وہاں اسکو بھی کچھ ملنا چاہیئے تھا۔ جو مل رہا ہے اگر یہ نافرمان جو بوکر گندم کے کاٹنے کی امید رکھے تو یہ سراسر حماقت ہے۔ حدود اللہ کو پھاندنے کے بعد بھی مسلمان اس کی رحمتوں کا متمنی ہے۔ ارشادِ الٰہی کو ٹھکرانے کے بعد بھی مسلمان سلطنت و اقتدار چاہتا ہے نبیؐ سے روگردانی کے بعد بھی مسلمان امارت وسطوت کے خواب دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر کوئی عقل سلیم اسے باور کرنے کو تیار نہیں۔ کہ اللہ سے انحراف کرنے والا اسی دنیا میں پنپا ہو۔

آج ہندوستان کے مسلمان اہلحدیث۔ حنفی۔ شیعہ۔ شافعی۔ حنبلی وہابی۔ وغیرہ سینکڑوں فرقوں میں منقسم ہیں۔ خیر یہ تو کسی حد تک جائز بھی قرار دئے جا سکتے ہیں۔ چونکہ اس صورت سے ہر شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہر شخص کا خیال ہے کہ شاید اسی راستہ پر چلنے کے بعد مجھے فداہٗ ابی امی ... کا قرب اور آب کوثر نصیب ہوجائے۔ میں اسے ایک حد تک جائز سمجھتا ہوں۔ مگر مصیبت تو وہ سیاسی اختلافات ہیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کو ہندوستان کے باہر کی دنیا میں بھی ذلیل کر رکھا ہے۔ آج ہندوستانی مسلمانوں میں "خلافت۔ جمعیت العلماء۔ احرار۔ مومن۔ اتحادِ ملت۔ تحریک شخاکسار۔ آزاد مسلمان اور مسلم لیگ۔ وغیرہ۔ سیاسی جماعتوں میں رسہ کشی ہو رہی ہے اور ہر ایک انجمن یا پارٹی کے چند کارکن اپنے ذاتی مفاد کے لئے قوم کو تباہی کے گڑھوں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ کچھ بے جا نہ ہوگا اگر میں یہاں ان انجمنوں کے متعلق اختصار کے ساتھ کچھ عرض کر دوں۔ سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں مسلم لیگی ہوں۔ مگر دوسرے مسلمانوں سے بھی عناد نہیں۔ کیونکہ؎ گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نبھائے جا رہا ہوں میں

اب اس زمانہ میں جبکہ ہر ایک قوم ایک مرکز پر جمع ہو رہی ہے۔ ہندو خود کو ہر طرح منظم کر رہا ہے۔ بلکہ کر چکا۔ اچھوتوں نے اپنا ایک پلیٹ فارم بنا لیا۔ سکھوں نے اپنا محاذ قائم کر لیا۔ پارسیوں کی تنظیم میں کسی کو کلام نہیں۔ پھر سمجھ کام نہیں کرتی کہ یہ بقول ربانی بھائی بھائی آپس میں کیوں نہیں ملتے۔ کیا ذاتی وجاہت و منفعت کے لئے۔ کیا ان چند سیمیں و روپہلی ٹکڑوں کے لئے جن کی قدر زمانے نے کبھی نہ کی۔ آج اگر خلافت اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سے نکل کر مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کی طرف آ جائے تو اس میں فائدہ کس کا ہے؟ خلافت کا اور کارکنان خلافت کا۔ چونکہ خلافت کا مشن مسلمانوں کا اتحاد تھا۔ اگر جمعیت العلماء مسلم لیگ کے ساتھ مل جائے تو فائدہ کس کا جمعیت العلماء کا۔ چونکہ وہ جانتی ہے کہ "مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں" اسے معلوم ہے کہ "اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو" وہ اس کی تبلیغ کرتی ہے کہ "کانہم بنیان مرصوص" بن کر رہو۔ اگر احرار اپنے چند نفوس کی ٹولی کو توڑ دے تو کیا حرج ہو کیا اس کا یہ مشن نہیں کہ مسلمان متحد و منظم ہو کر اپنی حالت کو سنواریں اور آنے والے حادثات کے لئے اکٹھے ہو کر سینہ سپر ہوں۔ کیا اتحاد ملت نہیں جانتی کہ مساجد کا احترام احراری بھی کرتا ہے اور جمعیت العلماء بھی لیگی بھی کرتا ہے اور آزاد مسلمان بھی پھر کیا وجہ ہے کہ چند اکابرین نے قوم کو پچاسیوں گروہوں میں منقسم کر رکھا ہے۔ حالانکہ دعوئے مسلمانی ہے۔

اکابرین و قائدین اسلامیہ سے عرض ہے کہ وہ آیت مذکورۃ "فاصلحوا بین اخویکم" پر غور کریں۔ دل کی روشنی اور ہنگامی پلیٹ فارموں پر نہیں۔ بلکہ رات کی تاریکی اور مساجد کی محرابوں میں۔ پھر اگر ان کے دل میں ایمان کی رمق بھی موجود ہے۔ تو انھیں احساس ہوگا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں وہ غلط ہی نہیں بلکہ اغلط ہے۔ وہ اپنے معصوم حواریوں کو جس طرف لئے جا رہے ہیں۔ وہاں اللہ کی رحمت نہیں بلکہ ایک زحمت ہے۔ غربت ہے۔ افلاس ہے۔ ذلت ہے۔ رسوائی ہے۔

قوم کی عزت کے خواہاں گوش ہوش سے سنیں کہ عامۃ المسلمین قریب قریب بیداری کے قریب پہونچ چکے ہیں۔ اس وقت انھیں سچے وفادار اور مدبر قائد کی ضرورت ہے۔ اگر انہیں اس وقت صحیح قائد مل جائے۔ تو دیگر اقوام کی بیداری نے جو رشک ان کے دلوں میں پیدا کیا ہے۔ اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ کیا قوم کے رہنما میری ان گزارشات پر توجہ فرمائیں گے۔

آخر میں میں مسلم عوام سے عرض کروں گا کہ آپ گروہوں اور فرقوں میں منقسم ہونے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ بھائی بھائی بننے کے لئے۔ اللہ کی رسی کو اکٹھے ہو کر پکڑنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ سمجھئے اور دیکھئے کہ زمانہ کیا کر رہا ہے اس کی روش تمہارے ساتھ کیا ہے۔ اس نے تمہیں کہاں پہونچا دیا ہے ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے "اپنی قوم کے لوگو"....
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(علامہ اقبال ؒ)

عوام میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کی بجائے بمصداق "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" موجودہ سیاسی قائدین کی ہمہ دانی اور جاہ و حشمت طلب ذہنیت کا انسداد اور اصلاح لازمی ہے۔ یکتا۔

بقیہ میرزا غالب کی ایک جھلک

اے شوق اب اجازت تسلیم ہوش ہے

پانچواں منظر

(میرزا کی میت رکھی ہے۔ رُوح عالم بالا میں میرزا آفتہ اور مفتی صدرالدین آزردہ کی روحوں کے ساتھ گلے مل رہی ہے)

میرزا آفتہ:- پیر و مرشد! آنکھیں راہ تکتے تکتے پتھرا گئیں۔ حضور کے بغیر جنت کا مزا نہ تھا۔

میرزا غالب:- میرزا آفتہ! میری جان مفتی صاحب اور تم مل گئے تو پھر مجھے دنیا مل گئی۔ لیکن ایک رنج ہے کہ (اپنی ایک غزل چھیڑ دیتے ہیں)

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ؛ بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے ؛ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن .... عشق ؛ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی ؛ کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

آتا ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا طوفان بلا میرے بعد

چھٹا منظر

(حسرت و شیفتہ اور حالی میت اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ حالی مرثیہ پڑھتے چلتے ہیں اور ایک روشنی جنازے کے سامنے رقصاں ہے "اردو" کی پری جنازے پر پر افشانی کئے محو پرواز ہے اس کے پروں کے پھڑ پھڑانے سے ایک آواز حالی کے مرثیہ خوانی میں مدغم ہوتی جا رہی ہے۔

آواز:-

کوئی کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

پردہ گرتا ہے۔

قطعات عید!!

پھر لو تو رنج و اُمید سے آج
سن رہے ہیں کہ حق عید ہے آج
کون ہے کس کو ہم لگائیں گلے؟
عید اپنے لئے وعید ہے آج

عید کے دن خوشی منا لیجئے
اپنی بیتی بھی پھر کچھ بھلا لیجئے
آپ ادھر کن نگاہ سے کیوں ہیں؟
کاش آئے، گلے لگا لیجئے

یکتا

افغان اسنو
زعفران سنو
جلد کو
مخمل کے مانند ملائم، چمکدار، مہاسوں سے محفوظ، جھریوں سے پاک
خوبصورت و دیدہ زیب اور رکھنے کے لئے
AFGHAN
SNOW
افغان اسنو
ہر شریف اور معزز گھرانے میں مستعمل ہے اس اسنو میں وٹامین اے شامل ہے
جس سے چہرہ اور جسم کی تمام جلد
جلدی امراض سے محفوظ....
رہتی ہے اور خوبصورتی میں
روز افزوں اضافہ ہوتا رہتا ہے
سول ایجنٹ:-
پاٹن والا لمیٹیڈ عبدالرحمن اسٹریٹ بمبئی نمبر ۳
شاخ:- کلکتہ
SOLE AGENTS:—
PATANWALA LTD
Abdul Raheman Street
BOMBAY, 3.

رائل ٹاکیز کے
کارپردازان تمام
مسلم بھائیوں کو
عید کی مبارک
باد دیتے ہیں
اوقات روزانہ
حسب معمول
چھ اور ساڑھے
چھ بجکر دن
عہد حکومت
تاتار کا سازش
اور چٹپٹی محبت پر مشتمل
قصہ !!
خان اعظم نے شاہی خاندان
کو تہس نہس اور قتل عام کرکے تخت حکومت
حاصل کیا۔ حمیدہ اور آسیہ پری چہرہ نازنینوں
کی اپنے عاشق احمد کے لیے کشمکش۔
احمد شہزادہ تھا یا لٹیرا اسے معلوم کرنے کے لئے۔
موہن پکچرس کا تاریخی شاہکار!!
تاتار کا چور
ملاحظہ فرمایئے
فلمی ستارے
یعقوب
اندورانی، خان
نواز، صادق،
گلاب، وتسلا کمٹھیکر،
میرا، ہارون، چودھری
اور ہیرالال، آپ کو
اپنی نرالی اداکاریوں سے
محظوظ فرمائینگے!
تاتار کا چور

شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نورجہاں

شہنشاہ جہانگیر کی ذات ستودہ صفات بحیثیت ایک عادل اور منصف کے چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ اس جلیل القدر شہنشاہ کی زندگی میں کئی واقعات ایسے بھی گذرے ہیں جو دلچسپ ہونے کے علاوہ سبق آموز و بصیرت افروز ہیں۔ شہنشاہ جہانگیر ۱۵۶۹ء میں مریم زمانی (جودہ بائی) کے شکم سے بمقام سیکری مفتخر بہ ولادت ہوئے اور چونکہ آپ سے قبل شہنشاہ اکبر کی اولاد اس عالم رنگ و بو کی متحمل نہ ہوسکی اس لئے آپ والدین اور شاہی لواحقین میں بہت زیادہ پیار و محبت سے پرورش پاتے رہے اور آپ صغر سنی کی عمر ہی سے سلیم کے پیارے نام سے بلائے جاتے تھے۔ اور سیکری میں خاص طور پر آپ نے بود و باش اختیار کر رکھی تھی۔

شہنشاہ جہانگیر راجہ بہارل کے صاحبزادہ راجہ بھگوانداس کی دختر نیک اختر بالاتی سے جو راجہ مان سنگھ کی بہن تھیں بیاہے گئے تھے۔ رانی بالاتی کے شکم سے شہنشاہ شاہجہاں نے ولادت پائی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد شہنشاہ جہانگیر نے ملکہ نورجہاں کو جو ابتداً مہرالنساء کے نام سے مشہور تھیں ۱۶۱۱ء میں اپنی زوجیت کا شرف بخشا۔

انگلینڈ کے کنگ جیمس کے فرستادہ سر طامس رو نے جب ہندوستان میں قدم رکھا تو اس نے جہانگیر کے دربار میں حاضر ہو کر ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اور حصول اجازت کے بعد ۱۶۱۲ء میں انگریزوں نے بمقام سورت ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی منڈی قائم کرتے ہوئے ہندوستان میں تاجرانہ حیثیت سے آمد و رفت شروع کر دی۔ شہنشاہ جہانگیر کا انتقال بمقام کشمیر ۱۶۲۷ء میں ملکہ نورجہاں کی زندگی ہی میں ہوا۔ آپ کی نعش نورجہاں کی ہدایت کے مطابق لاہور بھیجی گئی اور لاہور کے اس فرحت افزا باغ میں کہ جسے نورجہاں نے لگوایا تھا آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔ جہاں آج بھی ایک عالیشان مقبرہ اس جلیل القدر اور منصف شہنشاہ کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کر دیتا ہے۔ جہانگیر کے انتقال کے تقریباً ۲۰ سال کے بعد ۱۶۴۷ء میں ملکہ نورجہاں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور آپ بھی اسی باغ میں مقبرہ جہانگیر سے تھوڑے فاصلہ پر مدفون ہیں۔

ISMAILI P. PRESS BOMBAY, 9

از حضرت احسنؔ رضوی داناپوری

اے دلِ حیرت طلب دیکھ فریبِ نگاہ!
نکلیگی اب دھوپ یا پھیلیگی تنویرِ ماہ

ڈوب چکا آفتاب یا ہے طلوعِ سحر؟
ایک دھندلکا سا ہے شام ہوئی یا پگاہ

آج فضائے جہاں کیلئے ہے بے چراغ
سوزِ دروں کی قسم ظلمتِ دل ہے گناہ

نفس نہیں مطمئن روح نہیں برقرار
ایسے تہلکہ کے بعد وردِ زباں لا الٰہ

سجدۂ بے اعتماد داغِ جبیں ننگ و داغ
ایسی عبادت قبول؟ یعنی خدا کی پناہ

زلزلہ انگیز ہے ملتِ مہتمم کا حال
ہر سو فقیروں کی بانگ ہر سو یتیموں کی آہ

سینۂ بے سوز سے تا بہ حطیمِ حرم
شوقِ تغافل پسند جیسے نہ ہو رسم و راہ

مرکزِ وحدت پہ ہے آج بہت ازدہام
پھر بھی نظر آتی ہے سونی سی کیوں عیدگاہ

ٹوٹے ہوئے مقبرے آج سجائے گئے
جوہرِ ہستی ذرا فکرِ رسا کو سراہ

طبعِ عقیدت گزیں موت سے ہے ہمکنار
زندگی جہد و عمل اور یہ ملت تباہ

صرف تواریخ یا قبر تک اسکی ہے دوڑ
فخر کن یادگارِ محرمِ اعزاز و جاہ

خلوتِ سرد سے جلوتِ فطرت میں آ
وسعتِ دنیا کو دیکھ کسکی ہے یہ بارگاہ

تیرے عزائم ہیں سست تیرے ارادے ہیں پست
کم سے کم اتنا تو کر پاسِ وفا کو نباہ

لذتِ گم گشتگی دیکھ چکا ڈھونڈ چکا!
جزو سے محکم ہے کل تو ہی گدا تو ہی شاہ

سہل ہے بعد از غروب آئے نکل آفتاب
تیرا امامِ جلیل عقدہ کشا بو تراب

از حضرت عزیزؔ صدیقی رامپوری نائب ناظم بزم اردو بمبئی

تھی وبالِ دوش اپنی زندگی جنکے بغیر
مانگی جاتی تھیں دعائیں موت کی جنکے بغیر

کھویا کھویا سا رہا کرتا تھا میں شام و سحر
ہوتی تھی محسوس ہر شئے میں کمی جنکے بغیر

چین دم بھر کو بھی آتا تھا نہ جنکی دید کے واسطے
رہتی تھی آنکھوں پہ ہر اک بیکلی جنکے بغیر

جنکی فرقت رات دن پیہم رلاتی تھی مجھے
جھوٹوں بھی آتی نہ تھی لب پر ہنسی جنکے بغیر

پھیکی پھیکی سی نظر آتی تھی ہر شب چاندنی
زرد رو تھا آسماں پر چاند بھی جنکے بغیر

رات بھر تارے گنا کرتا تھا جنکی یاد میں
اور دن بھر رہتی تھی اک بیخودی جنکے بغیر

مضطرب رہتا تھا جنکے ہجر میں ہر وقت دل
آنکھ میں ہر وقت رہتی تھی نمی جنکے بغیر

سوزِ پنہاں بن گیا تھا اک عذابِ مستقل!
رہتی تھی اک آگ سی دل میں لگی جنکے بغیر

بن گیا تھا ہر نفس پیغامِ غم میرے لیے
مل گئی تھی خاک میں ہر اک خوشی جنکے بغیر

کردیا تھا اسقدر مایوسیوں نے مضطرب
چین کیسا اڑ گئی تھی نیند بھی جنکے بغیر

کہہ نہیں سکتا تھا میں کچھ بھی کسی غمخوار سے
ہوگیا تھا حالِ دل ناگفتنی جن کے بغیر

فکر میں ڈوبا رہا کرتا تھا لیل و نہار
درد میں ہوتی نہ تھی کچھ بھی کمی جنکے بغیر

ہوگئی تھی صحبتِ احباب سے نفرت مجھے
رخ پہ چھائی رہتی تھی افسردگی جنکے بغیر

تھا ہلالِ نو بھی میرے واسطے اک نیشتر
یعنی مجھکو تھی محرم عید بھی جن کے بغیر!

اب وہی ہیں چارہ فرمائے غمِ فرقت عزیزؔ
زندگی کی کچھ توقع ہی نہ تھی جن کے بغیر

بقیہ تالمود!

ایک شخص نے ایک عورت کو نگاہِ بد سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھوٹ گئیں

موت:۔ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو مٹھیاں بند ہوتی ہیں۔ مگر جب مرتا ہے تو ہاتھ کھلے ہوتے ہیں۔ یعنے کارزارِ حیات کے آغاز میں انسان سب کچھ لینا چاہتا ہے۔ مگر اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جاتا۔

کہا جاتا ہے سکندر بابِ جنت تک پہونچ گیا۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا تو رضواں نے پوچھا۔ کون کھٹکھٹاتا ہے؟ سکندر، اس نے پوچھا کون سکندر؟ جواب ملا سکندرِ اعظم۔ فاتحِ عالم۔ رضوان نے کہا کہ یہاں صرف خدا کے نیک بندے داخل ہو سکتے ہیں تم نہیں۔ اس پر سکندر نے کہا کچھ نشانی ہی دے دو تاکہ میں لوگوں سے کہدوں کہ میں یہاں تک آیا تھا۔ رضواں نے آنکھ کا کا واک دیدیا سکندر نے حکمائے عصر کو وہ کاواک پیش کیا۔ اس کو تولا گیا تو ہر چیز ہلکی تھی۔ آخر ایک حکیم نے چٹکی بھر خاک ڈال دی تو وہ پلہ کاواک سے بھاری ہو گیا۔ یعنی حریص انسان کی نگاہ میں ساری دُنیا حقیر ہے صرف خاکِ گور اس کو بھر سکتی ہے

غم موتی:۔ مرنے والوں کا غم نہ کرو وہ تو دائمی مسرت حاصل کر چکے۔ زندہ لوگوں کا رنج کرو کہ غموں سے دبے جاتے ہیں۔

امثالِ یہود

(۱) بُرا کہنے کو مُنہ نہ کھولو۔

(۲) دوسروں سے وہ سلوک نہ کرو جو تم ان سے پسند نہ کرو

(۳) گدھے کو گرمی میں جاڑا لگتا ہے۔

(۴) پہلے سیکھو اور پھر سکھاؤ۔

(۵) اپنی خطائیں دیکھنے والے کم ہیں۔

(۶) طیور ہوا بھی بخیل سے نفرت کرتے ہیں۔

(۷) خیرات پر بسر کرنے سے بہتر ہے کہ مردار کی کھال اتارا کرو۔

(۸) کمزور دیوار میں نقب لگایا جاتا ہے۔

(۹) جگہ سے آدمی کی عزت نہیں۔ آدمی سے جگہ کی عزت ہے۔

(۱۰) مفت کی دوا مفید نہیں ہوتی۔

(۱۱) گلاب کانٹوں میں کھلتا ہے۔

(۱۲) علماء کے مباحثہ سے علم کی ترقی ہوتی ہے۔

(۱۳) جھوٹا سچ بھی بولتا ہے تو جھٹلائے جانے کی سزا پاتا ہے۔

(۱۴) خموشی عقل کی محافظ ہے۔

(۱۵) بولو کم کرو زیادہ

(۱۶) غم کی حالت میں جو کچھ زبان سے نکلے اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہونی چاہئے

تمثیلِ حیات

ایک مالدار آدمی نے اپنے غلام کو آزاد کر کے ایک جہاز مالِ تجارت دے کر رخصت کر دیا۔ اتفاق سے وہ جہاز ڈوب گیا۔ مگر غلام تیر کر ایک جزیرہ میں پہونچا۔ لوگوں نے استقبال کر کے بادشاہ بنایا۔ غلام نے ان سے اس عزت افزائی کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا ہم نے خدا سے دُعا کی تھی کہ ہم کو ہر سال ایک آدمی ہم پر حکومت کرنے کو بھیجدیا کرے۔ ہر سال ایک آدمی آتا ہے اور سال بھر حکومت کرتا ہے۔ اس کے بعد ہم لوگ اس کو ایک ریگستان میں بھیج دیتے ہیں۔ مگر دورانِ حکومت میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ اس ریگستان کو آباد کرے۔ غلام نے اس نصیحت پر عمل کیا اور روزانہ کچھ مزدور بھیجتا رہا انھوں نے ریگستان کو چمن بنا دیا۔

مالدار آدمی سے مراد خدا ہے جس نے اپنے غلام رُوح کو دنیا کے دارالعمل میں بھیجا ہے۔ مزدور نیک اعمال ہیں اور ریگستان مستقر بعد الموت ہے دنیا میں انسان برہنہ پیدا ہوتا ہے اور برہنہ جاتا ہے۔

مرافعہ

یہود کے دیوانی مقدمات تین غیر سرکاری پنچوں یا تین سرکاری حاکموں کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اگر مدعی اپنے حق سے زیادہ طلب کرتا تھا تو مقدمہ بالکل ہار جاتا تھا۔ اگر اتفاقِ آرا ممکن نہ ہوتا تو جس طرف دو فیصلے کرتے وہی جیت جاتا۔ فوجداری مقدمہ کی تفتیش ۲۳ ججوں کے سامنے ہوتی تھی۔ ان میں سے رہائی کے لئے ۱۲ کی رائے کافی تھی۔ مگر سزا دینے کو کم از کم ۱۳ درکار تھے۔ قوانین سزا زیادہ سخت نہ تھے۔ کتنے ہی جرائم ہوں ایک سزا سب کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی کسی سزا کے ساتھ جرمانہ نہیں ہو سکتا تھا۔ سزائے تازیانہ ۳۹ ضرب سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ سزائے قتل سنانے سے پہلے جج کو روزہ رکھنا پڑتا تھا اور حکم سُنانے کے بعد عدالتِ عالیہ اس مقدمہ پر غور کرتی تھی مقتل کو جاتے جاتے بھی ملزم نئے عذر پیش کر سکتا تھا اس وجہ سے سالہا سال تک قتل کی نوبت نہ آتی تھی ایک عدالت نے سات سال میں ایک قتل کا حکم دیا تھا اس لئے اس کو خونی عدالت کہا جانے لگا تھا۔

اعیادِ یہود

مُسلمانوں کی طرح یہودیوں کا مہینہ بھی رویتِ ہلال سے شروع ہوتا ہے۔ مگر بجائے آسمانی شہادت کے نجوں کی شہادت زیادہ وقیع سمجھی جاتی ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی ایک دن کا فرق ہونا لازم ہے ہر تین سال کے بعد ایک مہینہ بوند کا بڑھا کر سال شمسی سے مطابق کر لیتے ہیں۔ اسی لئے ان کا سال بالعموم ستمبر یا اکتوبر میں شروع ہوتا ہے۔ سال کے بارہ مہینے کے نام یہ ہیں (۱) تشری (۲) ہشوان (۳) کسلیو (۴) طبعث (۵) شباط (۶) آذار (۷) نیساں (۸) ایار (۹) سیوان (۱۰) تموز (۱۱) آب (۱۲) ایلول۔

اسال ۲۲ ستمبر کو نوروز ہے۔ ان کے نزدیک حضرت آدم کی پیدائش اسی دن ہوئی اور اسی مہینہ کی ۱۲ تاریخ کو گوسالہ پرستی کا گناہ معاف کیا گیا۔ یہ روز توبہ کہلاتا ہے اس لئے یہ دونوں دن نہایت اہم ہیں۔ پہلی تاریخ سے بارھویں تاریخ تک خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔ ۵ تاریخ سے عید خیام شروع ہوتی ہے ایک ہفتہ تک جشنِ مسرت منایا جاتا ہے۔ دوسرا بڑا تہوار عید فسح ہے جو الیشر کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ یہ اس امر کی یادگار ہے کہ اس تاریخ میں بنی اسرائیل کو بخت نصر کے استبداد سے رہائی ملی تھی۔ یہ تہوار نیساں کی ۱۴ تاریخ کو منایا جاتا ہے اس کے پورے پچاس دن کے بعد دوسرا تہوار ۶ سیوان کو احکام الٰہی ملنے کی یادگار میں منایا جاتا ہے۔ کسلیو کی ۲۵ تاریخ سے آٹھ دن تک مشعلیں جلائی جاتی ہیں۔ پہلے دن ایک اور دوسرے دن دو اسی طرح روز بڑھاتے جاتے ہیں اس تاریخ میں

"اچھا تو آپ کیا لکھ رہے ہیں؟" آنکھوں میں شرارت بھر کر زیرِ لب مسکراتی کمرے میں داخل ہوتی ہوئی نیلا بولی۔

"اوہو آپ ہیں؟"

"جی ہاں"

"ارشاد؟"

"کچھ نہیں ذرا شو کو چلنا ہے۔ آپ کو بھی چلنا ہوگا۔ ذرا جلدی تیاری کیجئے بس فوراً"

"واہ فوراً کیسی عجیب ہو تم نیلا! میں ایک ضروری خط لکھ رہا ہوں۔ اپنی جی جی کو ساتھ ...... میں ذرا ...."

"اچھا تو جن صاحب کو یہ خط لکھا جا رہا ہے وہ کون سے تیس مار ہیں؟" کچھ ناراضگی اور کچھ ناز و انداز سے اس نے کہا۔

"تم کیا کرو گی جان کر نیلا! وہ میرا ساتھی ہے۔ کرشن۔ اس کی دوستی نے میری تعلیمی زندگی میں رُوح سا پھونک دی۔ مگر اب اس کے تذکرہ سے کیا حاصل۔ چھوڑو اس کی بات کو۔"

"اچھا تو کرشن بابو کو خط لکھنا میرے ساتھ چلنے سے زیادہ اہم کام ہے؟ اچھی بات ہے آپ کی مرضی" ایک لمبی سانس لے کر ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"نیلا تم بڑی ضدی ہو۔ اپنی جی جی سے بھی سہیلی" کنول نے قلم اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔

"کیوں نہیں۔ آپ کی ہاں میں ہاں جو نہیں ملاتی"

"اچھا چلوں گا۔ لیں! اب تو خوش ہو؟"

"یہ تو میں جانتی تھی کہ یہ سب آپ کے نخرے ہیں۔"

کنول زور سے ہنس پڑا۔ سالی بہنوئی کو منا۔ ہنستی ہوئی چل دی۔

"چائے تو لیجئے"

"ہاں ہاں لیلا! شکسپیئر کی پوری تنقید پڑھنی ہے۔ اور پھر ملٹن۔ کیٹس، بائرن...... بہت پڑھنا باقی ہے۔"

"بس آپ تو دن بھر کتابوں کی کہانی کہتے رہتے ہیں۔ کچھ شو کی بھی بات کیجئے یار۔ ..... میں رجنی تم شیام متوبڑ بالکل بکر تھا۔ اور ہاں آپ نے نیلا کی تازہ نظم دیکھی۔؟"

"اوہ مجھے ان باتوں کے لئے فرصت کہاں؟"

"اچھا؟ کیا آپ کی ساری زندہ دلی۔ سارا ذوق سو گیا؟"

"ذوق؟ اُسے قصداً سُلا دیا ہے۔ مجھے پاس ہونا ہے لیلا! میرا ادبی ذوق مجھے پاس تو کرا سکتا نہیں۔ دُنیا کی نگاہوں میں ادبی ذوق کی قیمت ہی کیا ہے۔ یہ دُنیا تو ادبی ذوق اور مشغلہ کو محض "شغل بیکاری" سے تعبیر کرتی ہے۔ آج سب سے بڑا آرٹ روپیہ اور سب سے بلند مرتبہ آرٹسٹ دولت مند ہے۔! اور آج کی دُنیا میں اس کا حاصل کرنا بغیر اعلیٰ تعلیم کے معلوم! اس لئے کچھ دنوں کے لئے میری زندہ دلی اور ادبی مذاق کو تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرو۔ اس سے چھیڑ کرنا چھوڑ دو۔ لیلا!"

لیلا کچھ کھوئی سی نیم وا آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔

کنول نے پھر کہنا شروع کیا۔ "جانتی ہو کرشن کو لیلا! جس کی میں نے تمہیں کبھی یاد دلائی تھی۔ اسے بھول نہ جانا لیلا۔ بڑا قابلِ قدر لڑکا ہے۔ دوست کیا ہے مجھے اپنا سب کچھ سمجھتا ہے۔ ہمیشہ بلند خیالات کا جال بنتا رہتا ہے۔ کالج کی رنگین فضا میں پروان چڑھنے والے نوجوان کرشن کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پہلو میں ہوا و ہوس سے پاک اور بے لوث دل ہوگا۔ اس کی ایک ایک بات سے ہونہاری ٹپکتی ہے۔ دُنیا کے پامال راستے سے بالکل الگ ہو کر وہ اپنی راہ نکالتا ہے اس میں ہمت اور طاقت ہے۔ اس کے عزم میں استقلال اور حوصلہ میں بلندی ہے۔... ارے دس بج گئے! مجھے بہت پڑھنا ہے تم جاؤ لیلا۔ اس نے تمہیں نمستے لکھا ہے......"

لیلا نے ایک بار اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اور پھر ٹیبل پر بکھرے ہوئے کتابوں کے انبار کو اور کھسکے ہوئے آنچل سے سر ڈھانکتی ہوئی آہستہ آہستہ کمرے سے باہر ہوگئی۔

امتحان ہزاروں کی قسمت کا فیصلہ کر کے ختم ہوگیا۔ آج کنول اور کرشن رخصت ہو رہے تھے۔ کنول بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اور کرشن کے آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ کنول نے ٹھنڈی سانس لے کر کہنا شروع کیا— "کنول تم نے میرے خیالات سنے ہیں۔ انہیں پرکھا ہے۔ کیا دنیا ان کی قیمت لگا سکے گی؟ انقلاب کے سوال پر ہم دونوں کی رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تو تمہیں ماننا ہی پڑے گا زندگی میں

بھی کسی نہ کسی رنگ میں انقلاب اور تغیر کا رونما ہونا ناگزیر ہی ہے۔ پھر سماج کے خیالات میں انقلاب کی آگ کیوں نہ بھڑکائیں؟ میں کورے انقلاب کو مشعل جلا کر ہنگامی سکون قائم کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں مستقل انقلاب، تغیر فانی تغیر جو سماج کی تمام آلائشوں کو خس و خاشاک کی طرح جلا کر خاکستر کر دے۔ اور سماج کے [illegible] سے ملک بھی وابستہ ہے۔ اس لئے سماج کی بیداری ملک کی بیداری ہے اور آج ملک اور سماج کو اصلاح و ترقی کے لئے مکمل انقلاب، مستقل انقلاب کی ضرورت ہے!!"

کنول ہمہ تن گوش بنا کرشن کا منہ دیکھ رہا تھا [illegible] تبنا ہی گیا۔ میری دلی آرزو ہے کہ ملک کا ہر فرد ترقی کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے میں [illegible] ذاتی" فلاح و بہبود کا تمنائی [illegible] ملک کے [illegible] دیش کی عظمت [illegible] میں کنول!

[illegible] کرشن تمہارے ساتھ [illegible] کر میں نے کسی قسم کا نقدان محسوس نہیں [illegible] میں نے تمہیں ہمیشہ [illegible] حقیقی بھائی [illegible] سچا دوست پایا۔ کرشن [illegible] کو بھول نہ جانا۔ ہاں مجھ سے ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے اس کے لئے معافی چاہتا ہوں "بھابی کو میری یاد دلانا ہوں!" کنول کا جواب الجواب گرم آنسوؤں کے قطروں میں [illegible] گنگنا رہا تھا۔

کئی سال گذر گئے......

کنول بی۔ اے۔ ایل ایل بی ہو کر بھی کامگار حیات نہ ہو سکا۔ وہ [illegible] تھا۔ سہیم [illegible] نے اسے شاعر بنا دیا تھا۔ اس کی نظموں میں کسی یاد [illegible] اس کے [illegible] گراہ تی تھی اور کسی کی زندگی سسکیاں لیتی تھی اس [illegible] کب تھا ضد [illegible] دنیا نے کتنا جکڑ لیا۔ عرصہ سے وہ اسے

خط تک نہیں لکھ سکا ہے۔ کبھی کبھی لیلا وہ بھولی بسری باتیں یاد دلا دیتی ہے وہ زندگی کی الجھنوں میں کھو سا گیا۔ پھر بھی اس نے اپنے ذوق اور حس کو فنا نہیں ہونے دیا۔ اور انہیں کی بدولت تو وہ مصنف اور قانون داں ہو کر بھی شاعر کا میاب شاعر ہے اسکی نظمیں ادبی صحائف میں شائع ہو کر اسے شاعر ہونے کا "ڈپلوما" نہیں دیتیں۔ اس کی نظمیں تو دل کی دنیا میں طوفان برپا کر کے جذبات، خیالات کی رنگین قوری سے بندھ کر بھی چھوٹ جاتی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی حسن اتفاق سے وہ صفحہ قرطاس پر بھی کسی کو دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ لیلا داد دیتی ہے اور پھر کاغذ چاک کر دیا جاتا ہے

آج کنول کے دل میں ایک طوفان اضطراب برپا ہے گذرے ہوئے دنوں کی یاد کے نقوش ابھر رہے ہیں۔ اس کے دل کے کانوں میں کہیں دور بہت دور سے ایک مدہم سی آواز آ رہی ہے۔ کنول کرشن کو اتنی جلدی بھول گئے وہ بھول لینے کی چیز ہے؟

"ناشتہ کر لیجئے" لیلا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ابھی ابھی میں کرشن کو یاد کر رہا تھا"

"کچھ دنوں کے لئے انہیں یہیں بلا لیجئے نا"

"ہاں لیلا۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں"

وہ لکھنے کی ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا۔ لیلا کرسی پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

لیلا! اس ننھے سے آبشار کی زندگی بھی کتنی حسین ہے بڑی بڑی چٹانوں کے دلوں کو تھپکتا اٹھلاتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ قدرت جنگلی پھولوں سے دامن بھرا افسانوی صبح اس کا استقبال کرتی ہوگی۔ وہ صرف مسکرا دیتا ہوگا اور پھر اپنی دھن میں لگ جاتا ہوگا۔ لیلا کرشن ایسے مقامات کا بڑا شیدائی تھا۔ وہ چاہتا تھا سنسان جنگل ہو اور اس کے حسین خیالات کی پرواز ---!"

"اس کے آنے سے خوب لطف رہے گا۔ لیکن میں اس سے تمہاری ساری

(بقیہ صفحہ ۹۶ پر)

کیفِ تغزل!

خاص الاصلاح (از حضرتِ ہدایت حیدری گوالیاری) عید نمبر کیلئے

کاہشِ جانِ حزیں آپ کی فرقت دیکھی
اک قیامت سی قیامت دمِ رخصت دیکھی

شکوۂ جور پہ آج ان کی یہ حالت دیکھی
کچھ جھلکتی ہوئی آنکھوں میں ندامت دیکھی

تیرے مہجور نے رو رو کے قیامت ڈھا دی
خواب میں جب تری ہنستی ہوئی صورت دیکھی

جس کے حصہ میں نہ ہوں درد و الم رنج و محن
اے فلک ایسی بھی تو نے کوئی قسمت دیکھی

آسماں کانپ اٹھا زمیں لرزی اجل شرمائی
تم نے حسرت سے جو بیمار کی حسرت دیکھی

اب اُسے کچھ مری بینائی کا احساس ہوا
اس نے جب بزم میں پروانے کی حالت دیکھی

امتحاں گاہِ محبت ہے یہ دنیا یعنی،
دو گھڑی کو نہ یہاں چین کی صورت دیکھی

چاہتا ہے کہ رہے محوِ نظارہ ہر دم
آپ نے دیدۂ نادان کی حسرت دیکھی

قصۂ درد و الم شکوۂ وعدہ شکنی!
آہ سب بھول گیا جب تری صورت دیکھی

میرے دشمن کو بھی اللہ دکھائے نہ کبھی!!
اے ہدایت شبِ فرقت جو مصیبت ... دیکھی

عید کا چاند

از حضرت نذیر بنارسی مُدیر ماہنامۂ اضطراب بنارس

متبسم ہوا پیشانیٔ گردوں پہ ہلال | عید پھر آگئی پھر ہو گیا پورا اک سال
اسمیں کچھ رنگ مسرت ہے تو کچھ رنگ ملال | سرخیٔ اوج کہیں ہے کہیں درونیہ زوال

عید کا چاند نہیں سب کی مسرت کے لئے
ایک نعمت ہے مگر صاحبِ دولت کیلئے

اک تجلی ہے یہ اربابِ حقیقت کیلئے | رُخِ محبوب ہے مشتاقِ زیارت کیلئے
ہے جھلک حور کی دلدادۂ جنت کیلئے | پارۂ نان ہے رسوائیٔ غربت کیلئے

مہہ نو کچھ ہو مگر پیشِ گدا کچھ بھی نہیں
ایک ٹوٹی ہوئی تھالی کے سوا کچھ بھی نہیں

اک حسیں طوق ہے یہ حسنِ دلآرا کیلئے | اک تماشا ہے یہ بیتاب تماشا کیلئے
ایک ٹوٹی ہوئی چوڑی ہے یہ بیوا کیلئے | ایک نشتر ہے یتیموں کی تمنا کیلئے

اسمیں اُمید بھی بربادیٔ اُمید بھی ہے
ساتھ ہی ساتھ محرم بھی ہے اور عید بھی ہے

تو ہے جب قادرِ مطلق تو یہ قدرت کیسی | جس سے خوش ہو نہ سکیں سب وہ مسرت کیسی
بہرے معبود یہ مخصوص عنایت کیسی | جو امیروں ہی پہ نازل ہو وہ رحمت کیسی

کتنے کل عیش کی تصویر مکمل ہوں گے
کتنے پہلو ہیں جو ارمانوں کے مقتل ہونگے

یادِ رفتہ!

از جناب صدیق احمد صاحب صادق قریشی لکھنوی بمبئی

اے ہلالِ عید اے پیغمبرِ کیف و نشاط | اے ضیا بردوشِ عشرت اے ربابِ انبساط
تیری آغوشِ طرب میں گو ہیں نغماتِ کہن | تیرے تیور میں ہیں پنہاں انقلاباتِ کہن
تو نے دیکھی ہیں ہماری عید کی نیرنگیاں | تو نے دیکھی ہیں ہماری بزم کی رعنائیاں
تو نے دیکھا ہے زوالِ قیصر و فغفور بھی، | تو نے دیکھا ہے کمالِ شمس بھی منصور بھی
تو نے دیکھا ہے ہماری شبِ عُروسی کا نکھار | تو نے دیکھا ہے ہماری صبح کا رنگیں نکھار
کیا ہماری عید ایسی تھی شکستِ روزگار | کیا ہمارا ذوق تھا آلودۂ گرد و غبار
کیا یونہی تھے زرد چہرے انقلابِ دہر سے | کیا لرزتے تھے یوں ہی محکومیت کی قہر سے
ہم میں ہی وہ ہستیاں موجود تھیں نام خدا | جنکے قبضہ میں تھی تیری [illegible] ماہِ صفا
عید ہوتی تھی ہماری کو ہسار وں میں کبھی | گلستانوں میں کبھی اور [illegible] میں کبھی
اب ہماری عید ہے سرگشتۂ حزن و ملال | ہر قدم وقفِ تغیر ہر نفس صرفِ زوال
اب احساسِ مسرت ہے دلِ رنجور... کو | کھا گئی ظلمت کدے کی [illegible] اس نور کو
تیری آمد سے ہوا گو نہ طبیعت کو ملال، | زندگی دو بھر ہوئی اور [illegible] جینا وبال
سچ بتا اسلاف کے ہمراز اے پیکِ جمال | اے مسافر سالہا سال کے روشن خیال
دل کہ جس پر زنگ ہے افکار کا لا منتہی | کیا ہی آئینۂ عقیدت تھا کبھی

اے ہلالِ نو مسرت خود بخود کھنچ آئے گی
عید جب غربت کے رنگین ذوق کو گرمائے گی

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان قدرت کا محتاج ہے۔ لیکن اس قدر مجبور محض نہیں کہ وہ اس کارخانۂ قدرت میں دخل نہ دے سکے۔ تغیر و تبدل۔ ترکیب اشیا اور نقل و حمل بندہ پوری طرح قابض ہے۔ کارخانۂ قدرت میں جو چاہے کرے وہ اپنا مختار آپ ہے۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کا ہر شعبۂ زندگی قدرت کے بارِ احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس کی تمام معاشی جد و جہد قدرتی حالات سے وابستہ ہے اور قدرتی حالات کا اس کی معاشی زندگی پر نہایت گہرا اثر پڑ رہا ہے اس لئے یہ ضرور ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ متمدن حیثیت سے آباد ہو وہاں کے قدرتی اور طبعی حالات ضرور اس کے معاون و مددگار ہوں گے۔ اگر ہم اس کی معاشی حالت کا اندازہ کرنا چاہیں تو ہم کو چاہئے کہ جس خطۂ زمین پر وہ آباد ہے وہاں کے قدرتی حالات سے ضرور واقف رہیں۔ تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ وہاں کے قدرتی حالات کا عمل و دخل اس کی معاشی زندگی میں کس قدر ہے اسی طرح ہمیں ہندوستان کے معاشی حالات کا پتہ لگانے کے لئے سب سے پہلے اس کے قدرتی نواح کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ جو اس کے معاشی حالات میں بہت زیادہ دخل رکھتے ہیں۔

ہندوستان بجائے خود گویا ایک چھوٹی دنیا ہے۔ ایک طرف شمال میں عالی شان پہاڑوں کا سلسلہ قائم ہے جن کو عبور کرنا ناممکن تو کیا محال ہے۔ دوسری طرف سمندر اس کو تین طرف سے گھیرے ہوئے ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت ہی نے ہندوستان کو دنیا سے الگ اور محفوظ کر رکھا ہے۔ اگر کوئی قوم ہندوستان میں داخل ہونا چاہے تو ایک طرف فلک بوس پہاڑ ناقابل گذر بن کر اس کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف صاف و شفاف اور نیلگوں سمندر اس کی نگہبانی کر رہا ہے۔ اس قدر دنیا سے الگ ہونے پر بھی گویا وہ تمام عالم کا خلاصہ ہے۔ کیا لحاظ آب و ہوا اور کیا بلحاظ پیداوار اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک براعظم میں ہونی چاہئیں۔

وسعت، بلندی اور رقبہ کے لحاظ سے اس میں ہر قسم کی آب و ہوا موجود ہے۔ جب ہم پنجاب اور راجپوتانہ کی گرمی کا خیال کرتے ہیں تو فوراً عرب و افریقہ کا سماں ہماری آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ ساتھ ہی ہمالیہ جیسے عظیم الشان پہاڑ کی فلک بوس چوٹیاں بھی برف سے ڈھکی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح جہاں گرم و خشک اور مرطوب حصے موجود ہیں۔ وہیں دکن کی معتدل اور خوشگوار آب و ہوا کا خطہ بھی پایا جاتا ہے۔ اوائل جون میں جب جنوب و مغرب کی طرف شدت کی بارش ہوتی ہے تو انہیں دنوں بہار اور اڑیسہ کے کاشتکار نیلے آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے بارش کا ناقابل برداشت انتظار کرتے ہیں۔ جہاں آبادی کا ایک حصہ سرسبز و شاداب میدانوں اور عیش و عشرت کے گہواروں میں پڑا جھولتا ہے تو دوسرا سندھ اور راجپوتانہ کے لق و دق میدانوں اور تپتے ہوئے ریگستانوں میں تڑپتا ہوا نظر آتا ہے۔ الغرض ہندوستان کیا ہے مناظر بوقلموں کا ایک عجیب مرقع ہے۔ اس پر بھی ہم اس کو براعظم نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔؟

اگر ہم ہندوستان کے نقشہ پر نظر ڈالیں تو صاف طور سے یہ دکھائی دیتا ہے کہ ہندوستان فطرتاً چار حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو شمال میں سب سے اوپر سلسلہ ہمالیہ جس کو قدرت نے ہندوستان کی حفاظت کی خاطر متعین کیا ہے۔ مشرق سے لیکر مغرب تک اپنے دونوں بازو پھیلائے کھڑا ہے۔ دوسرے ہمالیہ کے جنوب میں پہلو بہ پہلو ایک وسیع سرسبز و شاداب میدان ہے جو بالعموم شمالی ہندوستان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے بعد ذرا آگے نظر دوڑائیں تو جزیرہ نمائے ہند کی سطح مرتفع جس کو عام طور سے دکن کہتے ہیں دکھائی دیتی ہے۔ اس سطح کے شمال میں بندھیاچل واقع ہے۔ جو سرزمین دکن اور شمالی میدان کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ چوتھا حصہ وہ ہے جو ساحل ہند کے ساتھ ساتھ عرض میں کم اور طول میں میلوں پھیلا ہوا ہے۔ یہ سطح نہایت ہموار اور دکن کی سطح مرتفع سے زیادہ پست لیکن نہایت زرخیز ہے۔

ہمالیہ کوہ ہمالیہ ہندوستان کی شمالی سرحد پر شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے۔ اس کا طول ڈیڑھ ہزار میل ہے۔ یوں تو اس کی چوڑائی کہیں کہیں پانچ سو میل تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن عرض عام طور پر ڈیڑھ سو میل ہے۔ ملک تبت کی طرف

اس کی اونچائی آٹھ ہزار فٹ ہے۔ اور ہندوستان کی جانب بیس ہزار فٹ بلند ہے اس میں بے شمار چوٹیاں موجود ہیں۔ جو برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ ان میں کوہ ایورسٹ سب سے زیادہ بلند ہے اس کے علاوہ کنچن گنگا۔ نینی تال۔ مسوری۔ دھولگیری۔ گوری شنکر وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ چوٹیاں بھی اس قدر بلند ہیں کہ ان کے دیکھنے سے اس معبود حقیقی کی عظمت و جبروت کا پتہ چلتا ہے۔ جس کے آگے یہ تمام کائنات ایک مور ناتوان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ہمالیہ چونکہ برفستان ہے اس لئے ہزاروں دریا اور چشمے اس کے دامن میں کھیلتے نظر آتے ہیں ؎

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی، ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا

یہی وجہ ہے کہ شمالی میدان چہار دانگ عالم میں اپنی زرخیزی اور زرریزی کے لئے مشہور ہے۔

کوہ ہمالیہ میں بہت سے درّے ہیں۔ جن سے شب و روز آمد و رفت ہوتی رہتی ہے ان راستوں پر عرصہ دراز سے مشہور شہر آباد ہیں۔ مثلاً دارجلنگ یہ نہایت ہی پُر رونق شہر ہے۔ اور علاقہ بنگال میں موسم گرما کا صدر مقام ہے۔ یہاں سے ایک راستہ سکم سے ہوتے ہوئے تبت کے مشہور شہر لاسہ تک جاتا ہے۔ کچھ درے ریاست بھوٹان کیں بھی ہیں۔ لیکن وہ بھی تنگ اور پیچیدہ ہیں۔ ان راستوں سے پہاڑی اور وحشی قومیں آتی ہیں۔ شملہ اور نینی تال بھی دروں کے راستوں پر آباد ہیں۔ ان راستوں سے صرف نام کو تجارت ہوتی ہے۔ چند راستے ایسے بھی ہیں جو دریاؤں کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے ہمالیہ کی دوسری جانب علاقہ تبت میں جاتے ہیں مثلاً دریائے برہمپتر۔ ستلج اور سندھ وہ دریا ہیں جو تبت سے نکل کر ہمالیہ کو عبور کرکے ہندوستان کے سبزہ زار میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور درے صرف تین ہیں جن سے ہر وقت آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔ ایک زمانہ میں یہ تجارت کی شاہ راہ بنے ہوئے تھے۔ تجارتی قافلے اور سیاح ہر وقت ان راستوں سے ہندوستان میں آتے تھے۔ لیکن آج کل وہ چہل پہل نہیں جو پہلے تھی۔ یہ درے خیبر، بولان۔ اور گومل کے نام سے مشہور ہیں۔

ہمالیہ کے اثرات شمالی میدان ہمالیہ کی وجہ سے روز بروز باغ ارم بنتا جاتا ہے۔ مٹی پہاڑوں سے دریاؤں میں بہہ بہہ کر نیچے آتی رہتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ شمالی ہند کی ساری زمین دریاؤں سے بنی ہے۔ اسی لئے تو اس کو دریائی میدان بھی کہتے ہیں۔ یہ دریا شمالی ہند کے باشندوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ ان کو ان دریاؤں کا نہایت شکر گذار ہونا چاہئے۔ جنھوں نے سارے شمالی میدان کو زرخیز و زرریز بنا دیا ہے۔ جس کا ذرّہ ذرّہ آج ہزاروں اور لاکھوں کی قیمت رکھتا ہے۔ وہی مٹی جو دریا بہا لاتے ہیں تہ نشین ہو ہو کر ایک زرخیز میدان تیار کر رہی ہے۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ دریاؤں کے دہانوں پر جو نئی زمین نکل رہی ہے وہ اسی مٹی کا نتیجہ ہے جس کو ڈیلٹا کہتے ہیں

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں	چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں	تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم [illegible] کے لئے

امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو	پاسباں اپنا ہے تو دیوار ہندوستاں ہے تو
مطلع اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو	سوئے خلوت گاہ دل دامن کش انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالم تاب پر۔ اقبالؒ

اس میں شک نہیں کہ ہمالیہ ہندوستان کا سب سے بڑا محافظ اور نگہبان ہے۔ شمال میں یہ اس طرح مائل ہے کہ کسی کی کیا مجال جو اس کو عبور کر سکے۔ ہندوستان کے لئے یہ رحمت الٰہی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کو اس کی حفاظت منظور تھی۔ اسی لئے اس نے ہمالیہ کو شمال کی جانب کھڑا کر دیا۔ جس سے ہندوستان ہر قسم کی آفتوں اور بلاؤں سے محفوظ ہے۔

جنوب مغربی باد برشگال جو بحیرۂ عرب سے اٹھتی ہے وہ سیدھی برستی ہوئی شمال مشرق کی طرف جاتی ہے اور ہمالیہ سے ٹکرا کر وہیں برس پڑتی ہے وہ اس سے پرے جانے نہیں پاتی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے کہ تمام بادل جو سمندر سے اٹھتے ہیں اور شمال مشرق کی طرف جاتے ہیں۔ وہ ہندوستان ہی میں برستے رہتے ہیں۔ ایک چھینٹا بھی تبت کی طرف جانے نہیں پاتا۔ بلکہ تبت میں جو کچھ بھی بارش ہو جاتی ہے اس کو دریائے برہمپتر۔ ستلج اور سندھ اپنے ساتھ بہا کر ہندوستان لاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دریاؤں کو بھی ہندوستان سے خاص الفت اور ہمدردی ہے اگر کسی کو حقیقی محبت اور ہمدردی کی تلاش ہو تو ان دریاؤں کو دیکھے کہ وہ کس طرح ہندوستان کی محبت میں سرشار اور مست نظر آتے ہیں۔ اور اپنی عرقریزی سے ہندوستان کو ہر طرح فائدہ پہنچانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

ہمالیہ برفستان ہے۔ یعنی برف کا گھر۔ اس لئے موسم گرما میں برف پگھل پگھل کر دریاؤں میں بہہ آتی ہے۔ ان دنوں دکن کے بعض دریا پایاب اور بعض خشک ہو جاتے ہیں۔ لیکن شمالی ہند کے دریا بڑے زوروں پر ہوتے ہیں۔ برس کے بارہ مہینے ان میں بے انتہا پانی رہتا ہے۔ برسات میں تو یہ بھرپور رہتے ہیں۔ مگر گرمیوں میں بھی۔ ہمالیہ کی مہربانی اور عنایت سے بیشمار برف پانی کی صورت میں منتقل ہو کر ان میں آتی رہتی ہے۔ تبت کی جانب جو کچھ بھی برف پگھل جاتی ہے۔ اس کو بھی شمالی ہند کے دریا، ہندوستان کھینچ لاتے ہیں۔ یعنی ہندوستان کو دونوں جانب سے ضرورت سے زیادہ پانی دستیاب ہوتا رہتا ہے۔

اگر ہمالیہ نہ ہوتا تو ہندوستان کبھی زرخیز نہ ہوتا۔ نہ ایسے بڑے بڑے دریا بہتے نہ اتنی بارش ہوتی نہ چاء اور قہوہ کے لئے ایسی ڈھلوانیں میسر آتیں اور نہ اعلیٰ قسم کے پھل پیدا ہوتے۔ نہ ایسے بڑے بڑے گنجان بن کھڑے ہوتے۔ جن کی لکڑی پھل پھول اور سایہ سے ایک عالم مستفید ہو رہا ہے۔ شمالی میدان کی ہموار ڈھال اسی ہمالیہ کی برکت کا نتیجہ ہے۔ یہیں بڑے بڑے متبرک اور تجارتی شہر آباد ہیں۔ اور اسی ہموار میدان میں سیکڑوں نہریں نکالی گئی ہیں۔ جن سے لاکھوں ایکڑ زمین زراعت کے لئے سیراب ہو رہی ہے حقیقت میں ہمالیہ ہندوستان کیلئے ایک بیش بہا نعمت ہے اگر یہ نہ ہوتا تو یہی جنوب مغربی باد برشگال جو دکن اور وسط ہند کی تھوڑی بہت پیاس بجھا کر شمال مشرق کی جانب نکل جاتی ہے۔ شمالی میدان پر کبھی نہ برستی بلکہ اس کو بھی وسط ہند کی طرح پھاند کر تبت اور سائبیریا کے برف بستہ میدان کی سیر کرتی نظر آتی۔ اور شمالی میدان آج ایک ویران اور بنجر سا میدان ہوتا وہ سرد گرم آندھیاں جو سردی اور گرمی میں شمال سے جنوب

کی طرف چلتی ہیں۔ آج پورے ہندوستان کو اسی طرح تباہ کردیتیں۔ جس طرح وسوس کی مشرقی تباہ کن ہوائیں وسوس کے نہ ہونے کی صورت میں نیپلز کے باغات اور سر سبز و شاداب مرغزاروں کو اجاڑ دیتیں۔ اٹلی کا مغربی حصہ بھی وسوس کا ممنون و مشکور ہے جس کی بدولت یہ حصہ نہ صرف اٹلی بلکہ سارے یورپ کیلئے تختۂ عدن بنا ہوا ہے۔

ہمالیہ سے بے شمار دریا نکلتے ہیں۔ اس لئے عجب نہیں کہ اس میں ہزاروں آبشار بھی موجود ہوں۔ پانی کی کارگذاری حیرت انگیز ہے۔ اس نے پہاڑ کاٹے۔ میدان پاٹے۔ جنگل میں منگل منائے۔ بنجر اور افتادہ زمین میں زرخیزی پیدا کی۔ تشنہ لبوں کی پیاس بجھائی۔ سوکھے اور اجاڑ جنگلوں کو سرسبز و شاداب بنایا۔ جہاں پہنچا وہاں مینہ برسایا۔ الغرض تمام دنیا اسی کے دم سے قائم ہے اگر یہ نہ ہو تو ساری دنیا میں خاک اڑے۔ جب بارش کا زمانہ آتا ہے تو دیہات اور قصبات کے بے شمار ننھے ننھے بچے نیم کے درختوں کی ڈالیاں ہاتھوں میں لئے برہنہ سر اور برہنہ پا۔ سڑکوں اور بازاروں، گلی اور کوچوں میں اچھلتے کودتے نہایت بلند آواز سے یہ کہتے جاتے ہیں: کہ "جنگل سوکھا۔ بیل بھوکا۔ پانی بھیج یا اللہ" بچے وہ شور مچاتے ہیں کہ تمام بستی سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ رحمت الٰہی ان ننھے بچوں کو دیکھ کر کیوں نہ جوش میں آئے۔ فوراً ابر دل بادل ہوکر آسمان پر چھا جاتا ہے۔ اور ایک آن کی آن میں وہ مینہ برساتا ہے کہ ندی نالے پرنالے سب بھرپور ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی دنیا کی جان ہے اگر یہ جان نکل جائے تو دنیا بے حس و بیجان ہو جائے۔

ہمالیہ میں دریائے سندھ کی کارگذاری دیکھنے کے قابل ہے اس کی نقاشی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ایک مقام پر اس نے پہاڑ کو اس طرح کاٹ دیا ہے کہ اگر ہم اوپر سے دیکھیں تو وہ ان بلند چٹانوں کے درمیان ایک سفید گر باریک لکیر کے مانند جھلمل جھلمل کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پانی بلندی سے گرتا ہے اس لئے اس سلسلۂ کوہ میں بڑے بڑے آبشار پیدا ہوگئے ہیں۔ جن سے بہت کچھ برقی قوت حاصل کی جا سکتی ہے۔ ابھی تھوڑا زمانہ گذرا کہ آبشار محض تفریح طبع کے مخزن سمجھے جاتے تھے۔ لیکن آج کل کئی پنچکیاں ان سے چل رہی ہیں۔ قوی امید ہے کہ ان سے برقی قوت بھی حاصل کی جا سکے گی۔ کشمیر میں دریائے جہلم کے آبشار سے برقی قوت کے حاصل کرنے کا انتظام ہو چکا ہے۔

ہمالیہ کے دامن میں وسیع اور گھنے جنگل موجود ہیں۔ جب ہم ان گھنے جنگلوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ جن کے درمیان دریائے برہمپتر، گنگا اور ان کے معاون بل کھاتے ہوئے گذرتے ہیں تو فوراً جنوبی امریکہ کا وہ زبردست بن ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے جس کے درمیان ہزاروں میل تک دریائے ایمیزان مع اپنے معاونوں کے لہریں مارتا اور بل کھاتا ہوا مغرب سے مشرق کی طرف بہتا ہے اور بحر اوقیانوس میں جا ملتا ہے۔ ہمالیہ کے دامن میں سال ساگوان اور دیودار کے بڑے بڑے بن موجود ہیں۔ ان کی لکڑی فرنیچر، ریلوں اور جہازوں کے تختے بنانے میں کام آتی ہے۔ بنگال بانس کے لئے مشہور ہے کم و بیش تمام ضروریات زندگی کا انحصار اسی بانس پر ہے خصوصاً بانس بنگال کے لئے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ ہر کام اسی سے لیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کھانے پینے کے برتن بھی اسی بانس سے بنائے جاتے ہیں۔ برمائی ساگوانی لکڑی نہایت کارآمد مفید اور پختہ ہوتی ہے۔ رنگون سے لدکر غیر ممالک کو بکثرت جاتی ہے۔ ہندوستان میں مشکل سے کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں یہ لکڑی استعمال نہ ہوتی ہو۔

چائے کی کاشت کے لئے ہمالیہ کی ڈھلانیں نہایت موزوں ہیں اور خاص کر آسام کی پہاڑیاں چائے کی کاشت کے لئے بہت مشہور ہیں۔ یہاں کثرت سے چائے پیدا ہوتی ہے پانی ہمیشہ ان ڈھلانوں پر سے بہتا رہتا ہے جو چائے کے لئے ازحد مفید ہے۔ آسام کی چائے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ قسم کے میوہ جات کی کاشت بھی ہمالیہ کے دامن میں کی جاتی ہے۔ یہاں قہوہ۔ سیب اور ناشپاتی کے باغات انگریز زمینداروں ہی کے لگائے ہوئے ہیں۔ جب کہ حضرت انسان نے برقی کنجی سے ہوائی خزانوں کے دروازے کھولنے شروع کئے تو کیا عجب ہے کہ وہ ہمالیہ کے ان بیش بہا خزانوں کو بھی معلوم کرلیں جو اس کے دامن میں محفوظ و مخفی ہیں۔

ہمالیہ کے دامن میں شکار اور باربرداری کے جانور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آج کل ہاتھی بنگال میں ذریعہ آمد و رفت بنا ہوا ہے۔ باربرداری کا تمام کام اسی سے لیا جاتا ہے۔ گنجان بنوں اور دلدلوں سے گذرنا اسی کے بس کا کام ہے اس کے آگے گھوڑے اور موٹر گاڑیوں کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ یہ چیزیں وہاں کام دے سکتی ہیں کیونکہ بنگال کی زمین نرم اور رطوبت زدہ ہوتی ہے۔ اسی لئے یہاں ریلوں کی آمد و رفت بہت ہی کم ہے ....

.... بالعموم لوگ بجائے گھوڑے اور موٹر گاڑیوں کے عمدہ اور اعلیٰ قسم کی کشتیاں اور ہاتھی رکھتے ہیں۔ یہاں کی تمام آمد و رفت ہاتھی اور پانی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

ہمالیہ کے دامن سے ذرا اوپر ایک خاص قسم کی بھیڑیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی اون اس قدر گرم اور ملائم ہوتی ہے کہ ریشم بھی اس کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں۔ کشمیر میں بارش کے زمانہ میں اکثر بھیڑیں برف باری کی وجہ سے دامن میں اتر آتی ہیں لوگ ان کو پکڑ کر ان کی اون کتر لیتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ کوئی شخص ان کو پال نہیں سکتا۔ اور اگر پال بھی لے تو ان سے وہ ملائم اون حاصل نہیں ہو سکتی جو اوپر کی آب و ہوا اور گھاس سے تیار ہوتی ہے۔ اسی خیال سے لوگ ان کو کبھی نہیں پالتے ان کے ریوڑ کے ریوڑ ہمالیہ کے سبزہ زاروں میں چرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ہمالیہ کا قدرتی منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جھلکتے ہوئے آبشار۔ خوش نما اور خوبصورت چشمے۔ ہزار ہا دریا جو سرسبز و شاداب پہاڑوں وادیوں اور میدانوں سے گذرتے ہیں۔ بڑی بڑی اور گہری گھاٹیاں۔ بلند اور سر بفلک درختوں کے گنجان بن۔ ہزاروں قسم کے شکاری اور جنگلی جانور۔ جو ان بنوں میں رات دن گھومتے رہتے ہیں قابل دید ہیں۔ اسی لئے موسم گرما میں اس قدرتی منظر کا لطف اٹھانے کے لئے اعلیٰ حکام نے شملہ۔ مسوری۔ نینی تال اور دارجلنگ جیسے خوبصورت اور پر رونق مقامات پر خوشنما مکانات بنا رکھے ہیں۔

اب تک تو ہمالیہ کی ظاہری پر بحث ہوتی رہی۔ اس کا باطن بھی ظاہرداری سے کچھ کم نہیں۔ بےشمار معدنیات اس کے اندر پوشیدہ ہیں۔ بال صاحب اپنی کتاب میں میگاستھینز کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "ہندوستان میں ہر قسم کی معدنیات کی بہتات ہے" اور آخر میں لکھتے ہیں کہ "اگر ہندوستان بالکل آزاد ہوتا یا کم از کم اس کی معدنی پیداوار سابقت کی زد سے محفوظ رہتی تو اس میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ وہ اپنی معدنی ضروریات خود بہم پہنچاتا اور ہندوستان کو آج اس طرح کسی کا دست نگر نہ بننا پڑتا" (باقی صفحہ پر دیکھیے)

FOR BOOKING APPLY —

Supreme Film Distributors Ltd.

MAIN ROAD, DADAR.

بیگم سلطان اور سلطانہ چاند بی بی محاربۂ احمد نگر میں!

بیگم سلطان ابراہیم عادل شاہ والئ بیجاپور کی نہایت عزیز اور پیاری بیٹی تھیں۔ آپ اپنی شجاعت۔ دلیری، سخاوت اور فیاضی میں اپنے زمانہ کی تمام مستورات میں ممتاز اور نمایاں درجہ رکھتی تھیں۔ سنہ ۱۰۰۴ھ میں جب اکبر کی جرار و جانباز افواج نے قلعۂ احمد نگر کا محاصرہ کیا تو بیگم سلطان، سلطانہ چاند بی بی کے دوش بدوش محاصرین کی بیخ کنی کے لئے سرگرم عمل رہیں۔ سلطانہ چاند بی بی۔ نظام الملک والئ دکن کی حقیقی اور چہیتی صاحبزادی تھیں۔ اور آپ کے انتقال کے بعد ملک و تخت کی وارث قرار دی گئیں۔

بیگم سلطان نے اکبری محاصرین کے جوابی حملوں میں انتہائی تندہی اور دلیرانہ طریقہ پر چاند بی بی کا ساتھ دیا اور محاصرین کے مورچوں نقبوں اور سرنگوں کو تہس نہس کرتی رہیں۔ حالانکہ اکبری فوجیں تربیت یافتہ اور مسلح تھیں لیکن اس کے باوجود چاند بی بی کی بیدار مغزی اور اصابت رائے نے ان کی تمام تدابیر کو خاک میں ملا دیا اور متواتر گولہ باری اور شبخونوں سے اکبری افواج کے چھکے چھڑا دیئے اور کافی سے زیادہ نقصان پہونچایا۔ چاند بی بی کے اہتمام جنگ کے پیش نظر اکبری افواج کے معزز و نامی جنرل خانخاناں نے قلعۂ احمد نگر کے گرد ایک گہری سرنگ کھدوا کر اس میں بارود کے بورے رکھوا دیئے۔ لیکن چاند بی بی اور بیگم سلطان جیسی ذہین و فہیم خواتین پر یہ حربہ کارگر نہ ہوا اور ان دونوں خواتین نے سرنگ سے بارود کے بورے نکلوا کر ان کی جگہ پانی بھروا دیا۔ لیکن دوسری سرنگ جو لاعلمی کی وجہ سے خالی نہ کیجا سکی خانخاناں نے فوری کام لیا اور قلعۂ احمد نگر کی تقریباً ۵۰ گز دیوار اڑا دی۔

سلطانہ چاند بی بی جو انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں محاصرین کا مقابلہ کر رہی تھیں اس واقعہ سے متاثر و ملول نہ ہوئیں اور اپنی حکمت عملی سے کام لے کر رات ہی رات میں از سر نو قلعہ کی فصیل تعمیر کرائی۔ لیکن جب تمام رہا سہا اثاثہ ختم ہونے لگا اور کہیں سے کسی کمک کے بھی آثار نہ رہے تو چاند بی بی نے فصیل پر نصب شدہ توپوں سے چاندی کے گولے برسانے کا حکم دیا اور تنبیہہ کی کہ جبتک حیات مستعار باقی ہے دشمن پر جوابی حملوں میں کوتاہی نہ کی جائے۔ غرضکہ ان نڈر اور بہادر خواتین نے ایک عرصۂ دراز تک اکبری افواج کو زک پہ زک پہونچائی اور جب ہر طرح سے مجبور کر دی گئیں تو اس شرط پر جنگ کو ختم کیا کہ شاہی فوجیں قلعۂ احمد نگر اور دولت آباد اور اس کے اطراف واکناف سے محاصرہ ہٹالیں اور صرف چند پرگنے شہزادہ محمد مراد اپنے تصرف میں لے آئے۔

COPY RIGHT

ISMAILI P. PRESS, BOMBAY, 4.

خاص الاصلاح عید نمبر کے لئے

عیدِ غم

مسلمِ ہندی سے خطاب!

اثرِ خامہ ادیب شہیر حضرت آغا خلشؔ کاشمیری!!!

جہاں کا رنج اٹھایا ہنسی خوشی تو نے　　وفورِ غم میں کیا عزمِ خودکشی تو نے
فلک کی چال کو جانا ہے دل لگی تو نے　　مآلِ کار کو سوچا بھی ہے کبھی تو نے

برا یا درد بٹانے میں کھو گیا ہے تو
ذلیل و خوار زمانے میں ہو گیا ہے تو

کئے جا اپنے پرائے میں امتیاز اے جان!　　ذرا نگاہِ خرد سے برا بھلا پہچان!!
عراق و شام کے رستے میں کھو گیا ایران　　پڑا ہے پنجۂ دیوِ اجل میں پاکستان

ذرا سی بے خبری بھی ہے سکھ کو دکھ میں بدل
یہ ہے ازل سے مقدر سزائے زشتِ عمل

ہوئی ہے تیغ تراز و عدو کے سینے پر　　تجھے غرور ہے اسلاف کے قرینے پر
نہ کیوں ہو موت کو ترجیح تیرے جینے پر　　کھڑا ہے عزمِ عمل ارتقا کے زینے پر

جو ہو سکے تو اب عید کا نام باقی رکھ
وفا کی شان کو ہندی غلام باقی رکھ

پئے سرور ہے وجہِ جواز عید کا چاند　　فلک پہ ہوتا ہے جلوہ طراز عید کا چاند
جہاں کو دیتا ہے اذنِ نماز عید کا چاند　　جھکا ہے جانبِ ارضِ حجاز عید کا چاند

جو یار لوگ خلشؔ انگلیاں اٹھاتے ہیں
ہلالِ عید کے جلوے ہنسی اڑاتے ہیں

حسن کے متعلق یورپی اقوام کا نظریہ یہ ہے کہ حسن کی تجلیات اور کیفیات بہت واضح اور روشن ہیں۔ اس کے تاثرات اگرچہ محدود ہیں مگر اس کی رنگینیاں کائنات عالم کے ذرہ ذرہ میں رنگ آفریں ہیں۔ یہ حسن ہی تو ہے جو ایک مشت غبار کالبد خاکی کو حیات ابدی بخشتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں نشاط و سرور پیدا کرتا ہے۔ ہم بھی حسن کے جلوؤں کی عالم گیری تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کی نشاط آفرینی کے قائل ہیں۔ لیکن ہم حسن کو چند صفات اور ہستی میں مخصوص نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک انسانی ذوق کے ساتھ ساتھ حسن کی ہستیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ ہمارے نزدیک جس طرح ایک انگریز حسینہ حسن و جمال کا مظہر ہے۔ اسی طرح حبشی دوشیزہ حسین ہو سکتی ہے۔ ان میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح دینا اختلاف رجحانات کا کرشمہ یا لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید کا مصداق ہے۔

بات یہ ہے کہ انسانی طبائع کے رجحانات، خصائص، نفسیات، طبعی اختلافات (PHYSICAL) ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ہر آرٹسٹ کے کارنامے اپنے مقامی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں اس لئے اس کے کردار میں مقامی رسم و رواج کی جھلک ضرور نمایاں رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکسپیر کے ڈراموں میں عہد الزبتھ کی داستانیں بھری ہوئی ہیں۔ اور کالیداس کے گلدستوں سے عہد بکرماجیت کی تہذیب و تمدن آشکار ہے۔ ان دونوں ہستیوں کا مقابلہ اور موازنہ عہد زوال کے ہندوستان اور انگلستان کی تمدنی، معاشرتی اور روحانی فتوحات کے تقابل اور توازن کا مرادف ہوگا۔ اس مختصر مضمون میں یہ تو بہت دشوار ہے کہ کالیداس اور شکسپیر کے تقابل اور توازن کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جا سکے۔ البتہ ان چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے جن میں دونوں ایک دوسرے کے مقابل یا مماثل ہیں۔

اس بات کو واضح کرنے سے قبل یہ بات ذہن نشین کر لینی ضروری ہے کہ شکسپیر نے وہ زمانہ پایا تھا جس میں انگلستان کی مدنی حالت بہت پست تھی۔ اور وہ قریب قریب نیم وحشی حالت میں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں روحانیت ترقی پذیر تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ خونریزی اور وحشت انگیزی بھی عمومیت رکھتی تھی اور بقول ڈاکٹر رومین رولینڈ (ROMAN ROLLAND) شکسپیر عہد الزبتھ کے شائستہ جانوروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ اس کے برخلاف کالیداس کے عہد میں ہندی تہذیب و تمدن بہت اعلیٰ تھا۔ ہندوستانیوں کے خیالات میں رنگینی اور جذبات میں روحانیت کارفرما تھی۔ شکسپیر کے ڈراموں میں اگر قتل و خونریزی کی چیخ و پکار ہے۔ وحشت انگیز کارنامے دلوں کو دہلاتے اور سہماتے ہیں۔ تو کالیداس کے ناٹکوں میں لطیف و نازک احساسات کیف پرور اور وجد آفریں ہیں۔ اس سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک ظالم اور وحشی طبقہ کا علمبردار تھا تو دوسرا یعنی کالیداس اس علم دوست قوم کا جس میں شاعرانہ احساسات کی فراوانی تھی۔ ہندوستانی شاعری کی زبان سنسکرت وسیع، شائستہ اور منجھی ہوئی تھی۔ اس میں یہ جوہر موجود تھا کہ نازک سے نازک استعارے اور تشبیہیں آسانی سے ادا کی جا سکیں یہی وجہ ہے کہ جب وہ لطیف و پاکیزہ جذبات کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ماہر موسیقی ترنم کے دریا بہاتا چلا جا رہا ہے۔ بلا شبہ انگریزی شاعر شکسپیر نے بھی خوب خوب لطیف و نازک احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ پاکیزہ اور نغمہ ریز زبان لکھی ہے۔ لیکن اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کے ترنم میں وحشیانہ درشتگی اپنا رنگ بھرے بغیر نہ رہ سکی۔ شکسپیر کی المیات (TRAGEDIES) جو اس وجہ سے ختم ہو جاتی ہیں کہ اسٹیج پر کوئی ذی روح پیکر باقی نہیں رہتا۔ ممکن ہے کہ کالیداس اور اس کے معاصرین کے نزدیک شاعر وحشیانہ اور بہیمانہ خیالات کا انعکاس ہوں۔

شکسپیر خدا کے وجود کا قائل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک کسی آئندہ زندگی میں بہبودی کی توقع فضول ہے۔ عقبیٰ کے متعلق جو کچھ بھی سوچا جائے لغو ہے۔ اس کے جتنے تاثرات ہیں سب وقتی اور ہنگامی ہیں اور اس کی یہ سب صفات کالیداس کے بالکل برعکس ہیں۔ کالیداس کی پوری زندگی اور اس کا سارا ماحول روحانیت سے معمور ہے۔ اس کے نزدیک اس زندگی کے علاوہ ایک اور زندگی ہے جس کا مدار ہمارے موجودہ اعمال پر ہے۔ شکسپیر صرف انسانوں میں ہی جذبات اور احساسات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ لیکن کالیداس کی ہمہ گیر نظر کائنات کے ذرہ ذرہ کو خوشی و غم سے ویسا ہی متاثر دیکھتی ہے جیسے کہ انسان کو اس کا سحر کار قلم ہر منظر کی ایسی جیتی جاگتی تصویر کھینچتا ہے کہ حاضر و غائب مرئی اور غیر مرئی کرب و الم سے بے چین۔ یا بہجت اور مسرت سے یکساں سرشار نظر آتا ہے۔

عشق و محبت کے تاثرات، صنف نازک کے عشوہ و انداز و ادا ان کے حسن و جمال کی دلفریبیاں دونوں کے نزدیک یکساں ہیں۔ کالیداس نے اپنے آرٹ

کی بنیاد صنف نازک کے تذکرہ پر رکھی ہے اور انہیں کے گلزار حسن سے اپنے گلدستوں کو سجایا ہے۔ یہی بات شکسپیر کی تصانیف میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن کم درجہ میں دونوں شاعر دو مختلف النوع شاہد رعنا سے مسحور ہوتے ہیں۔ کالیداس کا معشوق بھولا بھالا ہے اور شکسپیر کا اس سے برعکس بہت چالاک اور ساحر ہے۔ ایک مالویکہ اور شکنتلا کے معاملات اور واردات عشق و محبت کی تصویر کھینچتا ہے۔ تو دوسرا قلو پطرہ اور میرنڈا کے افسانوں کی مصوری کرتا ہے۔ بہر حال دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی دل ایسا نہیں جس پر عشق و محبت کے چرکے نہ ہوں۔ واردات عشق و محبت کے بغیر انسانی زندگی کی رنگینی اور دلچسپی کا برقرار رہنا محال ہے۔ شکنتلا یا میرنڈا کی کامرانی و شادکامی کا راز یہ نہیں کہ وہ صاحب دولت و ثروت یا صاحب اقتدار تھیں۔ بلکہ ان کی فائز المرامی کا راز صرف ان کا جذبۂ ایثار و جانسپاری ہے۔ یہ حقیقت دونوں بلند پرواز شاعروں پر منکشف ہو جاتی ہے۔ کہ دنیائے محبت میں کامیابی صرف انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جو اپنی ہستی فراموش کر دیں۔ محبت خزینۂ قدرت کا بے بہا عطیہ ہے وہ زمان و مکان کی قیود سے پاک ہے۔ جب ایک مرتبہ اس کے شرارے نمودار ہو جاتے ہیں تو ان کا بجھانا محال ہو جاتا ہے۔ نہ تو انسانی اثرات اس کی آگ کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ اور نہ آفات روزگار اس میں خلل انداز ہو سکتے ہیں۔ جیولیٹ یا جیکا۔ اروسی یا مالویکہ کسی کے حسن بیان اور طرز ادا کی طلسم کاری پر غور فرمائیے اور پھر دیکھئے کہ دونوں صاحبان کمال نے آتش افروز دلوں کے شراروں کی جو مصوری اور نقاشی کی ہے وہ کہاں تک ناقابل تغیر ہے۔ سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ ان زندۂ جاوید ہستیوں کے قلوب میں آتش محبت ہر جگہ ہر آن ایک شان سے شعلہ فشاں نظر آتی ہے۔ اس کی تڑپ اور سوزش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ حسن و الفت کے ہنگاموں عاشق و معشوق کے ناز و نیاز کی تصویروں میں ان کے موقلم نے جس لطافت اور پاکیزگی سے رنگ بھرا ہے۔ اسے دیکھ کر اہل نظر جھومتے اور وجد کرتے ہیں۔ صدیاں گذر گئیں لیکن دنیا ان کے کمال کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہی رہی۔

الغرض دونوں کی باریک بین نظریں فطرت انسانی کے سربستہ رموز کو کمال طباعی سے اجاگر کرتی ہیں۔ اور دونوں صاحبان فن ایک ہی شان استادی سے اپنے اپنے خیال۔ فکر و نظر کے مطابق ان کی نقاشی کرتے ہیں۔

لیکن تمثیلی دنیا میں کردار نگاری کا تقابل کرنے پر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارا ہندی دوست۔ نفسیات دانی اور انسانی قلوب کی رمز شناسی اور طرز ادا کی نزاکت میں اپنے انگریز حریف سے کہیں بالا ہے۔ نالہ ہو۔ یا آہ تبسم ہو یا قہقہہ۔ شرم ہو یا شوخی غرض دلی کیفیات کو اس اچھوتے انداز سے بیان کرتا ہے کہ ہر جگہ ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔ اور دل کی اثر پذیری کا یہ حال ہوتا ہے کہ "اس کی زبان اپنے دل کی زبان معلوم ہوتی ہے" اس کی غواص نظر دل کے جن پنہاں گوشوں تک پہونچتی ہے۔ اور جن لطیف اور نازک نکات کو بے نقاب کرتی ہے۔ شکسپیر کی بے چین نظر ان کا مشاہدہ ہی نہیں کرتی۔ اس کی غواص فکر۔ بحر فطرت انسانی کی جن تہوں سے موتی رول رول کر لاتی ہے۔ وہاں شکسپیر کی تلون پسند فطرت کی رسائی نہیں ہوتی بایں ہمہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ نفسیات کا مطالعہ دونوں نے نہایت غور و خوض سے کیا تھا فرق صرف اتنا ہے کہ اگر کالیداس۔ نسوانی جذبات و محسوسات کے مشاہدہ میں ماہر ہے تو شکسپیر مردانہ جذبات و احساسات کے مشاہدہ میں زیادہ طباعی دکھاتا ہے۔ کالیداس نسوانی جذبات و محسوسات کا مطالعہ کرتا ہے تو نسوانی دل میں بیٹھ کر۔ برخلاف اس کے شکسپیر عورتوں کے محسوسات کا نظارہ بھی نگاہ خصم سے کرتا ہے۔

دونوں صاحبان کمال کے ادبی کارناموں کے مطالعہ میں جو بات حیرت انگیز نظر آتی ہے وہ یہ نہیں کہ صنف نازک اور فلسفۂ حسن و محبت کو دونوں ایک ہی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ بلکہ انداز بیان اور حسن ادا میں بھی دونوں ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ اور جس طرح وہ فطرت انسانی کی تحلیل ایک ہی زاویۂ نگاہ سے کرتے ہیں اسی طرح فطرت کی سادگی اور مناظر قدرت کی رعنائیاں بھی ان کی دلچسپی کے یکساں سرچشمے ہیں۔ جب وہ فضائے خوشگوار میں پہونچتے ہیں۔ حسن و محبت کے افسانے پریوں اور جادوگروں کے قصے ان کے گوش گذار ہوتے ہیں۔ تو ان کے دلوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دونوں بے خود و سرشار ہو جاتے ہیں۔ حسن و گل۔ اور نغمہ و سرود دونوں کے بحر تخیل میں خوشگوار تموج پیدا کر دیتے ہیں۔ اور ان کے رنگا رنگ موتی ہمارے دیدہ و دل کو لبھانے لگتے ہیں۔

بہت سے انگریز نقاد جو شکسپیر کی فضیلت نمایاں کرنے میں حد درجہ مبالغہ کرتے ہیں۔ وہ دوسرے صاحبان کمال کو شکسپیر کے آگے ہیچ پوچ بتاتے ہیں۔ اس کا تمام تر دارومدار ان کی تنگ نظری اور قومی تعصب پر ہے۔ علاوہ ازیں اکثر حضرات شکسپیر کے طمطراق سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور اسے کالیداس پر برتری دیدیتے ہیں لیکن جو فراخ دل اور منصف مزاج سخنور ہیں وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ شکسپیر ان کورانہ پرستش کرنے والوں کے اندازہ سے نصف بھی وزن نہیں رکھتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس طرح کسی ماہر فن مصور کے البم میں ہر تصویر یکساں نہیں ہوتی۔ اسی طرح باکمال ادیبوں کے ادبی کارناموں کو بھی رطب و یابس سے پاک تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بہت کم ایسے ملیں گے جن میں شہرت دوام کی اہلیت موجود ہے۔ بلاشبہ شکسپیر کے ادبی کارناموں میں بہت سے اجزا غیر فانی ہیں۔ تاہم یہ کہنا کہ سبھی کو بقائے دوام حاصل ہے اور اس کی جملہ تصانیف ایک ہی پلہ کی ہیں۔ حقیقت کے خلاف ہے۔

شکسپیر کے المیات (TRAGEDIES) کا شور و طوفان حوادث بسا اوقات ذوق سلیم پر سخت بار گذرتا ہے۔ اور ایک خاص قسم کی دماغی کبیدگی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی طربیات (COMMEDIES) میں اکثر و بیشتر مخصوص ماحول اور عارضی حوادث ہیں۔ لاریب شکسپیر کے بعض دوچند ڈرامے اور متعدد سانیٹ ایسے ہیں جنہیں ضرور پسند کیا جانا چاہئے۔ ورنہ بالعموم اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض فنی نقطۂ نظر سے لکھا ہے۔ اور صرف فن کار ہو کر رہ گیا ہے۔ حقیقت سے دور جا پڑا ہے۔ اہل نظر اسے تسلیم کریں گے کہ ڈکنس (DICKENS) کے ایک صفحہ پر چھپی زندگی اور ہمدردی انسانی کا درس ہے۔ وہ شکسپیر کے کسی ایک پورے ڈرامہ پر بھاری ہے۔ بہت ممکن ہے یہ بات بادی النظر میں عجیب معلوم ہو لیکن کیا کیا جائے حقیقت کچھ ایسی ہی ہے۔

کالیداس بھی خامیوں سے مبرا نہیں ہے

رگھو ونشا میں گو اس نے اپنی جدت طرازی اور رنگین بیانی سے نفس مضمون میں جان ڈالدی ہے۔ لیکن بچشم غور اد

یہ عمیق نگاہ مطالعہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خوشامدی درباری چاپلوسی میں مصروف ہے۔

رتو سنبھار میں ہندوستانی آب و ہوا کی دلفریبیوں کو نہایت خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اسے شاعری کا کوئی بہت عمدہ نمونہ نہیں کہا جاسکتا۔

والیکا اگنی مترا گرچہ ہمارے سماجی نقطۂ نظر سے نہایت اہم تصنیف ہے۔ لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے اسکی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ "دونوں میں کون برتر ہے؟" سوال یہاں فطرتاً پیدا ہوتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کے علم و فضل کو چند خاص حدود میں متعین کرنا اور اسی لحاظ سے ایک دوسرے پر ترجیح دینا نہایت غیر منصفانہ اور غیر دانشمندانہ امر ہے۔ دونوں اپنے اپنے زمانہ کی بزم شعر و سخن کے صدر نشیں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اور زمانہ نے ان کی شہرت پر مہر دوام ثبت کی ہے ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح سے بڑھ کر نقد شعر و سخن کی اور کوئی میزان نہیں ان سے کسی کو زیادہ پسند کرنا اور کسی کو کم پسند کرنا یہ اپنے اپنے ذوق لطیف اور وجدانِ سلیم پر منحصر ہے تاہم فیصلہ بہر صورت ہر قسم کی فکری اور خیالی عصبیت سے الگ ہو کر کرنا چاہئے۔ لیکن اگر کسی فیصلہ کے لئے مجبور ہی کیا جائے تو ایک کو بیتھوون اور دوسرے کو مزارٹ کا جانشین قرار دیا جاسکتا ہے۔

(ماخوذ)

خزاں!

(از محترمہ شفیق بانو صاحبہ شفیق)

ایک درخت کے نیچے سے گزری...... دیکھا بہت سے زرد پتے گرے پڑے تھے اور ہوا میں اڑتے پھرتے تھے، درخت کی شاخیں جھوم جھوم کر ہوا دے رہی تھیں اور خزاں رسیدہ پتے ہر جھونکے سے اور دور اڑتے چلے جا رہے تھے گویا کہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہیں۔ یہ منظر مجھ سے دیکھا نہ گیا..... گھبرا کر درخت کو دیکھا اس کے سرسبز پتوں اور شاخوں کو دیکھا۔ دل پر چوٹ سی لگی ــــ آہ۔ یہ دنیا بھی ایک درخت ہے۔ اور یہ انسانی ہستیاں اس کی پتیاں ہیں..... میں بھی ایک شاخ کی پتی ہوں نہیں معلوم "زندگی کی خزاں" کب شروع ہو کر مجھکو گرادے اور میں بھی خزاں رسیدہ پتوں کی مانند اڑنے لگوں ہر جھونکے میں میرے فنا کرنے کی..... مٹا دینے کی طاقت ہوگی..... اور میں بے بسی سے یوں ہی کائنات کے ہر ذرے سے شکوہ کروں گی..... اور حسرت سے اشک آلود نگاہوں سے دیکھوں گی۔ اتنے میں درخت نے اس کی شاخوں نے اور اس کے خوشنما پتوں نے سر ہلا کر میرے خیالات کی تائید کی اور میں خاموشی سے تخیل کی دنیا میں کچھ کھو سی گئی!

رباعیات

خاص الاصلاح کیلئے

خاص الاصلاح کیلئے

عید

(از حضرت رعنا اکبرآبادی!)

سب سے اچھی خدا کے پیغام کی عید — قرآن کی تعلیم خوش انجام کی عید
شیرینی و ملبوس لوازم ہیں..... فقط — ایمان کی پختگی ہے اسلام کی عید

بر آئے یہ صدیوں کی مرادِ اسلام — روشن ہو قمر سے بھی سوادِ اسلام
مل جائیں گلے تمام فرقے یارب — یہ عید ہو وجہ اتحادِ اسلام

سو مرتبہ عید آئے ہر سحر عید آئے — سر آنکھوں پہ لے دیدۂ تر عید آئے
جی میں ہے کہ اک عید منالیں ہم بھی — پیغام سکوں لے کے اگر عید آئے

غم کے پنجہ سے رستگاری نہ.... ہوئی — معدوم نظر کی بیقراری نہ..... ہوئی
جس چاند کے منتظر تھے دیکھا نہ اُسے — عید آئی مگر عید ہماری نہ ہوئی

دن خیر سے بے رنج والم کب آئے — شادی و مسرت سے بہم کب آئے
کس روز ہوئی دعوتِ غم سے فرصت — عید آئی مگر ہوش میں ہم کب آئے

کیوں کوئی حریفِ غم پنہاں آئے — سوت آئے تو لے گردشِ دوراں آئے
عید آ کے بھی شرمائی ہمارے گھر میں — جیسے کوئی بن بلائے مہماں آئے

تلخ حقائق!

(از حضرت مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری!!)

سامانِ زندگی سے ہے معمور کائنات — جینا اگر نہ آئے تو اس کا علاج کیا؟
مشکل نہیں ہے چاکِ گریباں کا رفو — سینا اگر نہ آئے تو اس کا علاج کیا؟
سب بہرہ ور ہیں بزم میں اک تیرے ہاتھ میں — مینا اگر نہ آئے تو اس کا علاج کیا؟
ہنگامۂ خروش ہے گردش میں جام ہے — پینا اگر نہ آئے تو اس کا علاج کیا؟

ساقی

(از حضرت قمر نعمانی سہسرامی)

اے سب سے نئے اور نرالے ساقی — یہ ہوش و خرد تیرے حوالے ساقی
مجھکو تو نہیں ہوش ذرا بھی اپنا — اب تو ہی سنبھالے تو سنبھالے ساقی

پردہ جو ہے دل پہ وہ اٹھا دے ساقی — بے ہوش کو ہشیار بنا دے ساقی
کونین کے راز منکشف ہو جائیں — وہ بادۂ صد رنگ پلا دے ساقی

ناداری کا شکوہ کروں کس سے ساقی — ہنستا ہے وہی کہتا ہوں جس سے ساقی
اغیار دیا کرتے ہیں طعنے کیا کیا — آجاتا ہے رونا مجھے اس سے ساقی

اب اور زمانے کی فضا ہے ساقی — بگڑی ہوئی دنیا کی ہوا ہے ساقی
جو دل سے ہر اک چیز بھلا دیتی ہے — وہ شے ہے ترے پاس سنا ہے ساقی

قطعاتِ عید!

(از حضرت طارق [illegible] روی)

تمنا کو زندہ جاوید کرلے — تمناؤں کی پھر تجدید کرلے
وہ ملنے آرہے ہیں تجھ سے طارق! — خوشی سے آج اپنی عید کرلے

عید کا دن ہے مسکراتا جا — دل سے اپنے دوئی مٹاتا جا
آج دشمن بھی دوست ہے طارق! — سب سے مل سب سے دل ملاتا جا

عید ملنے کا اہتمام ہے آج — دیکھئے جسکو، شاد کام ہے آج
ہاں مگر! ایک میں ہوں اے طارق! — صبح جس کی برنگِ شام ہے آج

قوموں کا اخلاق۔ تہذیب معاشرت اور مادی ترغیبات جو دوسری قوموں کے مقابلہ میں ایک قوم میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں تمدن کہلاتا ہے۔ تمدن کا پہلا زینہ اخلاقیات ہے۔ اور جب اس کا فقدان ہو تو تمدن نہیں رہتا ہے۔ صرف علمی ترقی کا نام تمدن نہیں۔ تمدن کی تعریف اس قدر طویل ہے کہ ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس لئے میں بہت ہی اختصار کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کروں گی۔

تمدن بنتا نہیں بنایا جاتا ہے۔ انسان خود اپنی پوشیدہ طاقتوں سے کام لیکر اپنے اندر وہ خصوصیت پیدا کرے جو دوسرے میں نہ ہو تمدن کہلاتا ہے دورِ حاضرہ کے تمدن میں اخلاقیات کا درجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ عصرِ حاضر کے مدبر مبصر اور ماہر نفسیات اپنے تمدن سے پریشان نظر آتے ہیں۔ مغربی تمدن جس کے زہریلے اثرات کم و بیش ہر ملک میں پھیل چکے ہیں۔ اخلاقیات سے ہٹ کر علمی ترقی کو سرمایۂ حیات بنا چکا ہے۔

انسانیت کا جوہر اعلیٰ اخلاق ہے۔ چنانچہ قدیم متمدن قوموں نے جب حکمت و فلسفہ پر قابو پالیا تو۔ انھوں نے اخلاقیات ہی کو تمدن کی جڑ قرار دیا اور ضروری سمجھا کہ انسان اپنی حیوانی ...... قوتوں کو ختم کر کے اعلیٰ اخلاق سے مزین ہو کر ملکوتی صفات حاصل کرے۔ برعکس اس کے عہد حاضرہ کا تمدن یعنی مغربی تمدن کا مقصد اسی عالم اجسام میں انسان کی قوتوں کا اس قدر ترقی کرنا ہے کہ عالم و فانی العالم اس کا مسخر ہو جائے۔

تمدن حاضرہ کے زہریلے اثرات جہاں مردوں میں پھیل رہے ہیں وہاں عورتیں بھی اس سے بچی نہیں ہیں۔ مغربی تمدن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے عورت کو مرد کے دوش بدوش نہیں بلکہ مرد بھی بنانے کی کوشش کی جو فطرتِ انسانی کے بالکل خلاف ہے۔ جس کو آپ بہت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتی ہیں۔ عورت اور مرد کی ساخت جداگانہ، مزاج جداگانہ، کام اور ذمہ داریاں علیحدہ علیحدہ مرد فطرتاً جفاکش تندخو۔ واقع ہوا ہے۔ برعکس عورت نازک اندام نفیس طبیعت۔ بردبار، متحمل اور محبت کرنے والی جب دونوں میں اس قدر فرق ہو۔ دونوں کے مشاغل علیحدہ ہوں۔ تو ذمہ داریاں بھی الگ الگ ہونی چاہئیں چنانچہ فطرت نے ایسا ہی کیا ہے۔ لیکن مغربی تمدن عورت کو بھی مرد ہی کی طرح جفاکش تندخو۔ اور مضبوط دیکھنا چاہتا ہے جو اس کی فطرت کے قطعی خلاف ہے۔

قوموں کی فلاح و بہبود کی جتنی ذمہ داریاں عورت پر ہیں مرد پر نہیں اس لئے کہ قوموں کے بڑھنے والے پودے اس کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ اور جب یہ اپنے فرائض سے ہٹ کر مردانہ فرائض انجام دیں گی۔ تو ذرا تصور کیجئے اور بہت دور تک دیکھئے دنیا کا کیا حشر ہوگا۔ موجودہ عورت نسوانیت سے جو اس کا جوہر ہے۔ بالکل خالی ہو چکی ہوگی۔

مردوں نے نہیں بلکہ عورتوں نے خود اپنے سفینۂ حیات کو اس تلاطم خیز سمندر کی موجوں کے سپرد کر دیا ہے۔ عصر حاضرہ کی متمدن عورت گھر میں رہنے اور گھریلو سلطنت کے انتظام سے گھبرا کر مردوں کے ساتھ سنیما تھیٹر کلب اور جلسوں میں شرکت کرنے لگی چنانچہ آج آپ دیکھ لیں کہ گھریلو زندگی کا کیا حشر ہو رہا ہے؟

سب سے بڑی فطری ذمہ داری عورت پر بچوں کی پرورش کی ہے ان تعیش کوش مشاغل میں پڑ کر عورت بھلا بیٹھی ہے کہ قدرت نے عورت ہی کو یہ صفات عطا کی ہیں کہ مردوں کے مقابلہ پر وہ ان تکالیف کو برداشت کر کے قوم و ملک کے لئے ہونہار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پیدا کرے۔ لیکن برعکس اس کے کیا آپ یہ کام ایک مرد سے لے سکتی ہیں اور۔ وہ اسی حسن و خوبصورتی سے انجام دے سکتا ہے جس طرح آپ دے سکتی ہیں۔

بلاشبہ عورتوں کی اس مردانگی اور خلاف فطرت مردمی کی وبا نے مشرقی عورت کو بھی اس کے اس سنہری زیور سے محروم کر دیا جو کبھی اس کے لئے سرمایۂ افتخار تھا۔ حسن ظاہری اور چمک سے متاثر ہونے والی عورتوں کا زیادہ وقت اپنی بیجا اور مصنوعی زیبائش اور افزائش حسن اور اس کے بعد مردوں کی طرح نمائش حسن کے لئے کھلے میدان اور مردانہ محلسوں میں شرکت وغیرہ وغیرہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس قسم کی ترقی کا نام تمدن ہے تو ایسے تمدن کو دور ہی سے سلام اس قسم کی اندھی تقلید ہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔

تمدن حاضرہ کی یہ بھی ایک برکت ہے کہ آج ہر قوم جسکو ہر موقع پر کسی نہ کسی مذہب کی ضرورت رہی خالی ہے۔ مذہب کو ایک کھیل سمجھ کر ٹھکرا دیا گیا چنانچہ ہر فرد اپنی اپنی جگہ بجائے خود ایک نمونہ ہے نہ مساوات و رواداری رہی اور نہ اعتماد باہمی رہا غرض کہ تمدن کے وہ تمام اجزا جن کا اس کی ساخت میں ہونا لازمی تھا۔ مٹا دئے گئے تو اب تمدن کہاں رہا۔

میری عزیز بہنو! مغربی تمدن کی رو میں بہہ کر اپنے مقاصد کو نہ گنواؤ ان تمام برائیوں سے نجات کا بہترین ذریعہ مذہب اسلام ہے جس کی تعلیمات پر دنیا کو حیرت ہے دنیا اسلامی عقائد اور اسلامی تمدن کی تعریف کرتی ہے۔ ہمارا تمدن خالص فطری تمدن ہے جو رسول عربی کے توسل سے ہم تک پہنچا گیا۔ میں اس وسیع موضوع پر بہت کچھ لکھنا

عید کی آمد لوگوں کو خوشی کا پیغام سناتی ہے۔ اور بالعموم اسلام سے نسبت رکھنے والے حضرات ایک ایسے جشنِ مسرت کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ جس کے نمائشی ولولہ کا وجود حیرت انگیز ضرور ہے۔ اللہ اللہ اس خوشی کا تنوع بھی کس قدر پُرلطف ہے۔ کچھ لوگ چہروں پر شکن ڈالے ہوئے شیشن اور مشرع انسانوں کی صورت میں مصنوعی یا اصلی بیرونی یا اندرونی زیب و زینت میں مصروف نظر آتے ہیں گو ان کے لب پر مہر سکوت رہتی ہے۔ مگر پھر بھی جب کبھی دہنِ مبارک کو جنبش ہوتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے غرور میں ایک انقلاب برپا ہو گیا عبا و دستار کے انداز حلقومی لب و لہجہ اس پر بالوں کی زیب و زینت۔ کترتی ہوئی لبوں کی صفائی رہ رہ کر انداز تقشف کا اظہار۔ منٹ منٹ پر پاجامہ کے نشیب و فراز کا معائنہ اور اگر میسر آجائے تو بار بار عطر کی مہک سونگھنے کے لئے سوں سوں۔ غرض اسی قسم کے اور بہت سے رسمی انداز اس امر کا پتہ ضرور دیتے ہیں کہ یہ سب عید کی تیاریاں ہیں۔ اور ان جسمانی تکالیف کی کسر نکالنا مقصود ہے جن کا دامن صرف کھانے پینے یا فاقہ کشی سے بالعموم وابستہ سمجھ لیا گیا تھا۔

—— :(۲): ——

کچھ لوگ ریاست و جاہ کے شیدائی عید کا چاند دیکھ کر اپنی بیش بہا شیروانیوں اور سوٹوں کی فکر میں غلطان و پیچاں ہیں۔ کبھی یار و احباب کی ٹی پارٹی کا انتظام ہے۔ کبھی عید مبارک کے رسمی کارڈ بھیجے جا رہے ہیں۔ کبھی عالمِ خیال میں بیٹھے بیٹھے ایک مکمل انگلش مین بن جاتے ہیں۔ کبھی واجد علی شاہ و محمد شاہ پیا کی رُوح کو تازہ کیا جاتا ہے۔ ٹائی رکالر۔ کا استعمال شیو یا ڈاڑھی کی صفائی چمکدار بوٹ کا انتخاب۔ اچکن و چکن کی خوشنمائی مخمل و کمخواب کے کپڑوں کی زیبائی۔ سلیم شاہی یا دہلی کے جوتے کا اختلاف ان کے لئے یہی وہ اسلامی مسئلہ ہیں جس کی وجہ سے دماغ کو دوسری طرف منعطف ہونے کی فرصت نہیں ہوتی ان میں اکثر حضرات بحمد اللہ محض فاقہ کشی کی مصیبت سے آشنا نہیں اس لئے ان کو کھانے پینے کی کسر نکالنے کی بھی خوشی نہیں ہاں اپنی ظاہری ٹیم ٹام کے ساتھ اپنے سے کمتر لوگوں کو مرعوب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس وجہ سے عید کی تیاری میں محو ہیں۔

—— :(۳): ——

اللہ اللہ مذاقِ سیاست سے بہرہ اندوز حضرات عید کے موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے عالیشان منصوبوں میں غرق ہیں۔ بڑے بڑے رؤسا و اہلِ دولت سے محض امید موہوم کی بنا پر ملاقات کی آرزو ہے۔ پبلک سے اس مبارک موقع پر قومی فنڈ وصول کرنے کا خیال دامنگیر ہے۔ اس لئے کسی ضروری یا غیر ضروری مسئلہ کی وجہ سے جلسہ کا انعقاد لازمی ہے۔ تقسیم اشتہار کی بہترین تدبیریں مدِ نظر ہیں۔ عوام کے جذبات خوشی کو چکنی چپڑی شاندار باتوں سے مشتعل کرنا ہے اس لئے خطابت یا تقریر کے لئے کچھ نکات و اشارات زیرِ غور ہیں۔ جن کا تعلق اسلامی انگریزی اخبار کے عدم وجود یا کسی چلتی ہوئی تحریک کی حمایت و مخالفت۔ مسلمانوں کی تنظیم اور اسی قسم کے اہم مسائل سے ہے اور اس طبقہ کی حوصلہ مندی، قومی کارکنی، اولوالعزمی کی سرگرمی۔ ایسے ملکی اور قومی تیوہار کے موقع پر ضرور نظر آتی ہے۔ اور بہت کچھ غنیمت ہے یہ جماعت گو رمضان کا خیر مقدم نہ کرے۔ مگر بلند ہمتی کے ساتھ عید کا خیر مقدم ضرور کرتی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے۔ کہ ان کا منتہائے کمال حریت و آزادی اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ دلوں کا حال جاننے والا صرف خدا ہے اور بس۔

—— :(۴): ——

انہیں عید منانیوالوں میں یا عید کا چاند دیکھ کر دنیائے زندگی کے تموّج کو دوبالا کرنیوالوں میں کچھ عوام بھی نظر آتے ہیں جو سر سے پاؤں تک خستہ حالی میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ بے سر و پا ہیں ان کا رنج و خوشی کا جذبہ ایک رفتار پر قائم رہتا ہے۔ ابھی روتے ہیں۔ ابھی ہنستے ہیں۔ ابھی خوش ہیں اور ابھی ملول وجہ یہ ہے کہ یہ ارتقائے حیات کی پیچ در پیچ راہوں سے نابلد ہونے کی وجہ سے دنیائے بے ثبات کی حقیقت کو خوب سمجھ چکے ہیں۔ بالعموم ان کا بھی یہی خیال ہے کہ عید اور ایک مسلمان کی عید اچھے اچھے کپڑوں عمدہ عمدہ کھانوں بازاروں اور دوست و احباب کی رنگ رلیوں سے وابستہ ہے یہ اسی عید کی خوشی میں محو ہیں۔ کہ کل ہر ایک سے گلے ملنا ہے۔ اور جو کچھ بچا ہوا سرمایہ ہے وہ جذبات عید کے لئے وقف کر دینا ہے ان کے ساتھ ... خصوصیت سے کچھ چھوٹے چھوٹے بچے بھی زیادہ ہیں جو ان کے گوشۂ جگر ہیں یا ان کے غم و افکار کے غلط کرنے والے ہیں۔ یہ بھی عید کو ساتھ ساتھ جائیں گے اور کچھ نہ کچھ ضرور لائیں گے۔ ان بچاروں کو اپنے سے زیادہ اہل و عیال کی فکر ہے۔ بچے عید کا چاند دیکھ کر خوشی کے پٹاخے چھٹاتے ہوئے گھر پر آئے کہ خوشی کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ زیادہ سوچ

پیاں ان بیچاروں کو نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کل کی فکر نہیں۔ پھر بھی یہی وہ بے چارے ہیں جو بے نوا و بے علم ہونے کے باوجود ایثار و محبت کا مجسمہ ہیں۔ انہیں کی خالی ہستیاں قومی ضروریات کو پورا کرتی ہیں انہیں کے دست و بازو اور دل و دماغ پر زبردستوں کی نگاہیں ہیں انہیں کے جوش سے ملک و قوم کی حفاظت ہوتی ہے اور یہی وہ زیر دست ہیں جو سب کے شکار ہیں اور صرف اس لئے کہ سب سے زیادہ سرگرم اور دنیا کے لئے سب سے زیادہ مفید ہیں۔ اللہ اللہ ان کے بچوں کی عید قابل دید ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اپنی عید جس پر ہم کو ناز بیجا ہے بچوں ہی کے لئے زیبا ہے۔ مگر افسوس !!! کہ ان معصوموں کی آنیوالی عیدوں کے مستقبل کا احساس ان کے بڑے بے تجربہ کار اور جوشیلے نوجوان ابنائے وطن کو ہرگز نہیں ان کے نونہال بے شبہ بے شعوری کی وجہ سے عید کو مناتے ہیں اور زبان حال و قال سے کچھ دنوں بعد ان لوگوں کو دعائیں دینگے جو اپنی جھوٹی عیدوں رسمی بناوٹوں مصنوعی نمائشوں اور خود غرضانہ مصلحتوں، یا اسی قسم کی طفل تسلیوں میں محو ہیں اور محو رہیں گے۔ اور اپنی غفلت کے ساتھ ان کی زندگی کو بھی پیوند خاک بنا جائیں گے۔

(۵)

اللہ اکبر! عید کے منانے والے منزل مقصود سے کس قدر دور ہیں۔ غم کو خوشی اور خوشی کو غم کافور کو زنگی اور زنگی کو کافور سمجھ رہے ہیں اور پھر نادانی یا دانائی کی وجہ سے کس قدر مطمئن اور مسرور ہیں۔ اللہ اکبر! اسلامی مذہب و حریت کے علمبردار کھانے پینے کی آزادی [illegible] غیر معمولی خوشی سمجھنے والے کپڑوں کی نفاست اور اسی قسم کی باتوں سے عید کا منشاء بنیاد قائم کرنے والے۔ دستار و عبا کی آرائش کو عبادت سمجھنے والے [illegible] کے عدم وجود کو ایمان و کفر خیال کرنے والے۔ سیاسی چندوں کو مقصد حیات جانتے [illegible] ہے۔ اپنے سو فیصد مفید افعال حسنہ کا جائزہ لیں اور سمجھیں کہ یہ عید

کی تیاریاں صرف عید کے پاکیزہ مقصد کو کہاں تک پورا کر سکتی ہیں !!! یہ سراپ خوردہ کس بات کی عید مناتے ہیں۔ !! مقدس رمضان کے روزے پہ روزے۔ تراویح پہ تراویح۔ تلاوت پہ تلاوت ان کے قلب و دماغ میں وہ روشنی کیوں نہیں پیدا کرتی جو عید کو حقیقی عید بنا دے! قلب کو اطمینان و سکون سے لبریز کر دے۔ اور نقلی عید منانے والے مسلمانوں کو ایک ایسے اصلی یا اصولی مغالطہ سے رہائی نصیب ہو۔ جس نے شیرازۂ زندگی کو درہم برہم کر رکھا ہے۔

اے میرے دوستو! عزیزو!! پیارے بچو! آؤ اور خدا کے لئے آؤ اگر عید الفطر میں نہ سہی تو عید الاضحیٰ میں وہ عید ضرور مناؤ جو حقیقی عید ہو۔ صرف طفل تسلی نہ ہو۔ آؤ اور ابھی سے اس عید کے لئے تیاری کرو جو ایک مسلمان کے لئے طرۂ امتیاز بلکہ مایۂ ناز و سرچشمہ انبساط ہو۔ ہاں وہی عید جو اسلامی عید کی یاد کو تازہ کر دے جس کو ان خرافات کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جس کی نماز کے لئے کسی کے سامنے سر بسجود ہو جانے کے قابل ہو جانا سیکڑوں عیدوں کے مساوی ہے۔ ہاں وہی عید جس کا اہتمام بنی نوع انسان کے لئے لافانی امن و مسرت کا روح پرور پیغام ہے اور جس کے ایک سجدے کی تیاری حاصل حیات و کائنات ہے۔

گیرم کہ ہزار مصحف از بر داری
آں را چہ کنی کہ نفس کافر داری
سر را بزمیں چہ مے نہی بہر نماز
آں را بزمیں بنہ کہ در سر داری

(ختم شد!)

سرگذشت

از سحر البیان حضرت ساغر چشتی اوجینی !

خاص الاصلاح عید نمبر کیلئے

انتشار غم سے کھیلتا ہوں میں — کتنا بے باک ہو گیا ہوں میں
نقش خود بن مٹا رہا ہوں میں — وہ سمجھتے ہیں مٹ چکا ہوں میں
درد و غم کی ہوائیں دے دیکر — شمع ہستی بجھا رہا ہوں میں
ہر زباں پر مرا فسانہ ہے — دونوں عالم پہ چھا گیا ہوں میں
مجھکو میری خبر نہیں لیکن! — آپ سمجھیں تو آپ کا ... ہوں میں
مجھکو اے ناخدائے عشق نہ چھیڑ — خود ہی طوفاں میں گھر گیا ہوں میں
جانتا ہوں فریب خود رائی — پھر بھی دھوکے میں آ رہا ہوں میں
جیسے کشتی ہو کوئی طوفاں میں — یوں ہچکولے سے کھا رہا ہوں میں

یار کی بزم ناز میں ساغر!
ایک ٹوٹی ہوئی صدا ہوں میں

محبت!

جس کی ابتدا محبت سے ہوتی ہے اس کی انتہا صرف خدا کے ہاتھوں ہو سکتی ہے۔ محبوب ہونا عظیم الشان ہے لیکن عاشق ہونا عظیم الشان تر! (وکٹر ہیوگو)

عید مبارک
فیشنی عمدہ اور پائیدار شوز
ہمارے بوٹ اور شوز کفایت ہوتے ہوئے بہ نسبت دوسرے شوز کے لاثانی،
پائیدار، دیدہ زیب، اور عمدہ ہونے کے علاوہ خوبصورتی میں بینظیر ہیں۔
عورتوں، مردوں اور بچوں کے لئے ہر قسم کی سائز ہماری مقررہ
شاخوں میں ہر وقت دستیاب ہوسکتی ہے جنہیں آفس یا سیر و تفریح میں یا
سارا سارا دن استعمال میں رکھنے کے باوجود کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اور وہ
نہ صرف آپ کو مطمئن رکھتے ہیں۔ بلکہ آپ کی پوزیشن پر بھی حرف نہیں آنے دیتے۔
Bata
: STOCKISTS :
DAWOOD & CO.
Carnac Road, BOMBAY 2.
BRANCHES :—CARNAC ROAD, HORNBY ROAD, GRANT ROAD, DADAR, COLABA, BYCULLA, PRARTHNA SAMAJ & POONA.
داؤد اینڈ کمپنی، کرناک روڈ، بمبئی نمبر (۲)
شاخیں۔ کرناک روڈ..... ہارنبی روڈ۔ گرانٹ روڈ۔ دادر۔ قلابہ۔ بائیکلہ۔ پرارتھنا سماج اور پونہ
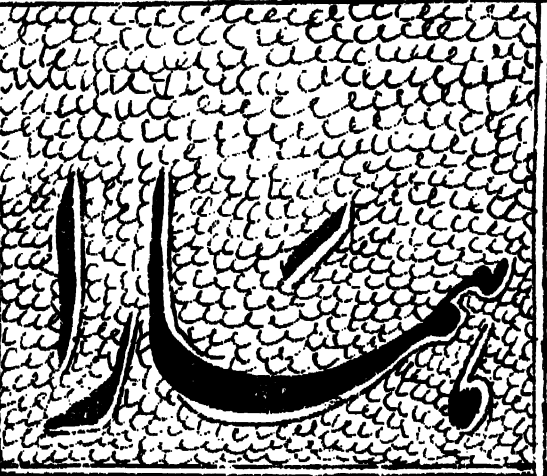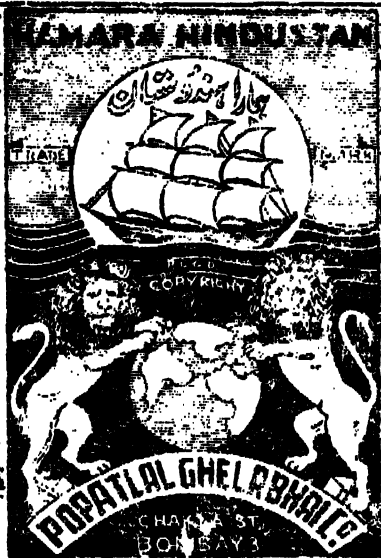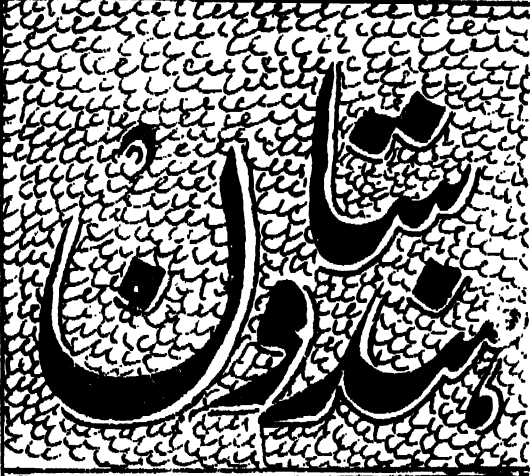
HAMARA HINDUSTAN
ہمارا ہندوستان
TRADE MARK
COPYRIGHT
POPATLAL GHELABHAI & Co.
CHAKLA ST.
BOMBAY 3
ہمارا ہندوستان
ہمارا ہندوستان :- پوپٹ لال گھیلا بھائی اینڈ کمپنی بمبئی کا کیا خاص تعلق ہے اس سے ہندوستان کے جملہ تاجروں اور عوام کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔
ہمارا ہندوستان :- یہ وہ رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے جو جاپان اور ہندوستان کے بنائے ہوئے ہمارے مال مثلاً ہوزیری، ریشمی رومال اور فیض کیپ (ترکی ٹوپیوں) پر نمایاں رہتا ہے۔ اس ٹریڈ مارک سے متعلقہ مال کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام و کمال انتہائی خوشنما۔ دیدہ زیب، خوشرنگ اور موجودہ فیشن اور ڈیزائن کے مطابق، پائیدار اور ارزاں ہوتا ہے۔ کارخانہ کے ذمہ دار افراد اس مال کی تیاری میں انتہائی دلچسپی اور خصوصی نگہداشت سے کام لیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس مقبول عام ٹریڈ مارک کا مال نہ صرف ہندوستان بلکہ سیلون برما۔ اور افریقہ کے بازاروں میں بھی بکثرت فروخت ہوتا ہے اور روزمرہ استعمال کرنے والے عوام اسی ٹریڈ مارک کے مال کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہوزیری میں سب قسم کے موزے گیٹس بنیائن مفلر، سلیپ اور پلو ور، فیلٹ ہیٹ، برسیس، چڈی۔ ریشمی و سوتی رومال۔ رین کوٹ۔ وغیرہ وغیرہ اور فیض کیپ میں ہر اقسام کی ترکی ٹوپیاں، ٹوپیوں کے لئے کیا مال (پٹیاں اور پھندنے) نیز مختلف رنگ اور خوشنما ڈیزائن کے بال دار کپڑے بھی مل سکتے ہیں۔
ہمارا ہندوستان :- کے ٹریڈ مارک سے متعلقہ مال کے علاوہ مندرجہ ذیل مارکہ کی ٹوپیوں کی ایجنسیاں بھی ہمارے پاس ہیں :-
ترکی مینارہ۔ مصری مینارہ، ترکستان، شاہِ مصر، شاہِ ایران، شاہِ افغان، سعودیہ عربیہ، شیر بنگال، شیر پنجاب
ہند کے ہیرے۔ .... سندھ زندہ باد۔ اور دکن دربار۔
پونہ شہر میں سدرنگ نٹنگ ورکس لمیٹیڈ اور کلکتہ میں کالی گھاٹ ہوزیری ورکس، فیکٹریاں جو روزانہ ہزاروں درجن مال تیار کرتی ہیں۔ ان کی ایجنسیاں بھی ہمارے پاس ہیں۔
ان کے علاوہ ہم ان مشہور کمپنیوں کے بھی سول ایجنٹ ہیں۔ جو کپڑا ...... رنگنے کے ہر قسم کے رنگ (DYES TUFFS) مثلاً نیفتول، بینز سولٹ اور انڈین تھرین وغیرہ تیار کرتی ہیں مذکورہ بالا سامان کے واسطے نیچے لکھے ہوئے پتہ پر خط و کتابت کریں۔
ٹیلیفون نمبر ۲۲۹۱۸
پوپٹ لال گھیلا بھائی اینڈ کمپنی
ہوزیری اینڈ کیپ ڈپارٹمنٹ نمبر ۱۰۲-۱۰۴ چکلہ اسٹریٹ بمبئی نمبر (۳)
کلر ڈپارٹمنٹ ٹیلیفون نمبر ۲۷۶۹۰ درکا دیوی، بمبئی
سلک ڈپارٹمنٹ ٹیلیفون
POPATLAL GHELABHAI & CO.
102, 104 Chakla Street, BOMBAY 3
Tele:
Gambhaawaz

شیر افگن اور شیر کی جنگ!

شیر افگن جسے شہنشاہ اکبر نے بردوان کا گورنر نامزد کیا تھا۔ جہانگیر کے تخت حکومت پر متمکن ہونے کے بعد اسے جہانگیر کی ہدایت پر آگرہ ہی میں بود و باش اختیار کرنی پڑی۔ ایک روز جبکہ جہانگیر شیر افگن اور دیگر مصاحب جنگل سے گذر رہے تھے۔ جہانگیر کو جھاڑی میں ایک شیر دکھائی دیا۔ جہانگیر نے ابتدأ اوروں سے اس شیر پر بغیر ہتھیار کے وار کرنے کے لئے کہا۔ بعد ازاں شیر افگن کی طرف متفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ شیر افگن جو نڈر اور انتہائی جری تھا بلا تامل شیر پر ٹوٹ پڑا اور اس کے بازوؤں کو پھیلا کر لاتوں اور گھونسوں سے اُسے ادھ موا کر دیا۔ زیر نظر تصویر میں شیر افگن شیر سے نبرد آزما نظر آرہا ہے اور بھیل اِدھر اُدھر سے شیروں کو ہانک ہانک کر لا رہے ہیں۔ اور شہنشاہ جہانگیر شیر افگن کی اس جسارت سے متحیر ہو کر گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اس نظارے کو دیکھ رہے ہیں!

میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤں گی اک دن!

تمہاری خلوتیں جنت بناؤں گی اک دن
حسین پاہوں پہ گجرے پہناؤنگی اکدن
جو بجھ رہی ہے وہ شمع جلاؤں گی اکدن
فسردہ راتوں میں آؤں گی دلکشی لیکر
نسیم صبح کی آؤں گی تازگی لیکر
تمہاری محفلِ غمگیں سجاؤں گی اک دن
بہار بن کے پیام نشاط لاؤں گی
اجڑ رہی ہے جو آغوش وہ بساؤں گی
تمہاری آنکھوں سے نیندیں چراؤں گی اکدن
میں جگمگاؤں گی خورشید کی کرن بن کر
عروسِ جنت و دوشیزۂ چمن بن کر
مشامِ جاں کو تمہارے بساؤنگی اک دن
قریب دوں گی تمہیں میں نسیم بن کے کبھی
رہوں گی ساتھ تمہاری ندیم بن کے کبھی
میں اپنا ظرفِ نظر آزماؤں گی اک دن
بہار بن کے میں چھاؤں گی سبزہ زاروں پر
صبا میں بن کے چلونگی شگوفہ زاروں پر
فضائے دہر کو جنت بناؤں گی اک دن
تمہاری بزم میں چمکونگی چاندنی بن کر
تمہیں لبھاؤں گی پھولوں کی دلکشی بن کر
ہنسا ہنسا کے تمہیں مسکراؤں گی اک دن
میں گیت گاتی ہوئی آؤں گی بہاروں میں
وفا کے نغمے بہاؤں گی آبشاروں میں
ترنمات کے دریا بہاؤں گی اک دن
فلک پہ جس طرح برسات میں گھٹا چھائے
فضا پہ جیسے کوئی حسن دلکشا چھائے
تمہاری ہستی پہ یوں پھر میں چھاؤنگی اکدن

میں اپنے ساتھ بہاروں کو لاؤں گی اکدن
تمہارا قصرِ وفا جگمگاؤں گی اک... دن
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اکدن
اندھیری راتوں میں آؤں گی چاندنی لیکر
قدم قدم پہ میں آؤں گی زندگی لیکر
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اکدن
کلی کلی دلِ پژمردہ کی کھلاؤں... گی
تمہیں جگاؤں گی راتوں تمہیں جگاؤں.. گی
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤں گی اک دن
شعاعِ ماہ ستاروں کی انجمن بن... کر
تمہارے پہلو میں چمکونگی شب دلہن بن کر
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤں گی اکدن
چمن کی صحنِ گلستاں میں شمیم بن کے کبھی
تمہیں میں دیکھونگی چشمِ شمیم بن کے کبھی
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اکدن
شمیم بن کے میں برسوں گی لالہ زاروں پر
جمال بن کے میں آؤں گی جلوہ زاروں پر
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اکدن
فروغِ مہر، ستاروں کی روشنی بن کر
تمہارے ہونٹوں پہ کھیلونگی میں ہنسی بن کر
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤں گی اکدن
ترانے نیر رنگینِ الفت کے جوئباروں میں
میں گنگناؤں گی بہتے ہوئے سے دھاروں میں
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤں گی اکدن
چمن پہ جیسے نسیم سحر فزا چھائے
دلہن پہ پہلے پہل جس طرح حیا چھائے
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اکدن

وہی نگاہیں جو افسانۂ محبت... ہیں،
وہی نگاہیں کہ جن میں سرشکِ حسرت ہیں
انہیں نگاہوں کو میں پھر ہنساؤں گی اکدن
یہ پاسِ ضبط، یہ ناموس، یہ خیالِ سماج
تمام عالمِ امکاں، یہ سلطنت، یہ راج
تمہارے قدموں پہ سب کچھ لٹاؤں گی اک دن
جو گیت گائے تھے جذبات کے تلاطم نے
سُنے تھے چاندنی راتوں میں جو کبھی تم نے
وہی حسین ترانے سناؤں گی اک دن
تمہاری جاگتی بےخواب آنکھ کی سوگند
یہ سرخ سرخ سی پُرآب آنکھ کی سوگند
میں روشنیٔ نظر بن کے آؤں گی اک دن
وہ کائنات جہاں رنج و غم کا نام نہیں
جہاں پہ حرص و ہوس کا الم کا نام نہیں
تمہیں وہ خلدِ مسرت دکھاؤں گی اک دن
یہ اشک آنکھوں میں یہ اضطرار میرے لئے
یہ بےکسی یہ غمِ روزگار میرے لئے
یہ ہو اداس میں پھر لوٹ آؤں گی اکدن
سحر تھی اپنی سحر اور رات رات اپنی،
تھی کامیاب جہاں سعیٔ التفات اپنی،
وہی فسانۂ ماضی سناؤں گی اک دن،
تمہیں یہ خوف یہ ڈر یہ خیال ہی کیوں ہو
تمہیں یہ کاوش و فکرِ مآل ہی کیوں ہو
تمہیں یہ ڈر ہے "تمہیں بھول جاؤنگی اکدن"
مرے خیال جدائی سے دلفگار نہ ہو
مرے لئے تمہیں یہ زیست ناگوار نہ ہو
میں لوٹ آؤں گی، ہاں لوٹ آؤنگی اک دن

وہی نگاہیں کہ جو نوحہ خوانِ فرقت ہیں
وہی نگاہیں جو لبریزِ اشکِ الفت ہیں
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اک دن
یہ اپنی ہستی، یہ مذموم رسم، اور رواج
یہ خاندانی تکبر کا جگمگاتا...... تاج
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤں گی اکدن
نظر کے ساز نے اور بربطِ تکلم نے
سنائے تھے جو شبِ ماہ کے تبسم نے
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤں گی اکدن
تمہاری مضطر و بیتاب آنکھ کی سوگند
لہو بھری ہوئی بےآب آنکھ کی سوگند
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اکدن
قدم قدم پہ جہاں چشمِ نم کا نام نہیں
جہاں فریب و ریا کا ستم کا نام نہیں
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤں گی اک دن
ادائے غم یہ مرے جاں نثار میرے لئے
یہ منتظر سی نظر بےقرار میرے لئے
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اکدن
وہی کتابِ محبت کی بات بات اپنی
حیات جس نے بنائی کبھی حیات اپنی
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اکدن
تمہیں یہ رنج یہ غم یہ ملال ہی کیوں ہو
خدا نہ کردہ وفا کو زوال ہی کیوں ہو
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤں گی اکدن
مری وفا کی قسم اتنے بیقرار.. نہ ہو
نہ ہو خدا کے لئے اتنے اشکبار نہ ہو
میں جا رہی ہوں مگر پھر بھی آؤنگی اکدن

مجھے کتابوں کا بڑا شوق تھا۔ اپنی فرصت کے اوقات میں بانفریح کرتے ہوئے جب بھی موقع مل جاتا میں پرانی کتابوں کی دوکان پر چلا جاتا اور کتابیں الٹ پلٹ کرتا رہتا اگر کوئی مطلب کی کتاب ہاتھ لگ جاتی تو خرید لیتا۔ جمال کی دوکان پر میرا جانا اکثر ہوا کرتا۔ وہ نہ صرف ایک بیوپاری تھا۔ بلکہ کتابوں کا اچھا مذاق رکھتا تھا جس کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے سے کسی قدر مانوس ہوگئے تھے پھر مجھے اس کی دوکان پر ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ میں گھنٹوں کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہتا اور اُسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ بلکہ اگر کتابوں کا کوئی نیا ذخیرہ آتا تو وہ مجھے بتا دیتا۔

پچھلے دنوں جب میں اس کی دوکان پر گیا تو اس نے میرے سامنے ایک کتاب لاکر رکھدی اور بولا "اسے دیکھئے شاید آپ کو پسند آجائے" میں نے اس کا ایک ایک ورق دیکھنا شروع کیا۔ واقعی وہ بڑی اچھی کتاب تھی۔

"جمال یہ کتاب تمہیں کہاں سے لگ گئی؟" میں نے کہا حیرت ہے کہ جس کسی کے پاس ایسی اچھی کتاب تھی اس نے تمہیں دینا کیونکر گوارا کیا!

"آپ تو جانتے ہیں" جمال نے کسی قدر فخریہ انداز میں کہا "یہ میرا پیشہ ہی ہے کہ میں اچھے اچھے موضوعات پر کتابیں حاصل کرکے اپنے سرپرستوں کی تشنگیٔ علم بجھاتا رہوں۔ مگر وہ کچھ قدر رک کر بولا۔ بڑی نایاب کتابیں تھیں میرے پاس کئی دنوں کی بات ہے ایک نحیف و نزار شخص میری دوکان پر بہت سی کتابیں لے کر آیا اور میرے ہاتھوں فروخت کرگیا جس قیمت پر اس نے مجھے یہ کتابیں دی تھیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے روپیوں کی سخت ضرورت ہے ورنہ کتابیں ان داموں کبھی مل سکتی تھیں۔ بہرحال میں نے بلاچون وچرا اس کے منہ مانگے دام دے دئے اور وہ چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر آیا اس روز بھی وہ کچھ کتابیں لایا تھا۔ اب کی بار جو کتابیں وہ بیچ رہا تھا وہ معمولی نہ تھیں میں نے انہیں بھی خرید لیا اور بڑی حفاظت سے ایک طرف رکھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کتابیں کسی ایسے شخص کے ہاتھ بیچوں گا جو مجھے زیادہ سے زیادہ رقم دے سکے۔ ان میں سے اور سب تو بک گئیں لیکن ایک بچ رہی۔ اس کے بعد میں اس کے متعلق بالکل بھول گیا۔ اس عرصہ میں کوئی ایسا گاہک بھی نہیں آیا جو مجھے اس کا خیال آتا۔ کل جب میں نے دوکان میں صفائی کی تو اچانک یہ میرے ہاتھ لگی اور میں نے اسے نکال کر رکھ لیا تاکہ آپ کو بتاؤں۔

ہم دونوں بیٹھ کر اس کتاب کو دیر تک دیکھتے رہے اور اس پر تبصرہ کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں پھر اس شخص کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔

میں نے جمال سے دریافت کیا "کیا پھر کبھی وہ شخص تمہارے یہاں نہیں آیا؟" "نہیں پھر کبھی وہ میری دوکان پر نہیں آیا" جمال نے کہا۔ "لیکن یہ کتابیں فروخت کرنے کے بعد کئی دن تک وہ دوکان کے پاس ادھر ادھر دکھائی دیتا رہا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے ان کتابوں کے بیچ دینے کا افسوس ہے لیکن اب وہ مجبور تھا۔ اور کچھ نہ کرسکتا تھا۔ بہت دنوں سے میں نے اُسے نہیں دیکھا ہے نجانے کس حال میں ہے یا اور ہے بھی یا نہیں" یہ الفاظ میں نے کسی جذبہ سے متاثر ہوکر کہے اور خاموش ہوگیا۔ میرے دل میں اس شخص کی عزت پیدا ہوچکی تھی چلتے وقت میں نے وہ کتاب خرید لی اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کوئی میرے پیچھے آرہا ہے۔ میں نے پروانہ کی اور چلتا رہا۔ لیکن میرا یہ احساس قوی تر ہوتا گیا۔ میں نے اپنے کو جھلاتے ہوئے کہا۔ یہ راستہ ہے بہت سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں یہ کوئی ضروری نہیں کہ میرے پیچھے آنے والا شخص میرا ہی تعاقب کررہا ہو" لیکن گلی پھرنے کے بعد میں نے نادانستہ طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ شخص۔۔ اور ہم دونوں کے سوا تیسرا کوئی بھی وہاں نہ تھا۔۔ مجھے اپنے پیچھے لپکتا ہوا نظر آیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ نکل جانا چاہا مگر اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کرکے رُکنے کو کہا اور میں ٹھہر گیا میرے قریب آکر اس نے کہا "آپ مجھ سے خائف کیوں ہیں؟ مجھ جیسا نحیف انسان کیا آپ کو نقصان پہونچا سکتا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں میں خائف تو نہیں"

"خیر! آپ کے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟"

"کتاب!"

"یہ آپ نے ابھی جمال کی دوکان سے لی ہے؟"

"جی ہاں"

"ذرا مجھے دکھائیے گا؟"

میں نے کتاب اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں دیدی۔

"کتاب بڑی اچھی ہے" اس نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا "آپ نے کتاب پر لکھا ہوا نام پڑھا؟"

"نام؟"

"جی ہاں ۔۔ صابری یہ میرا نام ہے"

آپ کا نام؟"

جی ہاں میرا نام، کبھی یہ کتاب میری ملک تھی۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو رہی تھیں۔

مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے بے ساختہ کہا۔

"اور مجھے بھی" وہ بولا اگر تکلیف نہ ہو تو غریب خانے پر چلئے میں آپ کو کچھ اور کتابیں دکھاؤں گا۔ کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

"ضرور چلونگا" میں نے کہا۔ ہم دونوں گلی سے لوٹے اور صابری کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

صابری کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہ تھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ دکھوں نے اس کی زندگی کو گھن لگا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ وقت سے پہلے بوڑھا ہوگیا ہے۔

میں شام تک صابری کیساتھ بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے چند کتابیں جو اب اس کے پاس بچ رہی تھیں۔ ایک الماری سے نکال کر دکھائیں یہ کتابیں قدیم اور نایاب تھیں۔ ہم دونوں بڑی دلچسپی کے ساتھ کتابوں پر تبصرہ کرتے رہے اور جب میں چلنے لگا تو صابری نے خواہش ظاہر کی کہ اگر ممکن ہو تو میں اس سے کبھی کبھی مل لیا کروں۔ اس نے کہا۔

"میری زندگی میں آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جس سے میں ملنا چاہتا ہوں ورنہ کتابوں کے سوا کسی اور سے —— ہاں یہی سمجھئے کہ کسی اور سے ملنا گوارا نہیں کیا"

میں کبھی صابری کے یہاں جاتا تو وہ بڑی خوشی کے ساتھ میری پذیرائی کرتا۔ ہماری گفتگو کا موضوع زیادہ تر کتابوں کے متعلق ہوا کرتا۔ یا پھر کبھی کبھی اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیتے۔ مجھے صابری کے حالات جاننے کی بڑی تمنا تھی۔ مگر صابری ہمیشہ اس سے اجتناب کرتا رہا۔ لیکن زیادہ عرصہ تک ہمارے یہ تعلقات قائم نہ رہ سکے۔ صابری کی حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ اور مصیبت یہ تھی کہ وہ علاج بھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اپنی تکالیف سے بے پروا سا نظر آتا تھا۔ ایک روز اس نے کہا:۔

"تم مجھ سے علاج کے لئے اصرار کرتے ہو اور میں جانتا ہوں کہ علاج سے مجھے کوئی افاقہ نہ ہوگا۔ بلکہ وہ میرے اس سکون کو بھی چھین لیگا۔ جو مجھے اس حالت میں حاصل ہے۔ موت جس سے تم اسقدر خائف ہو میرے لئے دراصل زندگی ہے اس لئے نہیں کہ لوگ ایسا کہتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ میرے لئے یہی ذریعہ ہے جس سے مجھے وہ چیز مل سکتی ہے جس کا اس دُنیا میں ملنا ناممکن ہے۔...... میں تو کبھی کا مر چکا ہوں۔ گوشت پوست کا یہ ڈھانچہ جو اس وقت تم سے باتیں کر رہا ہے درحقیقت وہ نہیں ہے جو کبھی تھا۔ میں چاہتا تو اپنی اس موت کے ساتھ اسے بھی ختم کر دیتا۔ مگر میں نے خودکشی گوارا نہیں کی۔ یہ جلد بازی ہوتی اور جلد بازی کے معنی یہ ہوتے کہ میں قوتِ برداشت نہیں رکھتا۔ بہرحال میں نے اس ڈھانچہ کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھا تاکہ یہ خود ہی آہستہ آہستہ فنا ہو جائے۔ اب یہ فنا ہونے کے قریب ہو چکا ہے۔ میں علاج کر کے اسے روکنے کی کوشش کیوں کروں؟"

صابری جو کچھ تم نے کہا میں اگرچہ اسے سمجھ تو نہیں سکا اس لئے کہ میں تمہارے حالات سے یکسر ناواقف ہوں۔ لیکن ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں اس طرح دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو میں مجبور بھی نہیں کرتا" میں نے کہا اور اس سے رخصت ہو کر گھر چلا آیا۔ مجھ میں اس کے پاس زیادہ دیر بیٹھنے کی تاب نہ تھی۔ (باقی صفحہ ۱۱۸ پر دیکھئے)

"تضمین بر غزل حضرت صبا یکتا!"

(اثر خامہ موتی بیگم صاحبہ مہر (برہانپور!)

ذروں سے آئینہ اثرِ نور و نار ہے
کونین کی ہر ایک فضا جلوہ بار ہے
ہر شے کمالِ حسن کی آئینہ دار ہے
"کل کائنات مظہرِ انوارِ یار... ہے
لیکن نظر کہ مرکزِ صد اضطرار ہے"

خواہاں عیشِ سکوں کا دلِ بیقرار ہے
پہلو میں خود یہ مایۂ صد انتشار ہے
سمجھے اگر کوئی تو یہ بات آشکار... ہے
"وجہ تباہیٔ چمنِ روزگار ہے
انسان خود مرقعِ لیل و نہار ہے"

رہتا تھا بے پیئے ہوئے سرشاریوں سے مست
سیرِ فلک کیواسطے کافی تھی ایک جست
افسوس آرزوؤں کے اب حوصلے ہیں پست
"یادش بخیر تھا کبھی مستِ مئے الست
وہ دل جو آج معتکفِ چشمِ یار ہے"

بخشا ہے تونے خوب دلِ مبتلا... مجھے
ہر وقت سامنا ہے غم و یاس کا مجھے،
تڑپا رہا ہے دردِ محبت سوا... مجھے
"شاید نمودِ صبح ہے پیکِ قضا مجھے
کیوں شام ہی سے ظلمتِ شب سوگوار ہے"

عہدِ گذشتہ مہرِ حزیں بھول جائیے
خوابیدہ جذبِ شوق کو اب کیا جگائیے
بگڑے ہوئے نصیب کو کیونکر بنائیے
"یکتا حصولِ عیش میں کیا سر کھپائیے
ہر چیز کائنات کی ناپائیدار ہے"

رزار!

از حضرت مولنا
محمد قمر الدین صاحب
رام نگری

خاص برائے
الاصلاح عید نمبر

مسٹر سی ہلینڈ جنوبی ہند کے کسی علاقہ میں چائے کے ایک باغ کے مالک تھے۔ ان کا ایک اسسٹنٹ تھا جس کا نام گرین تھا۔ ہلینڈ صاحب کے چائے کے باغ سے کوئی ایک میل کے فاصلہ پر چائے کا ایک اور باغ تھا جسے "گولڈن ویلی" کہتے تھے۔ اس باغ کے مالک کا نام اوگریڈی تھا یہ آئرلینڈ کے باشندے اور ایک بوڑھے آدمی تھے۔ مسٹر ہلینڈ اور اوگریڈی روزانہ شام کو آپس میں ملاکرتے تھے۔ اور ادہر اُدہر کی باتوں سے دل بہلایا کرتے تھے انھیں دونوں کے حالات لکھتے ہوئے مسٹر ہلینڈ نے ایک پرچہ میں شیر کی ایک کہانی لکھی ہے۔ مسٹر ہلینڈ لکھتے ہیں:-

"میں ایک روز شام کو گرین کو ساتھ لے کر اوگریڈی کے بنگلے پر گیا۔ وہاں گپ شپ کرکے گھر واپس آرہا تھا۔ آدھا راستہ طے ہوچکا تھا۔ کہ تنگ جنگلی راستے کے ایک موڑ پر گرین کے ہاتھ کے ٹارچ کی روشنی ایک شیر کے بچے پر پڑی۔ وہ چپ چاپ سڑک پہ بیٹھا تھا۔ اس کا قد بلی کے قد سے بھی چھوٹا تھا۔ وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر بھاگا نہیں بلکہ خوش ہوا۔ گرین نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس وقت ہم لوگوں کو یہ خیال نہیں آیا کہ شیرنی اپنے بچے کو چھڑانے کے لئے پاس کی کسی پوشیدہ جگہ سے ہم لوگوں پر حملہ کرسکتی ہے ہم بچے کو گود میں لئے پیار کرتے ہوئے اپنے بنگلے کی طرف بڑھے۔ اس وقت ہم لوگوں کو شیرنی کے حملے کا خطرہ محسوس ہوا۔ پھر بھی ہم لوگوں نے بچے کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ خیر خوش قسمتی سے اس کی ماں نظر نہ آئی اور ہم امن وسلامتی کے ساتھ بنگلے پر پہونچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بچہ ہم لوگوں سے ہل مل گیا۔ اور خوش نظر آنے لگا۔ میں ہی اس بچے کو اپنی گود میں اٹھا کر لایا تھا۔ شاید اسی لئے میں ہی اس بچے کا مالک قرار پایا۔ میں نے دیکھا بچہ بہت خوش مزاج ہے اس لئے میں نے اس کا نام "رزار" رکھا۔ میں نے رزار کے پالنے کا ارادہ تو کرلیا مگر نتیجہ پر غور نہیں کیا۔ اگر مجھ میں غور کرنے کا مادہ ہوتا تو میں جنگل کے اس جانور کو جنگل ہی میں چھوڑ دیتا۔ رات کو شیر کا بچہ میرے ہی سونے کے کمرے میں رہا میرا خیال تھا کہ وہ بھی سویا ہوگا۔ مگر وہ تمام رات جاگ کر میرے جوتوں سے کھیلتا رہا۔ میں نے کمرے کے ایک کونے میں کٹورے میں دودھ رکھ دیا تھا۔ وہ کھیلتے کھیلتے جاتا اور کٹورے کا دودھ پی لیتا۔

میں دوسرے روز اوگریڈی کے ہاں گیا تو ان سے شیر کے بچے کے ملنے کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے سنجیدگی سے سر ہلا کر اس بات کا اظہار کیا کہ ہم دونوں پورے احمق ہیں۔ اگر احمق نہ ہوتے تو شیر جیسے خطرناک جانور کے پالنے کا شوق نہ کرتے۔

رزار کے دن بڑی خوشی سے گذر رہے تھے۔ وہ زنجیر میں بندھا ہم لوگوں کے ساتھ باغ میں ہر طرف گھومتا رہتا۔ وہ کتے کے بچے کی طرح ہم لوگوں کے بس میں آگیا تھا۔ وہ اس طرح کھیلتا تھا۔ لیکن مزدوروں کے ڈیروں میں گھس کر ہنس اور مرغوں کو دوڑانے سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ اس لئے ہمیں اس کی سختی سے نگرانی کرنی پڑتی تھی۔

ایک دن اوگریڈی ہم لوگوں سے ملنے آئے ان کا بل ٹیریر نسل کا کتا جیمی ان کے ساتھ آیا تھا۔ رزار کرسی کے نیچے زنجیر میں بندھا ہوا تھا۔ ہم لوگوں کی توجہ اس طرف نہ تھی یکایک کرسی کے نیچے سے لڑائی کی آواز آئی۔ لیکن ان دونوں کو الگ کرنے سے پہلے ہی جیمی کے تیز دانتوں سے رزار کا ایک کان اور ایک پنجہ صاف ہوچکا تھا میں نے اسی وقت رزار کو وہاں سے لیجا کر اس کی مرہم پٹی کی۔

میں نے اوگریڈی سے کہا۔ وہ اگر اپنے کتے کو سنبھال کر رکھتے تو رزار کی یہ حالت نہ ہوتی۔ رزار کی حالت دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہورہا تھا۔ مگر میں نے اس سے زیادہ ان سے کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ میں ان کی عزت کرتا تھا۔

کچھ دنوں میں رزار تندرست ہوگیا۔ وہ ایک کان اور ایک پنجے سے محروم ہونے کے بعد بھی چاروں طرف گھومتا رہتا تھا چند مہینے کے بعد رزار نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ اس وقت وہ کافی بڑا ہوچکا تھا۔ اور روز بروز برابر بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اس کے ساتھ اس میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہو چلا تھا۔

آخر ایک روز شام کو وہ غائب ہوگیا۔ تین روز تک اس کا پتہ نہ چلا۔ اس کے بعد وہ واپس آیا۔ شاید وہ تین روز تک برابر جنگل میں پھرتا رہا۔ وہ کچھ بدلا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ نوکر نے جیسے ہی اُسے چھوا وہ بپھر سا گیا۔ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں نے اور گرین نے طے کیا کہ اب اسے رخصت کردینا چاہئیے۔ ہم لوگوں کی رائے تھی کہ کوئی حادثہ ہونے سے پہلے ہی اسے کسی حیوانخانے میں بھیجدیں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اسے اپنے سے جُدا کرنا پڑے گا۔ میرا دل بہت اداس ہوگیا تھا۔ وہ کئی مہینے سے میرے ساتھ تھا۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی وہ ہمیشہ سائے کی طرح میرے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگا تھا۔

اسی رات کا واقعہ ہے میں نے اسے اپنے کمرے

میں لے جاکر فرش پر لڑھکا دیا۔ اور اس کے سینے پر اپنے جوتے کی ایڑی پھیرنے لگا وہ اس طرح کے پیار سے بہت خوش ہوتا تھا۔ وہ خوش ہوکر کھیلنے لگا۔ اور دوڑ دوڑ کر میری ران میں دانت گھسنے لگا۔ پھر یکایک اچھل کر الماری پر جا بیٹھا۔ اور وہاں سے تیز نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کے کودنے کا یہ انداز بہت دلچسپ تھا۔ میں پلنگ پر بیٹھا رزار کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا۔ وہ الماری سے میری اوپر کودپڑنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس کا یہ انداز مجھے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا اس وقت مجھے یہ سوچ کر بہت افسوس ہوا کہ جو جانور آزادی کیساتھ جنگل میں پھرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اسے اپنی باقی زندگی لوہے کے پنجرے میں بند ہوکر گذارنی پڑے گی۔

میں نے طے کر لیا کہ اُسے آزادی کا موقع دونگا۔ اور اسی وقت میں نے باغ کا دروازہ کھول دیا۔ ہمارے بنگلے کے چاروں طرف جنگل تھا۔ دروازہ کھول کر میں اپنے پلنگ پر آبیٹھا میرا خیال درست ثابت ہوا رزار میرے پلنگ پر کود کر کچھ دیر تک کھیلتا رہا اس کے بعد کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے روز خبر پھیل گئی کہ رزار غائب ہوگیا۔ مجھے اس خبر پر تعجب تو نہیں ہوا لیکن خواہ مخواہ یہ ظاہر کرنے لگا کہ رزار کے غائب ہونے کا مجھے بہت صدمہ ہے آخر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ جنگل کے جس جانور کو میں نے لاکر پالا تھا۔ وہ جنگل میں واپس چلا گیا۔ یہ اس کے لئے اچھا ہی ہوا۔

دوسرے روز مجھے شیر کا غرانا سنائی دیا جیسے کوئی آرے سے لکڑی چیر رہا ہو۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ میں نے کن کھٹے رزار کو دیکھنے کی اُمید سے خواب گاہ کی کھڑکی سے ٹارچ کی روشنی باہر ڈالی۔ میرا خیال درست نکلا۔ میں رزار کو باغ میں دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ بھوک سے مجبور ہوکر واپس چلا آیا ہے میں نے کچھ گوشت کے ٹکڑے بنگلے کے زینے پر رکھ دئے۔ رزار فوراً وہاں پہونچا۔ اور گوشت کھانے کے دس منٹ بعد پھر غائب ہوگیا۔

اس کے بعد دو روز تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ تیسری رات کو پھر اس کا غرانا سنائی دیا۔ میں نے پہلے دن کی طرح پھر کچھ گوشت کے ٹکڑے رکھ دئے۔ میرا دل یہ سوچ کر بے چین ہوگیا۔ کہ غریب بھوک سے مر رہا ہے۔ لیکن اس روز وہ میرے رکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کو کھانے کے لئے نہیں آیا۔ مجھے اس پر بہت تعجب ہوا۔ مگر دوسرے روز اس کی وجہ معلوم ہوگئی میں اپنی بندوق لے کر سیر کو نکلا۔ تو دیکھا جنگلی بھیڑئیے کے جسم کا تین چوتھائی حصہ ختم ہو چکا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ رزار نے میرے بنگلے میں پرورش پائی تھی۔ پھر بھی اس نے جنگلی بھیڑیا مار ڈالا تھا۔ جنگلی بھیڑیے آسانی سے قابو میں نہیں آتے۔

کئی ہفتے کے بعد ایک روز اطلاع ملی کہ دو میل کے فاصلے پر شیر نے ایک بچھیا مار ڈالی ہے۔ جو آدمی خبر لایا تھا۔ اسے لیکر میں گرہن کے ساتھ اوگریڈی کے پاس گیا۔ وہاں ایک آدمی ملا جس سے معلوم ہوا کہ شیر نے اسی کی بچھیا کو ہلاک کیا ہے اس نے بتایا گھوڑے کی طرح بڑا سا شیر تھا۔ اوگریڈی نے شیر کی کیفیت سن کر منہ پھیر کر کہا "ان لوگوں کی بات پر یقین نہ کرو۔ کچھ دیر کے بعد سنو گے شیر کے سر پر دو سینگ تھے چلو چل کر ہم لوگ دیکھ آئیں۔"

ہم لوگوں نے جاکر وہ جگہ دیکھی۔ رات کو بارش ہوجانے کی وجہ سے وہاں کیچڑ ہوگئی تھی۔ ہم نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر شیر کے پنجے کے نشان دیکھے۔ ایک پاؤں کے پنجے کا نشان غائب تھا۔ اس لئے ہم سمجھ گئے کہ یہ رزار کی کارگذاری ہے۔ اوگریڈی نے اس جگہ کے آس پاس کا معائنہ کرکے کہا "میرے کتے نے تمہارے شیر کا ایک پنجہ چبا ڈالا تھا۔ اس لئے مجرم کا پتہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔"

(باقی صفحہ ۱۰۹ پر ملاحظہ فرمائیے)

حسن تغزل

خاص الاصلاح عید نمبر کے لئے!

(از سحر البیان جناب اقبال خلیلی صفی پوری مقیم حال سیتاپور (یو-پی)

شمعِ گل تھی پھول افسردہ تھے خالی جام تھا
شب کا منظر صبح ہوتے ہی خیالِ خام تھا

کتنا عجلت خواہ حسنِ دوست کا پیغام تھا
آنکھ اُٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ جلوہ عام تھا

رقص میں تھا میکدہ گردش میں دورِ جام تھا
اُن حسیں آنکھوں کی ہر جنبش میں اک پیغام تھا

ایک ہلچل میکدے میں تھی عجب ہنگام تھا
جو بھی نغمہ تھا وہ آوازِ شکستِ جام تھا

سننے والے کچھ نہ سمجھے کہنے والا کہہ گیا
ایک ہی ہچکی میں ساری عمر کا پیغام تھا

اُس رخِ روشن پہ سجدہ ریز تھی زلفِ سیاہ
کفر بھی میرے لئے منجملۂ اسلام تھا

بجلیاں ہنس ہنس کے برسانا تھا اُن کا مشغلہ
بجلیوں سے کھیلتے رہنا ہمارا کام تھا

دور تھا مجھ سے سکونِ زیست جب تک تھی حیات
بند کیں آنکھیں تو پھر آرام ہی آرام تھا

ڈھونڈتی تھی میری توبہ ہر طرف راہِ فرار
سامنے ہی دستِ ساقی میں چھلکتا جام تھا

اک بہانہ کرکے سب نے ساتھ چھوڑا شامِ غم
موت کو فرصت نہیں تھی زیست کو بھی کام تھا

تھا یہ سب اقبال اپنی کم نگاہی کا قصور
ورنہ ہر آغاز کے پردے میں اک انجام تھا

از حضرت شہزادہ ایاز مدیر ظفر ہفت روزہ بمبئی!

میرے سامنے دہلی کا موجودہ دور ہے۔ بڑی چہل پہل ہے۔ ہر طرف سے مغرب زدہ نوجوان انگریزی لباس زیب تن کئے آ جا رہے ہیں۔ عورتیں بھی لپ اسٹک پوڈر لگائے زرق برق ساڑھیاں پہنے اِدھر سے اُدھر جا رہی ہیں۔ تقریباً ہر مشہور مقام پر سینما ہال دکھائی دے رہے ہیں۔ جن کے باہر نیم عریاں ایکٹرسوں کی تصاویر نمائش کے لئے لگی ہیں۔ فٹ پاتھ سے نیچے چلنے کا زمانہ نہیں چونکہ موٹروں کی زیادتی سے خوف ہے کہ ٹکر نہ ہو جائے۔ غرضیکہ عجیب کیفیت ہے۔ جا بجا سستانے کے لئے ریسٹورنٹ موجود ہیں۔ جن میں جدید دریافت ریڈیو سے طرح طرح کے گانے سننے میں آتے ہیں۔ ان سب حسین اور دلچسپ مناظر کے باوجود عزیز کو دہلی ویران نظر آتی ہے۔ یہاں کا ذرہ ذرہ اسے آنکھیں دکھاتا ہے نہ جانے کیوں وہ میرے ساتھ دہلی کی آباد مگر ویران گلیوں سے گذر رہا تھا کہ دفعتاً اس نے چیخ ماری میں گھبرا سا گیا اور اسے تھام لیا اس کے چہرے سے... اضطراب اور کشمکش کے اثرات نمایاں تھے۔ مجھے زیادہ گھبراہٹ اس لئے ہوئی کہ عزیز کی عمر ایک صدی سے متجاوز ہو چکی تھی اور ڈر تھا کہ اس کی حرکت قلب بند نہ ہو جائے۔ وہ بڑا حساس انسان تھا میں کونے کے ایک ریسٹورنٹ تک لے آیا۔

اب کچھ شربت پینے کے بعد اس کی طبیعت سنبھلی تھی۔ میں نے انتہائی خوشامد کے لہجے میں عزیز سے اس پریشانی کی وجہ پوچھی اس نے غم آلود آواز میں کہا:-

"یہ وہی خونی جگہ ہے جہاں میرے خاندان کا وقار بھینٹ چڑھا

اب تو میں اور بھی چوکنا ہو گیا۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:-

"ایک زمانہ تھا جب دہلی آباد تھی۔ یہ مصنوعی چہل پہل نہ تھی بلکہ حقیقی رونق تھی۔ دہلی کے رُخِ رنگین پر شباب پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھا مشرق کی صحیح معصومیت اس کے ہر ذرہ سے نمایاں تھی۔ میرا خاندان حکومت کر رہا تھا۔ وہ حکومت جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ وہ حکومت جس کا دورِ حیات ہندو اور مسلمان کے لئے یکساں حیثیت رکھتا تھا۔ وہ حکومت جس کے زیر سایہ اب کے فرقہ پرست ہندو اور مسلمان صحیح معنوں میں ہندوستانی تھے۔ وہ حکومت جبکہ یہاں کا بچہ بچہ ملک اور قوم کے لئے قربان ہونے کو تیار تھا۔ مگر اب اسی ہندوستان کا بچہ بچہ ایک دوسرے کا دشمن ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دہلی کے اس کوچہ میں لال کنور طوائف رہتی تھی۔ یوں تو یہ طوائف بہت حسین تھی۔ اور دہلی کے رئیسوں کے لئے تو وہ بہت بڑا درجہ رکھتی تھی مگر ہمارے خاندان کے لئے اک بلائے ناگہانی ثابت ہوئی میرا مطلب ہے کہ میرے جدِ امجد سرکارِ عالم جہاندار شاہ کی زندگی کو آسمان کی بلندیوں سے ظلمت کی گہرائیوں میں پھینکنے والی یہی عورت تھی۔ عورت یوں تو ایک معمہ ہے۔ جسے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس کے آنسو اور مسکراہٹ دونوں کا مطلب مرد تو سمجھ نہیں سکتا۔ خیر کچھ بھی مگر اس کے حسن ضیا بار کے افسانے نہ صرف محلِ شاہی تک محدود تھے۔ بلکہ حکومت کے دور دراز حصوں تک اس کی شہرت تھی۔ دہلی کے رئیس اس کے ہاں جانا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ رات دن اس کے یہاں جمگھٹا رہتا اس شمع حسن کے سینکڑوں پروانے اس کے گرد طواف کرتے تھے۔ مگر یہ مغرور لال کنور اپنے حسن کو لازوال سمجھتے ہوئے

آج کل!

خاص الاصلاح عید نمبر کے لئے

(از جناب نظر صاحب امروہوی)

میرے الم کدہ میں وہ مہمان ہے آجکل
دیدارِ حسن دولتِ ارزاں ہے آجکل
دل کو کبھی سکون تھا لیکن یہ کیا ہوا،
پیش نظر ہیں حسن کی رعنائیاں تمام
جی بھر کے دیکھتا ہوں میں ان کو جو بے حجاب
نظروں سے بخشتے ہیں وہ اک زندگیٔ نو

ممنونِ دید دیدۂ گریاں ہے آجکل
ہر اک نگاہ نازِ بداماں ہے آجکل
سینہ میں اک خلش سی جو پنہاں ہے آجکل
نظروں کے سامنے مرا ارماں ہے آجکل
میری نگاہ پر مرا احسان ہے آجکل
تارِ نگاہ... تارِ رگِ جاں ہے آجکل

جانِ نظر نظر کو میسر ہے روبرو!
حاصل ہر اک نشاط کا ساماں ہے آجکل

حریص اور تملق پسند شاعر سے خطاب

از، اے، کے یکتا

بے حمیت، بے حیا، ارذل حریصِ سیم و زر
بیچتا پھرتا ہے تو، جو، اپنے جوہر بے دریغ
تجھ میں صدہا عیب پیدا کر دیئے تحریص نے
زر پرستوں پر، نچھاور ہے سخندانی تری
مفت، اور بے دام بکتی ہیں جس کو، وہ، بندہ ہے تو
سخت حیرت ہے کہ کیوں خاموش ہے تیرا ضمیر،
تیری فطرت کیوں اہانت سے بھی شرماتی نہیں
تجھ پہ اتنی بے حسی آخر ہے کیوں چھائی ہوئی،
لب کشا رہتا ہے، تو، جو اہل زر کی شان میں
ہر گھڑی، ہر وقت ہے، تجھکو، تمول کا خیال
گر صلہ مل بھی گیا، تجھکو بہ "مقدار" "و نیم"
پھر یہ تذلیل سخن کس مصلحت پر صاد ہے
کیوں اہانت پر تُلا ہے فطرت خوددار کی
چھوڑ دے کمبخت اب بھی گڑگڑانا چھوڑ دے

اپنے افعالِ قبیحہ پر، کبھی کی ہے ...... نظر،
کر رہی ہے، ذبح، آئے دن ہوس کی تجھکو تیغ
خام رکھا، شاعری میں بھی، اسی تخصیص نے
چاپلوسی، در بغل ہے، برق سامانی تری
لوحِ فنِ شاعری پر، بدنما دھبہ ہے تو
کر دیا کیونکر گوارا، طرزِ افکار حقیر ؟
کیوں حمیت اور غیرت جوش میں آتی نہیں ؟
کیوں ترے احساس پر ہے موت منڈلائی ہوئی
عقل نے بھی ساتھ چھوڑا، تیرا اس ہذیان میں
کیا کبھی سوچا بھی ہے تو نے گدائے بدخصال !
کام آئیگا ترے کبتک وہ آخر اے لئیم !
تجھ پہ یہ کیسی مصیبت ہے، یہ کیا افتاد ہے ؟
رائیگاں کیوں کر رہا ہے قوتیں افکار کی ؟
چھوڑ دے ہاں شاعروں کا منہ چڑانا چھوڑ دے

تجھکو کچھ حاصل نہ ہوگا اس طریق کار سے !
اور بھی تذلیل ہوگی تیری، اس ہنجار سے !

ان سب سے نفرت کرتی تھی۔ یا شاید اس لئے کہ وہ حسن کا اصلی راز سمجھتی ہوگی۔ کہ شباب ڈھلتے ہی یہ تمام "مرنے والے" اپنی اپنی راہ لینگے۔ خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ لال کنور سب سے نفرت کرتی تھی۔ مگر اس کا بھی ایک محبوب تھا۔ وہ بھی ایک شخص سے محبت کرتی تھی۔ نہ تو وہ کوئی رئیس تھا اور نہ ہی خاندانِ شاہی کا کوئی فرد۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ اس کا ایک ملازم تھا جس کا نام کریم بخش تھا۔ یہ کریم بخش ہی اس کی تمناؤں کا مرکز۔ اس کے شباب کی آرزو۔ اس کے غرور کا مدمقابل تھا۔ وہ اس سے والہانہ محبت کرتی تھی۔ دیوانہ وار عشق کرتی تھی جب تمام دن اور شب کا ایک طویل حصہ گذار دیتے تک۔ رئیس زادوں سے جھوٹی محبت کا ڈھونگ رچاتے تھک کر اٹھتی تو کریم بخش کی آغوشِ محبت میں اس طرح آکر گرتی جیسے کوئی گھائل پرندہ بڑی مشکل سے اپنے آشیانے میں آکر گرے۔ اور عشق کے گہوارے میں میٹھی نیند سو جاتی۔ لیکن یہ حضرتِ عشق سر چڑھ کر بولتے ہیں۔ چھپائے سے نہیں چھپتے۔ کسی گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھائی اور آنے جانے والوں کو کریم بخش کے معاشقہ کی تمام داستان سنا دی۔ بس کیا یہ خبر بجلی کی طرح تمام رئیس زادوں کے کاشانوں پر گری اور ان کے وہ رنگین خواب خاکستر ہوگئے۔ جن کی تعبیر وہ مستقبل قریب میں دیکھ رہے تھے۔ یہ چنگاری آہستہ آہستہ رئیسوں کے سینے میں سلگنے لگی اور شعلہ بن کر بھڑکی اور ایک دن صبح سویرے ہی ہر خاص و عام کی زبان پر کریم بخش کے قتل کی خبر تھی۔ تمام لوگ محوِ حیرت تھے۔ بعض خوش بھی تھے۔ مگر آج پہلا دن تھا کہ لال کنور کی آنکھیں دیکھنے والوں نے شبنمی دیکھیں۔ نگاہیں وہ بھی لال کنور کی نگاہیں جن پر رئیس زادے اپنی زندگی نچھاور کرتے تھے۔ آج طوفان بدوش تھیں۔ اس کی میخانہ بدوش آنکھیں اور ان میں آنسو یوں معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے آسمان پر ستارے چمک رہے ہوں۔ وہ حسن جو بن سنور کر آئینہ خانے سے نکلتا تھا اب سیاہ پوش تھا بال پریشاں کئے۔ خلوت کدہ میں بیٹھا تھا۔ شہر والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ کوئی آرہا تھا کوئی جا رہا تھا۔ مگر ہر ایک اس کی ملازمہ سے افسوس کر کے چلا آتا وہ بھی مہمان خانے میں بت بنی بیٹھی تھی نہ کسی سے بات کرتی اور نہ کسی کو بیٹھنے کی دعوت دیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ تنہائی اس کی غمگسار ہو وہ پھوٹ پھوٹ کر

رونا چاہتی تھی مگر وہ اسے بھی اپنی شان کی منافی سمجھتی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس کے قتل کا بدلہ دہلی کے در و دیوار سے لونگی۔ اور بس چلا تو دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ عورت کی ہٹ مشہور ہے۔ بس وہ اپنی ضد پر اڑ گئی اس کے سامنے صرف ایک ہی چیز تھی اور وہ انتقام۔ انتقام کی آگ اس کے سینے میں سلگ رہی تھی وہ اپنی ویران دنیا کے ساتھ تمام دہلی کو ویران دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر اس نے ایسا ہی کیا۔

(۲)

میں عزیز کی گفتگو خاموش سن رہا تھا مجھے دفتر جانا ضروری تھا مگر یہ داستان کچھ اتنی دلچسپ تھی کہ میں نے وہیں ریسٹورنٹ سے دفتر میں ٹیلیفون کر دیا۔ کہ میں آج نہ آسکوں گا۔ میں ٹیلیفون کر کے دوبارہ عزیز کے پاس آکر بیٹھ گیا اور اس سے اس داستانِ لطیف کے سنانے کی فرمائش کی۔ اسے تو یہ کہانی سنانی ہی تھی اس نے فوراً سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔

لال کنور رات دن یہ کوشش کرنے لگی کہ اس کی رسائی جہاندار شاہ پادشاہ کے دربار تک ہو جائے اور وہ اس خونِ ناحق کا بدلہ لینے کے لئے بارگاہ جہاں پناہ میں استدعا کرے۔

انسان کی آرزوئیں اکثر پوری ہوتی ہیں اور پھر عورت کی آرزو جو اس کی ہٹ لئے ہو یقیناً پوری ہوتی ہے۔ آخر ش ایک دن ایسا بھی آیا کہ حسن و شباب کی دیوی دربارِ پادشاہ میں بے نقاب پہونچی۔ پادشاہ نے بھی اس کے حسن کی داستانیں اکثر سنی تھیں اس کے کانوں تک بھی اس کافرہ کے جمال نظر افروز کے افسانے پہنچے تھے۔ پادشاہ نے پہلی نظر میں دیکھتے ہی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے عوام کے خیالات پر مہر تصدیق لگا دی کہ واقعی لال کنور حسن و شباب کا وہ عطیہ ہے جسے دستِ یزداں نے اہلِ دہلی کے بجائے کونسی ادا بھا جانے پر عطا فرمایا ہے۔

پادشاہ نے لال کنور کی داستانِ غم نسی حسن بیکار ان کے روپ میں دربارِ نیوری میں کھڑا تھا اور منتظر تھا کہ پادشاہ اس کی عرضداشت کا جواب دیں گے۔ (باقی صفحہ ۱۰۷ پر دیکھئے)

خاص الاصلاح

سوزِ ناتمام

(از محترمہ جاوید سلمیٰ صاحبہ)

عید نمبر کے لئے !!

میں تنگ آگئی ہوں سوزِ غمِ نہاں سے
اے کاش! کوئی شعلہ ظاہر ہو آشیاں سے

منزل کے پاس جا کر مجھکو بھی یاد کریں
اتنی سی ہی گذارش یارانِ کارواں سے

ہر لفظ ہے فسانہ فرقت کی داستاں کا
تم ہی ذرا بتا دو چھیڑوں کہاں کہاں سے

دنیا کی کشمکش نے وہ بھی بجھا کے رکھدی
کچھ روشنی سی دل میں آئی تھی لامکاں سے

منزل قریب تر ہے۔ دل پست ہو رہا ہے
بیٹھوں کہاں کہاں پر، اٹھوں کہاں کہاں سے

دم بھر میں روشنی تھی دم بھر میں تھا اندھیرا
امید یہ نہیں تھی اس پردۂ گماں سے

اب بھول جاؤ سلمیٰ جو کچھ گذر چکی ہے،
اپنی جبیں اٹھا لو اس بت کے آستاں سے

جو مرا خط لے چلا
وہ کبوتر جل گیا
ریڈیو اسٹیشن کے مشہور گویئے
مسٹر کارچ والا
نے
جو کبوتر کا معجزہ گایا تھا اسے برادرانِ اسلام نے بہت پسند کیا اور عوام کے اصرار پر انہیں
بار بار اسے ریڈیو پر گانا پڑا
اب عوام کی اس معجزے سے غیر معمولی دلچسپی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ٹوئن ریکارڈ کمپنی نے اس کا
ریکارڈ تیار کیا ہے!
الف، ٹی ۱۵۳۲۰
جو مرا خط لے چلا تھا........ آزاد افغان کرت
بھیدی بھید نہ کھلنے پائے........
اس معجزہ نما ریکارڈ کو سننے کا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیجئے، آپ اسے ہر گراموفون ڈیلر سے حاصل کر سکتے ہیں!!!
دیگر ریکارڈوں کی تازہ فہرست ملاحظہ فرمائیے!
ہمارے فیکٹرز:۔ اے، کے دارا، کالبا دیوی روڈ بمبئی ــ بی، جی جمنگی عابد روڈ حیدرآباد دکن!!
The TWIN
دی ٹوئن ریکارڈ کمپنی فورٹ بمبئی
THE TWIN RECORD Co
FORT, BOMBAY.

محمد بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار ہند

سلطنت مغلیہ کے عہد زوال میں محمد بہادر شاہ ظفر ۱۸۳۷ء
میں تخت حکومت پر متمکن ہوئے آپ کے عہد میں ہندوستان
کے چپہ چپہ پر ہر قوم و فرقہ میں بغاوت کارفرما تھی
اور عہد مغلیہ کا جاہ و جلال اور اقتدار
و انصرام ہچکیوں پر ہچکیاں لے
رہا تھا۔ آپ نے بہ دقت تمام
۲۰ سال تک حکومت کی اور ۱۸۵۷ء
میں بغاوت کے فرد ہو جانے پر
آپ کو گرفتار کر کے رنگون
بھیجا گیا جہاں آپ نے قید
خانہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

غازی محمد بن قاسم ہندوستان کا فاتح اول

غازی محمد بن قاسم نے جن کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر زریں
حروف سے لکھے ہوئے ہیں حاکم بصرہ کے حکم سے ۷۱۱ء میں ایران اور
بلوچستان کے سنگلاخ ساحلی میدانوں کو طے کر کے بہ دقت تمام ہندوستان
پر حملہ کیا اور شہر دیبل کے قرب و جوار میں جو دریائے سندھ کے
کنارے موجودہ شہر کراچی کے قریب آباد تھا، پڑاؤ ڈالتے ہوئے
سارے شہر کا محاصرہ کیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اس
شہر پر اپنی فتح کا پرچم لہرا کر ۷۱۲ء میں راجہ داہر کی
سرکوبی کے بعد ملتان وغیرہ تک پہونچتے ہوئے ایک قلیل عرصہ میں
آندھی کی طرح ہندوستان کے بیشتر حصہ پر تسلط
حاصل کیا، آپ تسخیر ہند سے ابھی فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ
۷۱۵ء میں سلیمان ابن عبدالملک کے حکم سے آپ کو گرفتار کر کے
عراق میں قید کر دیا گیا۔ جہاں آپ نے
چند روزہ سخت اور شدید
تکالیف کے بعد جام شہادت
نوش فرمایا

بقیہ صفحہ نمبر (۲۷)

ان تمام باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ باوجود اس قدر قدرتی سہولتیں مہیا ہونے کے بھی ہندوستان ترقی کے میدان میں سب سے پیچھے ہے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان مصنوعات میں ترقی نہیں کر سکتا وہ غلطی پر ہیں اس لئے کہ تمام مصنوعات کا دار و مدار پیداوار خام پر ہے اور جب تک پیداوار خام دستیاب نہ ہو اس وقت تک کوئی ملک کیونکر ترقی کر سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں پیداوار خام کی کوئی کمی نہیں بلکہ مصنوعات کے لئے جتنی پیداوار خام یہاں دستیاب ہوتی ہے اتنی تو شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں ہوتی ہوگی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کو مصنوعات کی ترقی سے روکا جاتا ہے۔ ہم بچپن کے زمانے میں بطور قصہ کے یہ سنا کرتے تھے کہ فلاں ملک میں ابلتے ہوئے چشمے موجود ہیں اگر ان میں چاول ایک کپڑے میں باندھ کر ڈال دیں تو فوراً ابل جاتے ہیں۔ یا ایک مقام پر ایک مریض نے جس کا مرض لا علاج ہو گیا تھا غسل کیا اور اچھا ہو گیا لیکن یہ تمام باتیں قصوں اور کہانیوں تک ہی محدود تھیں مگر آج کل کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دراصل یہ باتیں کہانیاں نہیں واقعات ہیں اور وہ ملک جس کے قصے مشہور تھے حقیقت میں یہ ہندوستان ہی تھا خدا جانے اس سرزمین میں اور کیسے کیسے خزانے موجود ہیں۔ یہ ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ ان انمول چیزوں کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اس لاعلمی اور بے اعتنائی کے ذمہ دار صرف اہل ہند ہی نہیں بلکہ موجودہ حکومت بھی ہے۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ شمالی ہند کا میدان دریاؤں کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ یہ میدان بحیرۂ عرب سے لیکر خلیج بنگال تک طول میں تقریباً نو سو میل اور عرض میں ڈیڑھ سے لیکر تین سو میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس حصہ میں آبادی کی بہت کثرت ہے۔ ملک کا یہ حصہ ہندوؤں کے نزدیک بہت مقدس اور قابل قدر ہے سرزمین گوکل۔ بندرابن۔ بنارس وہ مقدس اجودھیا جہاں ہندوؤں کے جد امجد اکشواکو نے سب سے پہلے حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی شمالی میدان میں واقع ہیں اس میدان کی اہمیت کا انحصار دراصل اس کے دریاؤں اور ان کے معاونین پر ہے جو شب و روز اس کی آبپاشی میں مشغول ہیں۔

دریائے سندھ!

یہ دریا جھیل مان سرور سے نکلتا ہے اٹھارہ سو میل کی مسافت طے کر کے کشمیر کی سبزہ زار وادیوں میں داخل ہوتا ہے اور مقام اٹک سے ہوتے ہوئے جنوب کی طرف ایک ہزار میل بہہ کر کراچی کے قریب بحیرۂ عرب میں جا ملتا ہے۔ کشتیاں اس کے دہانے سے ... اٹک تک چلتی ہیں۔ جہلم۔ چناب راوی۔ بیاس۔ اور ستلج اس کے معاون ہیں۔ جو ایک دوسرے میں ضم ہو کر بمقام مٹھن کوٹ اس سے آکر ملتے ہیں۔ یہ پانچوں دریا پنجاب کے لئے پنجتن کا سایہ ہیں۔ انہیں دریاؤں کی بدولت اس سرزمین کا نام پنجاب رکھا گیا۔ یعنی پانچ دریاؤں کی زمین۔ یہاں بارش کافی نہیں ہوتی لیکن انہیں دریاؤں سے نہریں

نکالی گئی ہیں جن سے لاکھوں ایکڑ زمین سیراب ہو رہی ہے۔ پنجاب کی تمام تر دار و مدار انہیں دریاؤں پر ہے۔

دریائے گنگا

یہ دریا ہردوار کے قریب مقام گنگوتری سے نکلتا ہے اور پندرہ سو ساون میل کی مسافت طے کرتے خلیج بنگال میں جا ملتا ہے۔ اس دہانے سے لیکر کانپور تک بڑی بڑی کشتیاں چلتی ہیں۔ کسی زمانہ میں تجارت کی سب سے بڑی شاہراہ تھی۔ لیکن آج کل ریلوں کی وجہ سے اس کی رونق کم ہوگئی ہے زراعت میں اس سے بڑی مدد لی جا رہی ہے۔ بڑی بڑی نہریں نکال کر زمینوں کو سیراب کیا جا رہا ہے۔ گنگا ہندوؤں کے نزدیک متبرک دریا ہے۔ اس کے کنارے پر کاشی۔ پریاگ متھرا۔ جیسے متبرک اور کانپور۔ الہ آباد۔ پٹنہ۔ کلکتہ۔ جیسے بڑے بڑے تجارتی شہر آباد ہیں۔ عرصہ دراز سے ہندو اس کو مقدس مانتے ہیں۔ اور گنگا مائی کے پیارے نام سے اسے یاد کرتے ہیں۔ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ اس میں غسل کرنے سے انسان پوتر ہو جاتا ہے۔ اس کے پانی کی اس قدر قدر کی جاتی ہے کہ لوگ جو گنگا جل لے جاتے ہیں۔ وہ دور دراز مقامات پر قیمت کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ گنگا اپنے منبع سے لیکر دو سو میل تک نہایت تیزی سے بہتی ہے۔ لیکن جوں ہی وہ میدان میں داخل ہوتی ہے اس کی رفتار بہت سست پڑ جاتی ہے اور جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے رفتار اور سست اور دھیمی ہوتی جاتی ہے۔ جب وہ دریائے برہمپتر میں ملتی ہے تو اس کا پانی رکنے لگتا ہے جس کی وجہ سے وہ مٹی جو اس کے ساتھ بہہ آتی ہے۔ تہ نشین ہونے لگتی ہے اس سے اس کے معاونوں کی رفتار بھی دھیمی پڑ جاتی ہے۔ اور ان کی مٹی بھی جمنے لگتی ہے۔

دریائے جمنا اس کا سب سے بڑا معاون ہے یہ بھی قریب قریب اسی مقام سے نکلتا ہے اور الہ آباد کے مقام پر اس سے جا ملتا ہے۔ ان دونوں دریاؤں نے اپنی لگاتار معاونوں سے شمالی میدان کو نہایت خوشنما بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ میدان سب سے زیادہ زرخیز ہے جمنا کے علاوہ گھاگرا۔ گنڈک کیشی اور سون بھی گنگا کے معاون ہیں۔

دریائے برہمپتر

یہ دریا ایک ہزار آٹھ سو میل لمبا ہے۔ دریائے سندھ کی طرح جھیل مان سرور سے نکلتا ہے آٹھ سو میل مشرق کی طرف بہہ کر ہندوستان کا راستہ لیتا ہے اور مقام گوالینڈو پر دریائے گنگا سے جا ملتا ہے اس میں دہانے سے لیکر مقام ڈبرو گڑھ تک کشتیاں چلتی ہیں۔ اس دریا کے بھی بڑے بڑے معاون ہیں۔ جو تمام مشرقی بنگال اور آسام کو سیراب کرتے ہیں۔ یہاں پانی کی اس قدر کثرت ہے کہ بجائے روکنے اور جمع کرنے کے خارج کرنے کی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں۔ کیونکہ یہ دریا گنگا سے بہت بڑا ہے اور اس کے پانی کا زور بھی زیادہ ہے۔ جہاں یہ دونوں دریا ملتے ہیں۔ . . . . وہاں سے لیکر وہ دہانے تک گمنام کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ان کے دہانے کے قریب گاد اور مٹی کے جم جانے سے رکتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا پھیلاؤ نہایت وسیع اور گہرائی بہت زیادہ ہو جاتی ہے پانی کو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے پانی کی کئی شاخیں نکل آتی ہیں ان میں سے بعض تو میدان کے گرد گھوم کر پھر واپس گنگا میں جا ملتی ہیں۔ اور بعض سیدھی سمندر میں جا گرتی ہیں۔ ان شاخوں میں اکثر جزیرے بن گئے ہیں۔ جہاں لوگ آباد ہیں۔ عرصہ دراز سے یہ دریا اور اس کے معاون آمد و رفت کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں ان کی رونق اور چہل پہل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ریلوں کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے تمام تجارتی مال و اسباب کشتیوں اور ہاتھیوں پر لاد کر ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہونچایا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے ہاتھی اور کشتیاں رکھی ہیں جو بار برداری کے کام آتی ہیں۔ بنگال کے لیے ہاتھی بڑی دولت ہے۔ بڑے بڑے گنجان بنوں اور دلدلوں میں سوائے اس کے اور کسی کا گزر نہیں۔

شمالی دریاؤں کی ایک خاص اہمیت صرف یہ ہے۔ کہ ان کو ہمالیہ کے دونوں جانب سے پانی ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بلند مقامات سے بہنے کی وجہ سے وہ چٹانوں کو تراشنے اور کاٹنے کا خوب کام انجام دیتے ہیں۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہی مٹی جو کاٹ کر وہ اپنے ساتھ بہالاتے ہیں بسا اوقات سیلاب کے وقت کناروں کے دونوں جانب جم جاتی ہے۔ اور اس طرح آئے دن کے سیلاب ان کے اطراف و اکناف کی زمینوں کو زرخیز بناتے رہتے ہیں۔ ان دریاؤں کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ میدان میں نہایت آہستہ آہستہ بہتے ہیں اس کی وجہ صرف میدان کی ہمواری ہے۔ کشتیوں کے لیئے ان کا بہاؤ نہایت موزوں اور مفید ہے وہ نہایت آسانی کے ساتھ اوپر نیچے آتی جاتی ہیں۔ ان دریاؤں سے آبپاشی میں بڑی مدد لی جا رہی ہے۔ ایک زمانے میں آبادکاری کا سبب یہی دریا تھے جتنے بھی پرانے شہر آج کل موجود ہیں وہ سب کسی نہ کسی دریا کے کنارے آباد ہیں بعض دریاؤں نے زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنا راستہ بھی بدل دیا ہے۔ زمین کی نرمی اور گاد کی تہہ نشینی سے دریاؤں کو مجبوراً اپنا قدیم راستہ چھوڑ دینا پڑا۔ شہر ہستنا پور کسی زمانے میں گنگا کے کنارے آباد تھا۔ لیکن آجکل دریا اس سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر بہتا ہے۔ قنوج بھی جو مہاندان راٹھور کے زمانے میں تجارت

کا مرکز اور دار السلطنت تھا۔ دریائے گنگا ہی کے کنارے آباد تھا۔ مگر ان دنوں گنگا اس سے دو تین میل ہٹ کر بہتی ہے۔

مندرجۂ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی خصوصیات دراصل دریا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سرزمین تہذیب و تمدن کا مرکز۔ علوم و فنون کا معدن اور بیشمار دولت کا مخزن بنی رہی ہیں کروڑہا روپیوں کی تجارت ان دریاؤں کے ذریعہ سے ہوتی رہی۔ دریا گذشتہ زمانے میں آمد و رفت اور آبادی کا واحد ذریعہ بنے ہوئے تھے۔

دکن کی سطح مرتفع

دکن ایک مثلث نما سطح مرتفع ہے۔ مشرقی اور مغربی گھاٹ اس کے دو اضلاع ہیں۔ جو نلگری پر آکر ملتے ہیں۔ یہی نلگری اس مثلث کا زاویہ راس ہے جس کا قاعدہ کوہ بندھیاچل ہے یہاں پر مثلث کا عرض ایک ہزار میل ہے۔ بندھیاچل کی بلندی ایک ہزار فٹ سے زیادہ اور دو ہزار فٹ سے کم ہے کوہ ستپڑا اسی کے جنوب میں تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ سمندر سے اس سطح مرتفع کی بلندی ایک ہزار سے لیکر دو ہزار فٹ تک پائی جاتی ہے یہ سطح مغرب کی طرف بلند اور مشرق کی طرف تدریجاً پست ہوتی گئی ہے۔ اسی لئے قریب قریب دکن کے تمام دریا سوائے نربدا اور تاپتی کے مغرب سے مشرق کی طرف بہتے ہیں اس سطح کے مشرق میں مشرقی گھاٹ کوئی ڈیڑھ ہزار فٹ بلند ہے لیکن کٹا پھٹا واقع ہوا ہے۔ تمام دریا اس کی پست گھاٹیوں سے گذر کر خلیج بنگال میں گرتے ہیں۔ مغربی گھاٹ تقریباً طول میں ایک ہزار میل تک پھیلا ہوا ہے۔ مگر مشرقی گھاٹ کی طرح خشک اور ویران نہیں اسی مغربی سلسلہ سے دکن کے بڑے بڑے دریا نکلتے ہیں ہمالیہ کے بعد یہی ایک پہاڑ ہے جہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے۔ دکن کے شمالی اور مغربی سلسلوں میں بھی شملہ اور نینی تال جیسے خوبصورت اور خوشگوار مقامات آباد ہیں جہاں موسم گرما میں حکام وقت اور اکثر اشخاص قدرتی منظر کا لطف اٹھانے کے لئے آتے ہیں۔ بندھیاچل

میں چھپڑی علاقہ ناگپور اور کوہ ست پڑا میں چکالدا صوبہ برار کا صدر مقام گرما ہے ان کے علاوہ کونور۔ کوٹاگری۔ مدن پلی بھی اپنی آب و ہوا کے لئے بہت مشہور ہیں۔

دریائے گوداوری

دکن کے تین بڑے دریا گوداوری۔ کرشنا اور کاویری بہت مشہور ہیں۔ دریائے گوداوری ضلع ناسک میں ترمبکشور کے میدان سے نکلتا ہے اور نو سو میل مشرق کی جانب بہہ کر راج مہندری کے قریب خلیج بنگال میں گرتا ہے۔ یہ دریا ایک حد تک ریاست حیدر آباد کی شمالی سرحد کا کام دیتا ہے۔ اس کے دہانے کے قریب بندھ باندھکر نہریں نکالی گئی ہیں جو شمالی سرکار کے علاقہ کو سیراب کرتی ہیں۔

دریائے کرشنا

یہ دریا کوئی آٹھ سو میل لمبا ہے۔ مہابلیشور کے مقام سے نکلتا ہے اس کے دہانے پر بھی بندھ باندھ کر نہریں نکالی گئی ہیں یہ دریا بھی ریاست حیدر آباد کی جنوبی سرحد کا کام دیتا ہے۔ دکن کے ان دونوں دریاؤں سے کوئی مزید فائدہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک میں ترقی کے نئے نئے طریقے اختیار نہ کئے جائیں۔ ریاست حیدر آباد دکن میں ان دریاؤں کی شاخوں سے بڑے بڑے تالاب بنائے جا رہے ہیں۔ دریائے موسیٰ سے جو دریائے کرشنا کا معاون ہے اور جس کے دونوں جانب شہر حیدر آباد بسا ہوا ہے گنڈی پیٹ کا تالاب تیار کیا گیا ہے اس کا نام عثمان ساگر رکھا گیا ہے۔ حمایت ساگر بھی چھوٹی چھوٹی ندیوں سے بن کر تیار ہو گیا ہے۔ دریائے مانجرا سے بھی جو دریائے گوداوری کا معاون ہے دو تالاب بنائے گئے۔ آج کل ضلع نظام آباد میں اسی سے نظام ساگر تیار کیا جا چکا ہے۔ یہ اس قدر زبردست ہے کہ اس سے ریاست حیدر آباد کی لاکھوں ایکڑ زمین سیراب ہوگی۔ اس کی نہروں میں ہمیشہ ۹ فٹ گہرا پانی بہتا رہے گا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی چلا کریں گی۔ ان طریقوں کو دیکھ کر یہ امید ہوتی ہے کہ حیدر آباد کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا۔

دریائے کاویری

دکن کے دریاؤں میں دریائے کاویری بڑے کام کا دریا ہے اس سے بے شمار فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ کورگ سے نکلتا ہے اور مشرقی گھاٹ کو پار کر کے خلیج بنگال میں جا ملتا ہے۔ سی سمندرم کے مقام پر اس کا ایک بڑا آبشار موجود ہے۔ جس سے بہت کچھ برقی قوت حاصل کی جا رہی ہے۔ اس مقام سے بنگلور کوئی ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں روشنی کا کام اسی سے لیا جا رہا ہے۔ کولار کی کانیں بھی سی سمندرم سے نوے میل دور ہیں۔ ریاست میسور میں سونا انہی کانوں سے نکالا جا رہا ہے۔ یہاں کی کلیں اسی آبشار کے زور سے چل رہی ہیں۔ جو برقی قوت اس آبشار سے پیدا کی جاتی ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ مدراس گورنمنٹ کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس دریا کے دہانے پر بھی بند باندھ کر نہریں نکالی گئی ہیں۔ جن سے تنجور کا علاقہ نہایت سرسبز و شاداب بن رہا ہے۔

دکن کے شمال میں کوہ بندھیاچل واقع ہے۔ اس کے دامن میں بڑے بڑے گنجان بن موجود ہیں۔ اس پہاڑ سے تین بڑے دریا نکلتے ہیں۔ ایک نربدا دوسرا تاپتی۔ تیسرا مہاندی۔ پہلے دو دریا بھڑوچ اور سورت کے قریب بحیرۂ عرب میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے دہانوں سے چند میل اوپر تک کشتیاں چلتی ہیں۔ یہ دریا بھی زمین کی ناہمواری کی وجہ سے بہت تیز رو ہیں۔ ان میں کشتیوں کا چلنا تو کجا۔ نہریں بھی نکالی نہیں جا سکتیں۔ ہاں البتہ ان کے اطراف و اکناف کا میدان نہایت سرسبز اور زرخیز ہے۔ اب رہا تیسرا دریا تو وہ مشرق کی طرف بہتا ہوا علاقہ اڑیسہ میں داخل ہوتا ہے اور مقام کٹک کے قریب خلیج بنگال میں جا ملتا ہے۔ اڑیسہ میں اس سے کئی نہریں نکالی گئی ہیں۔

دکن کے دریا بمقابل شمالی میدان کے دریاؤں کے چھوٹے اور کم مایہ ہیں ان میں اتنا پانی نہیں رہتا جتنا کہ شمالی دریاؤں میں بہتا ہے۔ دکن کی زمین میں نشیب و فراز زیادہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے دریا تیز رو ہیں۔ ناہموار سطح کے باعث ان میں کشتیاں بھی نہیں چل سکتیں۔ نہریں اس لئے نہیں نکالی جاتیں کہ ان میں پانی بہت کم رہتا ہے۔ شمالی اور دکنی دریاؤں میں یہی ایک بڑا فرق ہے کہ شمالی دریاؤں کو ہمالیہ کے شمالی اور جنوبی دونوں پہلوؤں سے پانی دستیاب ہوتا ہے۔ مزید برآں بارش کے علاوہ پگھلی ہوئی برف کا پانی بھی ان میں بکثرت آتا ہے۔ اس کے برعکس دکنی دریا بہت کم مایہ ہیں۔ اول تو ان کا کل انحصار بارش پر ہے۔ دوم یہ کہ دکن کے پہاڑوں پر برف گرنے نہیں پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک بارش کا زمانہ رہا دریا چڑھاؤ پہ رہتے ہیں جہاں موسم گرما آیا یہ دریا اترنا شروع ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض دریا تو بالکل پایاب ہو کر خشک ہو جاتے ہیں۔

ساحلی میدان

یہ میدان ایک طرف مشرقی اور مغربی گھاٹ اور دوسری طرف سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ بہت سے چھوٹے بڑے دریا جو پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ اس میدان میں بہتے ہیں اور اس کو سیراب کرتے ہوئے سمندر میں جا ملتے ہیں۔ دریاؤں کی کثرت اور بارش کی بہتات کی وجہ سے یہ میدان بہت زرخیز ہے۔ طول میں تو یہ میلوں چلا گیا ہے اور عرض میں بہت تنگ ہے بعض جگہ اس کی چوڑائی صرف پچاس میل ہے بڑے بڑے دریاؤں کی عنایت سے اس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جاتا ہے دریاؤں کے دہانوں پر کئی سو میل زمین نکل آئی ہے اسی کو سندربن کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دریائے سندھ۔ گوداوری۔ کرشنا۔ کاویری اپنے اپنے دہانوں پر نئی زمین تیار کر رہے ہیں۔

اس میدان میں بہت سے مشہور اور تاریخی شہر آباد ہیں۔ جو تجارت کے خاص ضامن ہیں ان میں کراچی، بمبئی، مدراس کلکتہ خاص کر قابل ذکر ہیں یہ ہندوستان کے سب سے بڑے تجارتی بندرگاہ ہیں ہندوستان کی تمام پیداوار خام انہیں بندرگاہوں سے لاکر غیر ممالک کو جاتی ہے اور تمام مصنوعات غیر ملکی انہیں کے ذریعہ سے اندرون ملک پہنچائی جاتی ہیں۔

بارش

آبپاشی کے نئے نئے ذرائع پیدا کئے جانے سے پیشتر بارش کو بہت بڑی اہمیت حاصل تھی زیر۔

کاشت زمین کے ایک بڑے حصہ کا انحصار محض بارش پر تھا۔ پنجاب کی زمین نہروں کے نکلنے سے پہلے اس قدر زرخیز اور زیر کاشت نہ تھی جتنی کہ آج کل نظر آتی ہے۔ بارش وہاں بہت کم ہوتی ہے جو آبادی اور زمین کا لحاظ کرتے ہوئے نہایت ناکافی ہے۔
آج کل ہندوستان کی افتادہ اور بنجر زمین کا ایک بڑا حصہ انہیں نہروں کی بدولت جل تھل نظر آتا ہے۔ اب بھی تین چوتھائی زراعت کا دارو مدار محض بارش پر ہے۔ بارش کا زمانہ شروع ہونے سے چند روز پیشتر اکثر کاشتکار اس امید پر کہ اگر بارش کے انتظار میں رات دن آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔
بارش کی کیفیت ہندوستان میں مختلف مقامات پر مختلف نظر آتی ہے۔ یوں تو ملک کے ہر حصہ میں بارش ہوتی ہے۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔ دکن کے آباد ہونے سے پہلے یہاں بڑے بڑے گنجان بن موجود تھے۔ جن میں سوائے درندوں کے اور کسی انسانی آبادی کا پتہ نہ تھا۔ تاریخ سے خود اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ دکن شمالی ہند کے بہت عرصہ بعد آباد ہوا۔ آریاؤں نے اس کا نام ڈنڈک بن رکھا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہاں بارش کثرت سے ہوا کرتی تھی۔ ورنہ ایسے بڑے بڑے بنوں کا قیام بغیر کثرت بارش کے ناممکن تھا۔ لیکن آج کل ان بنوں کے کٹ جانے اور زمین کے صاف ہو جانے سے بارش بہت کم ہوتی ہے۔
یہاں کوئی ایسا بلند پہاڑ نہیں جو باد برشگال کو روک سکے البتہ صرف ایک مغربی گھاٹ ہے جہاں بارش خوب ہوتی ہے۔ لیکن اس سے دکن کو کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ بارش زیادہ تر اس کے مغربی پہلو پر ہوتی ہے۔

نہیں ہوئی۔ کوواروں پر کچھ بارش ہو جاتی ہے۔ جنوب مغربی باد برشگال کے ختم ہوتے ہی جنوب مشرقی باد برشگال کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ باد برشگال خلیج بنگال سے اٹھتی ہے۔ اور علاقہ مدراس پر برستے ہوئے تیچے اودھ اور پنجاب کی طرف جاتی ہے۔ اس سے مدراس اور مشرقی پنجاب بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے دکن کا مشرقی حصہ بھی اس سے تھوڑا بہت مستفید ہو جاتا ہے۔ اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باد برشگال کی ان دونوں دھاروں سے ہندوستان میں بارش کی کیفیت یکساں نہیں رہتی صرف انہیں مقامات پر بارش خوب ہوتی ہے جو ان دھاروں کے راستوں پر واقع ہیں۔ یہ دھاریں ہمیشہ ترچھی چلا کرتی ہیں اس کا باعث صرف زمین کی گردش ہے۔

موسم موسموں کے باب میں ہندوستان نہایت ہی عجیب و غریب ملک ہے ساری دنیا میں صرف دو موسم ہوتے ہیں لیکن ہندوستان پر خدا کی خاص رحمت ہے بجائے دو کے یہاں تین موسم پائے جاتے ہیں۔ گرمی کا موسم مارچ سے شروع ہوتا ہے۔ اور جون پر ختم ہوتا ہے۔ برسات جون سے لیکر اکتوبر تک رہتی ہے اور اکتوبر سے مارچ تک جاڑا پڑتا ہے ان موسموں کی حالت مختلف مقامات پر مختلف پائی جاتی ہے۔ خط سرطان ہندوستان کے قریب قریب وسط سے گذرتا ہے۔ اس خط کا شمالی حصہ منطقہ معتدلہ میں واقع ہے اور جنوبی منطقہ حارہ میں۔ اس کی وجہ سے کہیں گرمی زیادہ پڑتی ہے۔ تو کہیں کم کسی مقام پر حرارت ۱۲۰ درجہ پر پہونچ جاتی ہے۔ تو کہیں اس کی حالت ۷۰، اور ۱۵ درجے کے درمیان رہتی ہے۔ شمالی حصوں میں جیسی سردی پڑتی ہے۔ ویسی دکن میں نہیں پڑتی ہے اور نہ دکن کی سی گرمی وہاں پڑتی ہے بعض مقامات ایسے ہیں جہاں سردی انجماد کی حد تک پہونچ جاتی ہے اور بعض مقامات ایسے ہیں جہاں سردی گرمی کا اوسط مساوی رہتا ہے۔ اسی لئے ہندوستان میں موسموں کی حالت کبھی یکساں نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ نشیب و فراز فلک بوس پہاڑ ناہموار میدان۔ ریگستان اور ساحلی میدان دریا اور سمندر ملک کے موسموں پر مختلف اثرات ڈال رہے ہیں۔ ہندوستان میں پانی کی تقسیم بھی برابر نہیں سندھ اور راجپوتانہ میں پانی بہت کم رہتا ہے۔ دکن میں کوئی کافی بارش نہیں ہوتی جتنی بارش آسام کی پہاڑیوں پر ہوتی ہے اتنی دنیا کے کسی مقام پر بھی نہیں ہوتی۔ برما کے اراکان یوما اور مغربی گھاٹ پر بھی خوب مینہ برستا ہے۔ باد برشگال کی جنوب مغربی ...... ہندوستان کے لئے بہت مفید ہے۔ کسی سال یہ دل کھول کر نہ برسے تو قحط پڑ جاتا ہے۔ کاشتکاروں کی ہمتیں پست اور جانور بھوکوں مرنے لگتے ہیں موسموں

ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش جنوب مغربی باد برشگال سے ہوتی ہے۔ یہ باد برشگال ماہ جون میں بحیرہ عرب سے اٹھنا شروع ہوتی ہے اور ستمبر کے آخر تک ہندوستان میں برستی رہتی ہے سب سے پہلے مغربی گھاٹ اس کو روکتا ہے اس کے بعد وہ سطح مرتفع دکن کو پھلانگ کر کوہ بندھیاچل پر برستی ہوئی بنگال اور آسام میں پہنچتی ہے۔ جہاں وہ ہمالیہ سے ٹکرا کر اپنا رخ بہار اور اڑیسہ کی طرف پھیرتی ہے۔ اور اس سرزمین پر دل کھول کر برستی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارش آسام میں مقام چراپونجی پر ہوتی ہے۔ اس کا سالانہ اوسط چار سو لے کر چار سو ساٹھ انچ تک رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔ مغربی گھاٹ پر تین سو اور چار سو کے درمیان بارش ہوتی ہے۔
دکن کا اوسط بتیس انچ اور سندھ اور راجپوتانہ کا چار انچ ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ان علاقوں میں بارش نام کو بھی

کا اثر امراض پر بھی پڑتا ہے خاص خاص موسم خاص خاص امراض کے لئے مشہور ہیں۔ آج کل ملیریا کو موسم سرما خوب بھاتا ہے۔ اس کا منحوس قدم ہندوستان میں مستحکم ہوتا نظر آتا ہے۔ گزشتہ کئی سال سے اس نے حیدرآباد کو بھی اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ اس لئے کہ اس شہر کی آب وہوا اس کے لئے مناسب نظر آتی ہے۔ ہیضہ کے لئے بارش کا زمانہ مخصوص ہے۔ اکثر شہر اور گاؤں کی غلاظت اور بدبو کے سڑ جانے سے یہ مرض پھیلتا ہے۔ اور اس پر بارش کا ہونا گویا آگ پر تیل ڈالنا ہے۔

اجمالی نظر ہم نے ہندوستان کے قدرتی نواح کو کل چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک کا جدا جدا بیان لکھا ہے۔ اب ہم اجمالی طور پر بتائیں گے کہ انسان کے ہر شعبۂ زندگی پر ان کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ اور کیوں کر انسان کی تمام زندگی کا دار و مدار انہیں قدرتی نواح پر ہے۔ جن سے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی علیحدہ نہیں ہو سکتا۔

کوہ ہمالیہ کے احسانات اور فوائد کا ذکر کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس سے بے شمار فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ اگر سچ پوچھو تو سب کچھ کیا دھرا اسی ہمالیہ کا ہے۔ دریا اور دریاؤں سے آبپاشی۔ آمد و رفت کے وسائل۔ آبادکاری کے ذرائع زراعت کا باعث۔ گنجان بن۔ پھل۔ پھول سایہ۔ لکڑی۔ غلہ۔ اناج۔ معدنیات کی۔ نباتات۔ غرض کہ ہر وہ چیز جو اس وقت ہم کو میسر ہے وہ ہمالیہ ہی کی برکت ہے اگر یہ نہ ہوتا تو تمام چیزیں خواب و خیال ہو جاتیں اور آج یہ ہندوستان جس کا نمبر زرخیزی کے باب میں سب سے اول ہے۔ شمالی تباہ کن ہواؤں کا شکار بن جاتا اور ایسی صورت میں انسان کا معاشی مقصد کہ وہ ایک خوشحال زندگی بسر کرے فوت ہو جاتا۔

شمالی میدان بھی ہمالیہ ہی کا پروردہ ہے۔ قدرت نے اس میں قوت کہربا یا مقناطیس کی طرح کچھ ایسی کشش پیدا کر رکھی ہے کہ وہ ہر قوم جو افغانستان سے ہندوستان میں داخل ہوتی ہے۔ صرف پنجاب میں آ کر نہیں رہتی بلکہ زرخیزی زمین کی وجہ سے بنگال اور آسام تک برابر کھنچی چلی آتی ہے۔ تاریخ ہند خود شاہد ہے۔ کہ آریا جب ہندوستان آئے تو وہ افغانستان کی راہ سے پنجاب میں داخل ہوئے اور یہاں کی قدرتی چراگاہوں لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور سبزہ زار قطعات کو دیکھ کر یہیں آباد ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں سارے میدان پر پھیل گئے۔ گاؤں اور شہر بسائے دریاؤں [illegible] کام لیا بڑی بڑی حکومتیں [illegible] زرخیز زمینوں سے غلہ ترکاریاں [illegible] کی کاشت کی اور

اپنی زندگی کو سہل بنانے کے لئے اپنے کام کو چار گروہوں میں تقسیم کر دیا جب کوئی حملہ آور شمال مغرب کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہوتا ہے تو بنگال تک پہونچنے میں اسے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ بلکہ قدرت اس کی امداد کرتی ہے اور ہر قسم کی سہولت مہیا کرتی ہے۔ قدرت کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان انسانی آبادی سے ہمیشہ معمور رہے اور ساتھ ہی قدرتی عطیات سے فائدہ اٹھاتا رہے۔

سطح مرتفع دکن اور ساحلی میدان کی کیفیت شمالی میدان سے بالکل جدا ہے حتیٰ کہ یہاں کا طرز معیشت بھی وہاں کے طور طریق سے بالکل مختلف ہے۔ تمام اختلافات محض جغرافی حالت کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ یہاں کے کھیتوں کو کنوؤں اور تالابوں کے پانی سے سینچا جاتا ہے۔ پینے اور رات دن کے استعمال کے لئے بھی پانی کی ایک بڑی مقدار انہیں سے حاصل کی جاتی ہے۔

ملک کی دولتمندی اور مرفہ الحالی کا انحصار سراسر بارش پر ہے۔ آبادی کا زیادہ حصہ اسی جگہ نظر آتا ہے۔ جہاں آب رسانی کا انتظام نہایت اچھا ہوتا ہے۔ زراعت اور صنعت کا دار و مدار بھی بارش پر ہے۔ جب تک بارش نہ ہو زمین سے پیداوار خام حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ مسلم ہے کہ صنعت پیداوار خام پر مبنی ہے۔ بغیر اس کے صنعت کا فروغ ناممکن ہے۔ موسموں کا اثر بھی صنعت پر پڑتا ہے۔ جوٹ کے لئے بنگال کا موسم نہایت موزوں ہے۔ دنیا بھر میں سوائے بنگال کے جوٹ اور کہیں پیدا نہیں ہوتا۔ موسموں کا اثر نہ صرف نباتات بلکہ حیوانات پر بھی پڑتا ہے۔ گرمی میں ایک انسان اتنا کام نہیں کر سکتا جتنا کہ وہ سردی کے زمانے میں کر سکتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے وہ فوراً تکان محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیدائش دولت کے تمام کام۔ کارخانے۔ دفاتر۔ کالج۔ مدارس سب کے سب دھیمے پڑ جاتے ہیں۔

قدرتی نواح کے بیان کرنے کے بعد یہ نہایت آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ انسان کے ہر شعبۂ زندگی میں ان کا اثر موجود ہے۔ انہیں کی طرز اور انہیں کے اثرات پر انسان کی طرز معیشت ڈھل جاتی ہے۔ کوئی کام ان کے خلاف ہونے نہیں پاتا۔ لیکن آجکل ہمارا.... ہندوستان یورپ زدہ ہوتا جا رہا ہے اکثر حضرات نے جنھوں نے یورپ کی سیر کی ہے۔ یورپ کی ترقی کو دیکھ کر اپنے ہاں بھی وہی طور وہی طرز اختیار کر رکھا ہے جو یورپین فیشن کا جزو لازم ہے۔ بہت سے ناسمجھ ہندوستانیوں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہر ملک کے معاشی حالات ایک دوسرے

از جناب حکیم محمد عبدالحی صاحب انصاری خلف اکبر حکیم نابینا صاحب مرحوم ومغفور

ہندوستان میں برطانوی سرمایہ داروں نے قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ ہندوستانی مصنوعات کو برباد کر دیا تھا۔ تاکہ ان کا سامان ہمارے ملک میں کھپ سکے اور وہ روپیہ جو ہندوستانی صنعتوں کی وجہ سے ہندوستان میں باقی رہتا تھا یورپی سرمایہ داروں کے لئے انگلستان پہونچ سکے۔

حکومت کی طاقت اور ہندوستانیوں کے ذہنی انتشار کی وجہ سے برطانوی سرمایہ دار کامیاب ہوئے اور اگر ایک طرف انھوں نے ہماری صنعتوں کو برباد کیا تو دوسری طرف اپنی تجارت کا جال اتنے وسیع پیمانہ پر ملک بھر میں پھیلا دیا کہ چند سال میں دنیا کا مالدار ترین ملک کنگالوں کا وطن بن کر رہ گیا۔

ایک زمانہ تھا جب ہندوستان مصنوعات کا مرکز خیال کیا جاتا تھا اور ہمارے ملک کا بنا ہوا سامان۔ ایران۔ افغانستان۔ ترکستان۔ چین۔ عرب۔ افریقہ حتیٰ کہ یورپ تک جایا کرتا تھا۔ مگر اب وہی ہمارا ملک ہے جو یورپی ممالک کے سامان کی منڈی بنا ہوا ہے۔ اور ہماری دولت سمٹ سمٹ کر اغیار کی جیبوں میں چلی جا رہی ہے۔

وقت کا اہم ترین مطالبہ یہ ہے کہ ملکی صنعتوں کو فروغ دیا جائے ہر شے کی ملیں کھولی جائیں۔ کارخانے تعمیر کئے جائیں اور ملکی ضروریات کا پورا سامان ہندوستان ہی میں تیار کیا جائے۔ تاکہ ایک طرف یورپی سرمایہ دار ہمارا خون نہ چوس سکیں اور دوسری طرف ہماری صنعتوں کی بدولت ملکی دولت مشترکہ میں اضافہ ہو سکے۔

دیسی مصنوعات کی ہر طرح ہمت افزائی کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر ان کا فروغ پانا محال ہے یورپی سرمایہ داروں کو حکومت کی اعانت حاصل ہے۔ انڈیا ایکٹ کی دفعات ان کی تجارت کے تحفظ کے لئے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ وہ وسائل جو صنعت اور تجارت کی توسیع کے لئے ضروری ہیں ان کے ہاتھوں میں ہیں۔ ایسی حالت میں ہندوستانی مصنوعات کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ عوام ان کی سرپرستی کریں۔

اب جبکہ موجودہ جنگ کی وجہ سے ہم کو یہ موقع مل گیا ہے کہ ہم اپنی مصنوعات کو فروغ دیں۔ تو ہم کو یہ موقع ہاتھوں سے جانے نہ دینا چاہئے بلکہ اس سے کافی فائدہ اٹھانا چاہئے اس لئے کہ ایسے مواقع بار بار حاصل نہیں ہوا کرتے ہیں۔

اس وقت ہمارے ملک کے سرمایہ داروں کا فریضہ ہے کہ وہ میدان میں آئیں اور صنعتوں میں دل کھول کر روپیہ لگا کر نہ صرف یہ کہ اپنی دولت میں اضافہ کریں بلکہ ملکی دولت مشترکہ میں بھی اضافہ کا باعث بنیں۔

کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنی ضروریات کو خود ہی پورا نہ کرے۔ موجودہ جنگ نے ہندوستان کو یہ سنہرا موقع دیدیا ہے ضرورت بس عمل اور ہمت کی ہے۔ اس لئے ہم کو اپنی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے ملک کو بیرونی احتیاج سے آزاد کرنے کے لئے کھڑا ہو جانا چاہئے۔

اس موقعہ پر میں یہ بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ ملک کو دیسی (یونانی) ادویہ کی طرف توجہ دلاؤں اس لئے کہ ان کے فروغ کا بھی یہ بہترین عہد ہے۔ دیسی ادویہ کم قیمت ہوتی ہیں۔ اس لئے ہندوستانی ان کو آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں اس کے علاوہ وہ ہندوستانیوں کے مزاج سے بھی تطابق رکھتی ہیں۔ اور صدیوں کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دیسی (یونانی) ادویہ ہندوستانی مزاج کے بہت مطابق واقع ہوئی ہیں انگریزی ادویہ اول تو غیر ممالک سے آتی ہیں۔ اور کروڑوں روپیہ ان کی بدولت ملک سے باہر نکل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہندوستانی مزاج کے مطابق بھی نہیں ہوتیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہزاروں انگریزی دواخانوں کی موجودگی میں ملک کی صحت عامہ گرتی ہی چلی جا رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ دیسی ادویہ ذرا دیر سے فائدہ کرتی ہیں۔ مگر وہ صحت کو پایہ دار بنا دیتی ہیں۔ اور انگریزی ادویہ زود اثر ہونے کے باوجود اندرونی نظام پر ایسے مہلک اثرات مرتب کرتی ہیں کہ جن سے بعد میں نامعلوم طریقہ پر جسم کی اندرونی قوت مدافعت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یونانی ادویہ غیر ملکی ادویہ کے مقابلہ میں اول تو کم خرچ ہوتی ہیں دوسرے یہ فائدہ بھی زیادہ کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ دیسی ادویہ کی ترقی کے لئے ملک میں وسیع پیمانہ پر جدوجہد کی جائے۔ یہاں پر یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارے بعض نام نہاد اطبا بہت ہی کم معلومات کے حامل ہوتے ہیں۔ اور بعض جعلساز حضرات خواہ مخواہ حکیم بن بیٹھتے ہیں۔ ان لوگوں کی وجہ سے دیسی طب کو سخت نقصان اور بدنامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے افراد کے خلاف مستقل مجاہدہ شروع کیا جائے اور قابل و سند یافتہ اطبا کی ہمت افزائی کی جائے۔

ہمارے دوافروشوں کو بھی کافی اصلاح کی ضرورت ہے ان کو چاہیئے کہ وہ مرکبات زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کریں اس لیئے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ لوگ ایک قدح بھر کے دوا پی سکیں ان کو چاہیئے کہ وہ ادویہ کے جوہر نکالیں۔ قرص اور حبوب تیار کریں۔ دواخانوں کا معیار بھی ویسا ہی بلند کریں جیسا کہ انگریزی دواخانوں کا ہوا کرتا ہے۔ اس لیئے تجارتی نقطۂ نظر سے ایسا کرنا سخت ضروری ہے۔

یورپی ادویہ باوجود اس امر کے کہ ان میں سے اکثر بالکل ناکارہ اور نامعقول ہوتی ہیں۔ محض اپنی ظاہری دیدہ زیبی کی وجہ سے فروخت ہوجاتی ہیں۔

ہمارے دوافروشوں کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنی ادویہ کو شاندار طریقہ پر پیش کریں تاکہ ان کی ظاہری شکل و صورت بھی اتنی ہی دلفریب ہو جائے جتنی کہ ان کی خصوصیات ہوتی ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ اہل نظر میرے اس مشورہ پر غور کریں گے اور ان کو عملی جامہ پہنا کر ہندوستان کی سربلندی میں حصہ لیں گے

خوب لکھا ہے کہ "کسی قوم کا طرز معیشت ملک کی جغرافی حالت کا نمونہ ہوتا ہے"

(باقی)

ادب لطیف:۔

اے میری محبوب!

(از جناب شیخ حسن صاحب مشکل امراؤتی)

تو شباب و سکر میں ڈوبی ہوئی وہ مستی ہے۔ جو فضائے بسیط میں کیف و سُرور پیدا کردے۔۔۔۔۔۔ تو حسن کا وہ نورانی بربط ہے جو اپنے پاکیزہ نغموں سے دُنیائے خیال میں رعنائی پیدا کرے۔

تو کونین کا وہ اقتباس حسن ہے جو فطرت میں مسکراہٹ پیدا کردے

تو جذبات و احساسات کا وہ شیریں کیف ہے جو دنیا مسرت کو آباد کردے۔

تو نزاکت و رعنائی کا وہ پرتو ہے جو عالم خیال میں حریری لہریں پیدا کردے۔

تو شادابی کا وہ شبنمی ترنم ہے جو کائنات میں لوچ پیدا کردے۔

تو معصومیت کا وہ منظر اغور ہے جو حسن کی آویزشوں کو شرمندہ کردے

تو گداز بے فطرت کا وہ شاہکار ہے جو مادی رنگینیوں میں داب دیا گیا ہو

تو پھول کی وہ خوشبو ہے جو فضائے بسیط سے چھین کر خدوخال کی نفاست میں چھپادی گئی ہو۔

تو ٹہنی کا وہ نازک لوچ ہے جو ہوا کے معمولی تھپیڑوں سے تھر تھرانے لگے۔

تو پانی کا وہ آبشار ہے جو اپنی سیمابی لہروں میں شبنمی تازگی رکھتا ہو۔

بقیہ صفحہ (۹۴)!

سے بالکل جُدا ہوتے ہیں۔ جب ہندوستان ہی کے ایک صوبہ کی معاشی حالت دوسرے صوبہ سے تطابق نہیں کرتی تو ہندوستان کو یورپ سے کیا واسطہ۔ تمام معاشیئین متحد ہیں کہ ایک ملک کی معاشی حکمت عملی دوسرے ملک کے لئے ہرگز مفید نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کو ملک کے قدرتی نواح کے اثرات پر ڈھال نہ لیا جائے۔ مولوی محمد الیاس صاحب برنی پروفیسر عثمانیہ کالج نے کیا

اس نے زندگی کو پاکر سمجھا، کیونکہ اس نے اپنی جان
جوکھوں میں ڈال کر اوروں کو زندگی بخشی !!
ایک آہنی قلب کے انسان کے "سونے" کے دل کی کہانی
نگار خانہ رنجیت میں تیار کردہ انوکھا فلم !
سندرشن پکچرس کا لاجواب شاہکار !!
ڈائرکٹر :- دوارکا کھوسلے !
میوزک :- پرتاپ مکرجی !!
گانے :- پنڈت فانی
آرہا ہے
لیمنگٹن ٹاکیز
لیمنگٹن روڈ
موجودہ نمائشی فلم کے بعد :-
بکنگ :- سندرشن پکچرس
دادر، مین روڈ
بمبئی نمبر (۱۴) !
سنگم
جہاں مرد اور عورت کی زندگی
تمناؤں اور آرزوؤں کی امواج پر لہراتے ہوئے ایک
ہوجاتی ہے وہاں محبت کا
بنتا ہے !
ماہ نومبر کے
پہلے ہفتہ میں نوینگ چترپٹ کا تیار کردہ محبت اور زندگی
کا
رنگین اور نظر فریب فلم ملاحظہ فرمائیے !!
اداکاران :- میناکشی، وتسلا کمٹیکر، سلوچنی، دامنا
دلنکر اور نایک !!
نگران :- ونایک
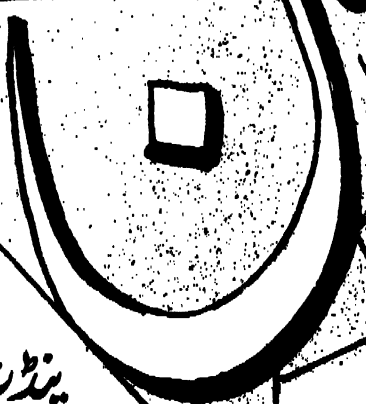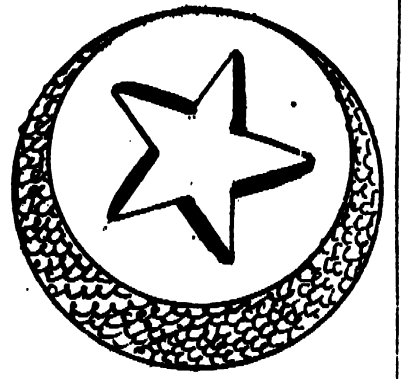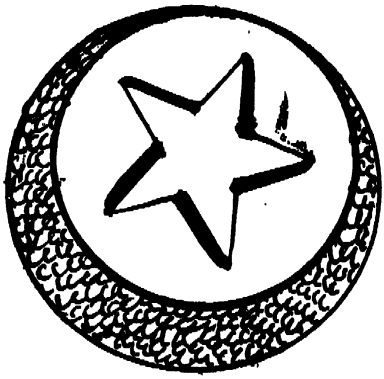
منروا موویٹون کی طرف سے
برادرانِ اسلام کو
عید مبارک!
عید الفطر کے مبارک دن؟
ہندِ قدیم کے جاہ و جلال کا صحیح مرقع!
سکندر
ڈائرکٹر:-
سہراب مودی
اداکاران:-
سہراب مودی، پرتھوی راج، ونمالا، مینا، صادق علی، شیلا، ظہور راجہ، لالہ یعقوب، کے، این سنگھ، گجندر، شاکر، جلو بائی، غلام حسین، ابوبکر وغیرہ وغیرہ
جو ہندوستان کے اس سنہری دور کا عکس جمیل ہے جب کہ ہر وطن پرست مجاہد ملک کی آن کے لئے اپنی جان بھینٹ دینا ایک ادنیٰ خدمت تصور کرتا تھا!
اعلیٰ درجوں کے ٹکٹ صبح ۱۰ بجے سے ل سکتے ہیں
روزانہ تین کھیل:-
۴، ۷، اور ۱۰ بجے شب!
سنیچر اتوار اور تعطیلات کے دن میٹنی مخصوص ۱ بجے دن
منروا ٹاکیز ملینگٹن روڈ
میں خوب بزنس لے رہا ہے!

کنور کرن سنگھ ملکۂ نورجہاں کی حضور میں

امراؤ سنگھ والئی میواڑ کا ولیعہد کنور کرن سنگھ اجمیر میں جب شہنشاہ جہانگیر کے پاس سلامی کے لئے حاضر ہوا تو شاہجہاں کی سفارش پر اسے جہانگیر کی داہنی طرف بٹھایا گیا۔ شہنشاہ جہانگیر نے کنور کرن سنگھ سے ملاقات کرنے کے بعد اس کے متعلق فرمایا کہ "کرن بہت شرمیلا تھا، اور درباداری کی نمائش و تجربات سے بالکل ناواقف تھا۔" ممکن ہے کہ شہزادہ کے شرمیلے پن نے خوش مزاج اور تمسخر پسند بادشاہ کے سامنے اس کی جھجک دور نہ کی ہو، بہر حال دربار برخاست کرنے کے بعد شہنشاہ جہانگیر اور شاہجہاں اسے ملکۂ نورجہاں کی حضور میں لے گئے۔ جہاں اس نے آداب شاہی بجالانے کے بعد شہنشاہ بیگم سے مشرف بہ ملاقات ہونے پر اظہار مسرت کیا۔ کنور کرن سنگھ جبتک مہمان رہا، اسے مرصع خنجر، انگوٹھیاں، عراقی گھوڑے، موتیوں کے ہار، عطریات اور طلائی برتن بطور تحائف دئے گئے۔ شہنشاہ جہانگیر خود رقمطراز ہیں "کہ آمد سے روانگی کی تاریخ تک کنور کرن سنگھ کو دس لاکھ روپئے کی قیمتی چیزیں دی گئیں" جن میں ۱۱۰ گھوڑے، ۵ ہاتھی اور شاہجہاں کے عطیات شامل نہیں ہیں۔

بقیہ مغالطہ!
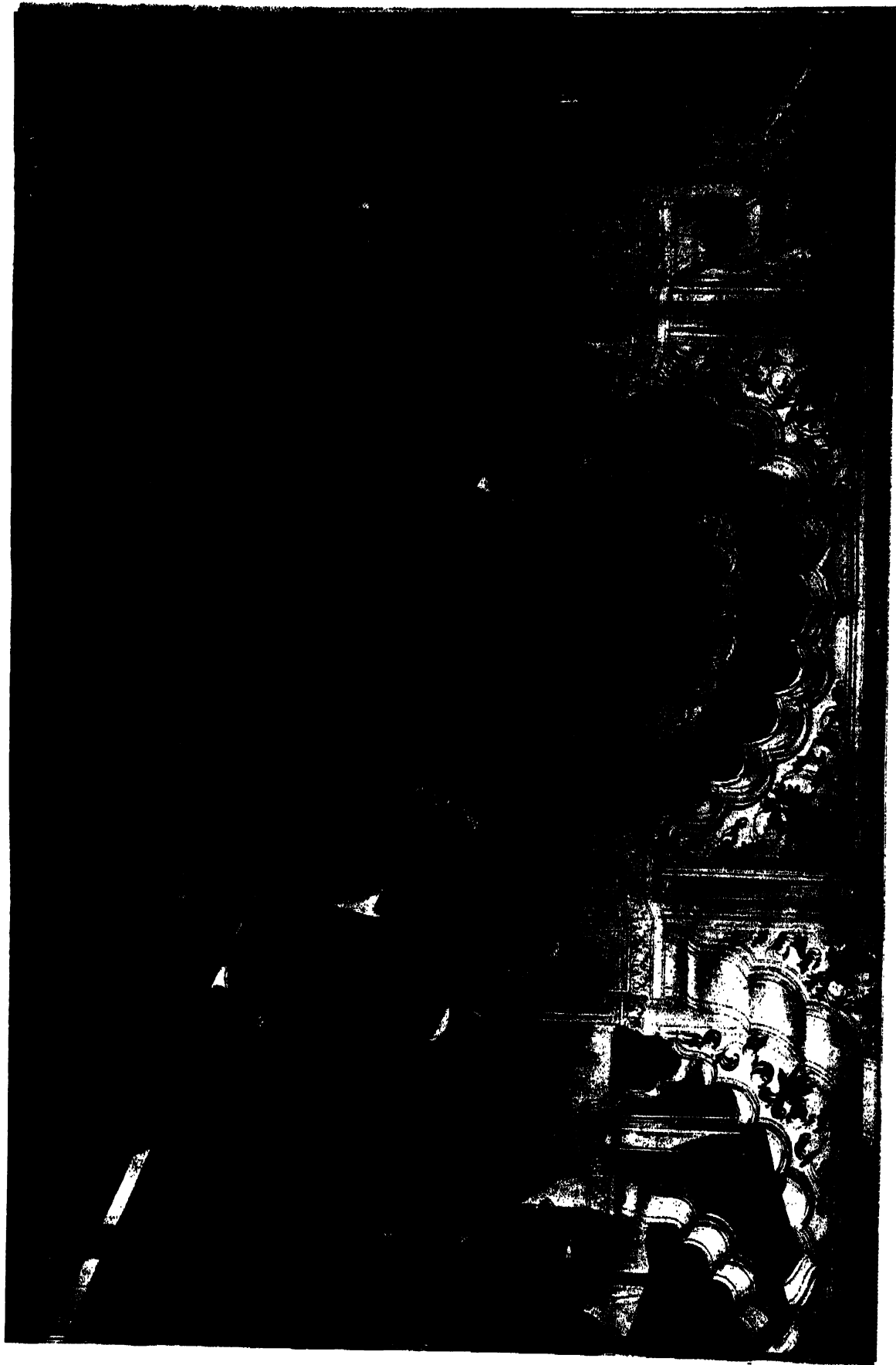
اور میری بے چینی الگ بڑھ گئی تھی کہ آخر معاملہ کیا ہو گیا ۔ کالج کی تعطیلات بھی ہو چکی تھیں ۔ میں چچی کے یہاں دہلی چلا گیا ۔۔۔!

چچی مجھ سے بڑی اچھی طرح پیش آئیں ۔ اور گھنٹوں دلچسپ باتیں کیا کرتیں ۔ اور سلمیٰ "تو مجھ سے بہت زیادہ گھل مل گئی تھی ۔ جب میں اپنے کمرہ میں جاتا تو پہروں سلمیٰ کے حسن پر غور کیا کرتا ۔ اس کا کتابی چہرہ ، کنول سے رخسار ، لمبی لمبی پلکیں اور اجھریں سب میرے تصور میں گھوما کرتے اس کی شوخ ادائیں میرے دل پر چھا جاتیں ۔ اور میں خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچتا

ایک دن میں کوٹھی سے ملحقہ پارک میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا ۔ اور ہاتھ میں ایک کتاب تھی ۔ ۔

اچانک میری آنکھوں پر کسی کی انگلیاں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں ۔ میں سمجھ گیا یہ شوخ سلمیٰ ہے ۔

میں نے قہقہہ لگایا اور وہ بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئی ۔ میں نے کہا ۔

"سلمیٰ تم بڑی شریر ہو"

"جی ہاں !"

"گویا اعتراف بھی ہے"

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انکار کروں ؟"

"نہیں تو ۔۔۔"

"خیر !"

اور اتنے میں میری آنکھ بچا کر جلدی سے سلمیٰ نے کتاب قریب کے حوض میں گرا دی ۔

میں نے کہا ۔۔ "ارے اٹھاؤ اسے !"

"کیوں"

"بھیگ جائے گی"

"بھیگ جانے دیجئے !"

"بھئی تم بہت شریر ہو ۔۔۔" میں نے جلدی سے دوڑ کر کتاب کو حوض سے نکالا اور سلمیٰ بھاگ کر اندر چھپ گئی ۔ میں اپنے کمرہ میں پہنچا ہی تھا کہ سلمیٰ آ گئی اس نے آتے ہی کہا ۔۔

"رشید بھائی آپ کی کتاب واقعی بھیگ گئی ؟"

"تو پانی میں گر کر بھی خشک رہتی" ؟

"معاف کیجئے مجھ سے غلطی ہوئی"

"عذر گناہ بدتر از گناہ"

وہ یہ سن کر چپ چاپ میرے پاس کرسی پر بیٹھ گئی ۔ میں ہنس دیا وہ مسکرائی ۔ جیسے پھول جھڑتے ہوں ، میں سوچ رہا تھا کہ سلمیٰ سے کہہ دوں کہ ایسی شرارت نہ کیا کرے کہ ایک دم چچی کی آواز آئی اور وہ دوڑ کر باہر چلی گئی ! اور میں بھونچکا ہو کر رہ گیا ...... سلمیٰ کتنی شوخ ہے کتنی خوبصورت ہے ۔ سلمیٰ سے مجھے اب کہہ دینا چاہئے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں ۔ مگر کہیں چچی کو خبر نہ ہو جائے اور اگر اس نے ہی خود جواب دیدیا تو مجھے شرمندگی ہوگی یہ سوچ کر میں خاموش ہی رہا ۔ شام کو میں گھر دیر سے پہونچا ۔ کانوں میں آواز آئی کہ کوئی وائلن بجا رہا ہے ارے یہ تو کوئی گانے بھی لگا ۔ وائلن پر سلمیٰ تھی

تھی :۔

ایک نیا سنسار بسالیں ایک نیا سنسار

نیچے ہی ٹھہر گیا۔ آواز کی دلکشی نے مجھے مدہوش سا کر دیا۔ جب آواز بند ہوئی تو میں اندر داخل ہوا۔

میں نے سلمیٰ سے کہا :۔

"آپ تو خوب "نیا سنسار" بسا رہی تھیں"

"اچھا تو آپ کمرے سے سن رہے تھے!"

"جی ہاں!"

"مجھے بتایا کیوں نہیں دیا؟..."

"دل ہی تو ہے"

"اچھا دل ہے"

—— یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔ اور میں اپنے کمرہ میں آگیا"

چاندنی رات تھی۔ درختوں پر نقرئی کرنیں کچھ عجب انداز سے چمک رہی تھیں۔ پارک کی فضا حد درجہ اثرانگیز اور رومان پرور تھی۔ میں اور سلمیٰ ایک بنچ پر بیٹھے تھے۔ اس کا سیمیں ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اس نکھری ہوئی چاندنی میں وہ پرستان کی پری معلوم ہو رہی تھی —— اس نے کہا

"کیسی سہانی رات ہے!؟"

"سچ کہہ رہی ہو سلمیٰ!"

"ہاں مگر تمہارے بغیر یہ چاندنی راتیں پہلے پھیکی معلوم ہوتی تھیں"

"یہی حال میرا ہے۔ دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ سلمیٰ میں تم سے محبت کرتا ہوں"

—— یکایک اس کا ہاتھ لرزنے لگا اور وہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ میں نے اس کی ساری کا پلو پکڑ لیا۔ وہ رک گئی۔ چاند بادل کے ایک ٹکڑے کی اوٹ میں آگیا تھا —— میں نے سلمیٰ کے دست سیمیں پر مہر محبت ثبت کر دی۔ وہ خاموش رہی۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا "معاف کرنا سلمیٰ!" اس کی نظریں جھک گئیں۔ میں نے دوبارہ کہا "تم ناراض تو نہیں ہو گئیں۔؟"

اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا "نہیں"

دوسرے دن مجھے والد صاحب کا تار ملا کہ فوراً چلے آؤ تمہاری بہن کی طبیعت خراب ہے —— آہ مجھے یہاں سے کتنی جلد جانا پڑ رہا ہے۔ سلمیٰ سے جدائی کا سوال میرے لئے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ آہ! ہم دونوں کو کیا ہمیشہ کے لئے جدا ہونا پڑ رہا ہے —— خود چچی بھی اداس تھیں۔ لیکن والد صاحب کے حکم کو میں کیسے ٹال سکتا تھا۔

صبح کی گاڑی سے جانا تھا میں اپنے کمرے سے باہر نکلنے والا ہی تھا کہ سلمیٰ داخل ہوئی۔

"کیا آپ جا رہے ہیں! سچ سچ؟"

"اور کیا جھوٹ ہوگا"

"افسوس!"

"افسوس کیوں کرتی ہو"

"اب کب آئیں گے آپ!؟"

"یہ تو قسمت پر منحصر ہے"

یہ کہہ کر میں نے اس کے دستِ حنائی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے احمریں لبوں پر ایک بوسہ ثبت کر دیا۔ وہ خاموش تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور غزالی آنکھوں میں قطراتِ اشک چھلک رہے تھے۔ میں نے اس کو تسلی دی اور رخصت ہو گیا۔ دل میں ایک ارمان تھا ایک حسرت۔

کچھ عرصہ بعد میری... خواہش پر والد صاحب نے سلمیٰ کے یہاں "پیغام شادی" بھیجا جسکو سلمیٰ کے والد نجم الدین صاحب نے منظور کر لیا۔ سلمیٰ اب میری تھی اور میں سلمیٰ کا! ہمیں عیش و نشاط کی تمام مسرت آفرینیاں حاصل تھیں۔

کچھ عرصہ بعد سلمیٰ ایک بچہ کی ماں بن گئی۔ اس کا حسن پھیکا پڑ گیا اور گلشن شباب میں خزاں کی جھلک نظر آنے لگی۔ سلمیٰ کی ساری محبت کا مرکز اب صرف بچہ تھا اور میری طرف وہ پہلی سی گرمجوشی نہ رہی تھی۔ میں اس سے کسی قدر بیزار ہو گیا۔ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی شے کو افراط سے حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کی قدر و قیمت گر جاتی ہے۔ مرد تنوع پسند ہے زیادہ واقع ہوا ہے۔ ایک دن میں وقت سے آیا تو سیدھا اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ کمرہ بہت میلا کچیلا ہو رہا تھا۔ تمام چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں میں نے کہا۔

"آج یہ کمرہ کی حالت کیا ہے"

سلمیٰ نے کہا "درست تو ہے آپ کو ایسا ہی نظر آیا کرتا ہے۔"

"یہ الماری کا شیشہ بھی ثابت ہے نا؟"

"میں کیا جانوں"

"گھر میں کون رہتا ہے سوائے تمہارے"

اس دن تو خیریت گذری۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے کسی قدر کھنچی کھنچی سی رہنے لگی۔ اس کے تیور بھی بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے "خانگی سیاست" کا رنگ بھی اب بدل رہا تھا آپس میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی آخر ان گھریلو جھگڑوں نے یہاں تک صورت اختیار کر لی کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اس بددماغ عورت سے دُور ہی رہوں۔

• مریخ بند ہو چکا تھا اور اب میرے افسانے "سہیل" میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ایک دن مجھے "سہیل" کی معرفت ذیل کا خط ملا۔

محترم انصاری

عرصۂ دراز سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی زندگی کے بحرِ ذخار میں طرح طرح کے مد و جزر آئے اور کشتیٔ حیات کو گرداب بلا میں پھنسا گئے۔ شاید آپ بھی مجھے بھول گئے ہوں۔ اب وہ پہلی سی خوشی اور سکون نہیں ہے۔ میرے سکونِ حیات کو ایک ظالم مرد نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔

شادی کے بعد اس نے مجھے مصائب و نوائب کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ آہ! مجھے معلوم نہ تھا کہ محبت کے پردہ میں شقاوت پنہاں ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وفا کا بدلہ جفا سے دیا جائے گا۔

مجھے خبر نہ تھی کہ وہ بندۂ نفس میرا سب کچھ لوٹ لینے کے بعد مجھ سے آنکھیں پھیر لیگا — آہ! میری شادی کیا ہوئی۔ زندگی برباد ہو گئی اب میں کس کو اپنا دکھڑا سناؤں؟

اُمید کہ آپ بعافیت ہوں گے!

مبتلائے غم

"ص، ح"

دکھایا۔ وہ مرد واقعی بڑا ہی خود غرض ہوگا۔ جو تم جیسی قابل عورت کی قدر نہ کر سکا وہ تمہارے اوصاف حمیدہ کو کچھ ہی نہیں سکا۔ میرے دل کی کیفیت بھی اس وقت عجیب ہے۔

تمہارا

شمس انصاری

اب میرا وہ جنون جو مجھ پر سوار تھا اتر چکا تھا۔ میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت کر رہا تھا کہ میں نے ناحق سلمیٰ کو اذیت پہونچائی۔ اس نے اس صدمہ کو کس طرح برداشت کیا ہوگا۔ میں نے سلمیٰ کو خط بھیجا۔ میرے دل میں اس کے لئے جذبۂ رحم پیدا ہو گیا تھا۔

مجھے ایک طویل عرصہ کے بعد یہ خط ملا تھا اور میں "ص - خ" کو فراموش بھی کر چکا تھا۔ لیکن محبت کی دبی ہوئی چنگاری پھر بھڑک اٹھی۔ دل پر پہلے ہی ایک چوٹ لگ چکی تھی اور اب ایک غم کی ماری کا خط آیا تو میں بھی اس رو میں بہہ گیا اور ذیل کا خط لکھا۔

محترمہ!

خیریت تو کیا ہوگی زندگی میں صد ہا انقلابات برپا ہوئے۔ شادی کے رشتہ میں منسلک ہو چکا ہوں۔ نہ مجھے خبر نہ تھی کہ شادی نام ہوا کرتا ہے مسرت کے خاتمہ کا۔ شادی کے بعد سے سخت آشفتہ حال ہوں۔ کیا بتاؤں کس ناہنجار سے سابقہ پڑا ہے۔ جبر قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے۔ تم سے دلی ہمدردی ہے۔ اور تمہارے شوہر سے سخت نفرت۔ حسین نے تمہیں اس قدر تکلیف پہونچائی ہے [illegible] اور تمہارا ناز [illegible]

لیکن تو "ص، خ" سے لگی تھی۔ تیسرے دن خط ملا۔ لکھا تھا۔

مخدومی!

"تسلی نامہ ملا۔ اظہار ہمدردی کا شکریہ۔ قسمت کے چکر بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میں کسی پر الزام لگانا نہیں چاہتی آہ! — اب آپ مجھ سے محبت کر کے کیا لیں گے۔ مجھ غم نصیب کو مسرت و شادمانی سے کیا واسطہ؟ میں اب "معراجِ محبت" کو سمجھ گئی ہوں — محبت میں اپنی مرضی کو چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ حسن کا محبت سے کیا تعلق؟ وہ تو فانی ہے — اور سچی محبت کبھی فنا نہیں ہوتی۔ مجھے معاف کرنا۔

آپ کی

"ص - خ"

آج سلمیٰ آ گئی تھی اور میں مسرور تھا۔ رہا یہ کہ پہلے مجھے امید نہ تھی کہ وہ آ جائے گی۔ ہماری گزشتہ کدورتیں دور ہو چکی تھیں لیکن میرے دل [illegible] بھی "ص، خ" کی یاد

کھٹکتی تھی، اور اکثر اس کے تصور رنگین میں کھو جاتا تھا۔ ایک دن میں ذرا جلدی آگیا کیونکہ دفتر میں کام زیادہ نہ تھا۔ اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سلمیٰ میز پر پھیلے ہوئے خطوط کا جائزہ لے رہی ہے اس میں "ص، خ" والے خط بھی تھے میں نے جلدی سے ان خطوط کو کھینچتے ہوئے کہا۔

"سلمیٰ تم میرے خطوط کیوں دیکھ رہی ہو؟"

اس نے گھبرا کر جواب دیا "جی کچھ نہیں" اس کے چہرہ سے گھبراہٹ و سراسیمگی ہویدا تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"یہ خطوط کہاں سے آئے آپ کے پاس؟"

"تمہیں اس سے کیا؟"

"پھر بھی"

"وہ تو ایسے ہی ہیں"

"آپ کو سچ بتانا ہوگا"

"تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت کچھ"

"تو گویا تمہارے خطوط ہیں یہ؟"

"بے شک"

"کیا مطلب"

"جی میرے ہاتھ کے"

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"بالکل"

"اس کا ثبوت"

"آپ کے خطوط"

"لیکن ان میں تو "ص۔خ" لکھا ہے"

"جی ہاں میں اسی فرضی نام سے افسانے لکھا کرتی تھی یہ "صفیہ خانم" کا مخفف ہے۔ جو میرا بچپن کا نام ہے"

"ارے یہ بات ہے!؟"

"اور آپ شمس انصاری"

"ہاں پیاری سلمیٰ!"

"آہ! میری صفیہ مجھے معاف کر دو" ــــ اور یہ کہہ کر میں نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے اور میں بھی روتا جاتا تھا۔

(ختم شد!)

محبت لافانی ہے اور اس کی کیفیتیں فانی۔ لہٰذا محبت کی بجائے کیفیتوں سے حظ اٹھانے کی سعی کرنا نادانی ہے۔

(یکتا)

آجکل ہندوستان میں عام طور پر اور شہر بمبئی میں خاص کر ایسے بچے سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ جو گداگری اور آوارہ گردی میں دن گزارتے ہیں اور ان ہی میں سے بیشتر بچے بڑے ہو کر جرائم پیشہ ہو جاتے ہیں۔ جو قوم کی رسوائی اور ملک کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ ان نونہالان قوم و ملت کی بربادی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور خاموش رہتے ہیں۔ ہم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کم از کم کوئی نتیجہ نکال کر اس کے پیش نظر ان قوم کے معصوم بچوں کا مستقبل ہی ٹھیک بنانے کی کوئی تدبیر معلوم کریں۔ میں نے اپنے طور پر جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کو مختصر طور پر ناظرین و ناظرات الاصلاح کی خدمت میں پیش کر کے ملتجی ہوں کہ وہ بھی اس اہم قومی خدمت کی طرف توجہ فرمائیں قوم و ملت کو تباہی سے بچا لیں۔ ورنہ یہ بڑھتا ہوا سیلاب آئندہ اس سے بھی خطرناک صورت اختیار کر کے قوم و ملک کی تباہی کا ایک بڑا سبب بن جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ یہ معصوم بچے اپنے والدین کی ناداری یا ان کی تربیت سرپرستی اور نگرانی سے محروم ہونے کی وجہ سے گداگری کرتے ہیں یا پھر وہ بچے جن کے والدین کا خاندانی پیشہ ہی بھیک مانگنا ہے حسب دستور بھیک مانگتے ہیں مؤخر الذکر بچوں کے متعلق تو کچھ کہنا اس لئے بیکار ہے کہ وہ خاندانی پیشے سے مجبور ہیں اور وہ اسی ماحول میں پروان چڑھنے والے ہیں جس میں وہ پیدا ہوئے۔ ان کے درست ہونے یا بگڑنے کا اتنا امکان نہیں ہے۔ جتنا کہ اول الذکر بچوں کا ہے۔ قوم کے افراد کو ان کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی بچے آئندہ چل کر قوم و ملت اور ملک کی رسوائی اور تکلیف کا باعث ہوتے ہیں ان ہی کا سنبھالنا قوم کا فرض ہے میرا ذاتی تجربہ جسے میں آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اول الذکر گروہ کے بچے اگر کوئی کوشش کرے تو راہ راست پر آسکتے ہیں۔

رمضان المبارک کی دوسری تاریخ تھی۔ فرائض اسلام کا احترام اور پابندی کرنے والے مسلمان روزہ رکھ کر عبادت میں مشغول تھے۔ بہت سے ایسے بھی مسلمان تھے جو ہیں تو مسلمان مگر فرائض اسلام کی پابندی ان کو گراں گزرتی ہے چنانچہ آج بھی بہت سے لوگ سوزش جگر۔ درد شکم۔ چیچک۔ دھڑکن اور بخار وغیرہ کی شکایت پیدا ہو جانے کی وجہ سے روزے سے نہ تھے۔ اور بہت سے تو روزے کو بیکار اور صحت کو خراب کرنے والا یا غریبوں کے پیسے بچانے کا ایک ذریعہ سمجھ کر سر راہ ماہ صیام کی بے حرمتی کرتے پھر رہے تھے لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اس ماہ مبارک کی گوناگوں دلچسپیاں ہر فرد کے لئے تفریح طبع۔ درس عبرت اور قابل توجہ سماں بنی ہوئی تھیں خاص کر سہ پہر کا وقت ایک عجیب ہی سماں پیدا کرتا ہے۔ میں اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے کھڑکی سے باہر ماہ صیام کی ان دلچسپیوں سے طبیعت بہلا رہی تھی کہ کسی نے دروازے کے باہر "مائی" کہہ کر آواز دی۔ میں نے اس آواز پر یہ سمجھ کر کوئی توجہ نہ دی کہ دن بھر تو فقیروں کا تانتا لگا رہتا ہے اور "مائی" "مائی" اور "اللہ بھلا کرے" کی صدائیں سنتے سنتے طبیعت عاجز ہے۔ یہ بھی کوئی فقیر ہی ہے مگر جب بار بار "مائی۔ مائی اور مائی مائی" کی لگاتار آوازیں آنے لگیں تو مجبوراً میں نے دروازہ کھولا۔

(باقی صفحہ (۱۱۲) پر دیکھیے)

بقیہ مسلمانوں کیلئے تعمیری لائحہ عمل

زکوٰۃ! کی اصل حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں مالی قربانی کا ایسا شدید جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے مفلس اور نادار لوگوں کی مصیبتوں کو محسوس کر کے یہ تن مالی قربانی کیلئے تیار ہو جائیں اور دوسرے یہ کہ اس مالی قربانی سے ایک مشترکہ فنڈ یا بیت المال قائم ہو جائے جس سے بوقت ضرورت یتیموں۔ بیواؤں اور مفلوک الحال مسلمانوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہو سکے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ زکوٰۃ عام مسلمانوں میں معاشرتی مساوات پیدا کرکے۔ امارت اور سرمایہ داری کو یک قلم مٹا دینا چاہتی ہے۔

حج کی اصل غایت یہ ہے کہ سال میں کم از کم ایک بار ہر ملک اور ہر دیار کے لوگ سمٹ سمٹا کر یکجا ہوں اور باہم ان مسائل پر تبادلۂ خیالات کریں جن سے عام مسلمانوں کی ترقی اور بہبود مقصود ہو۔ یہ حقیقتاً ایک بڑی اسلامی مجلس ہے۔ جس میں ہر گوشہ کے مسلمان جمع ہو کر ایک دوسرے سے مل کر مسلمانوں کے حالات معلوم کرتے ہیں۔ صاحب نصاب کیلئے عمر میں ایک بار حج کرنا ضروری ہے۔

عید کے موقع پر کیا ہوتا ہے یہ عید خوشحال گھرانوں میں اپنے ساتھ ان گنت مسرتیں لاتی ہے۔ نئے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ لذیذ کھانے کھلائے جاتے ہیں۔ اور جن کو خدا نے دولت اور امارت دی ہے وہ اسی روز اپنی خوشی کی تکمیل کیلئے بہتر سے بہتر سامان کرتے ہیں۔ لیکن ان ہی کے دوش بدوش ایک جماعت ایسی بھی ہوتی ہے۔ جہاں عید لوگوں کو مغموم اور رنجیدہ کر کے ان کے ارمانوں کو پامال کر دیتی ہے۔ ان کے دلوں میں بھی ارمان اور حوصلے ہیں۔ لیکن پھوٹی کوڑی پاس نہیں چھوٹے چھوٹے بچے ماں باپ کا منہ تکتے ہیں تو ماں باپ آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنی چشمہائے نم نیچے کر لیتے ہیں ہم کو چاہیئے کہ ہم قومی زندگی کے اس نقص اور اس فرق اور اس امتیاز کو محسوس کریں اور اس کی جہاں تک ممکن ہو اصلاح و درستگی کی کوشش کریں۔

ان پانچ ستونوں یعنی توحید۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام ہمارے فطری قوتوں کو باقاعدہ طور پر منظم کر کے ان میں اعتدال اور سلامت روی پیدا کر دیتے ہیں جس سے قوائے انسانی ایک دوسرے سے ٹکرانے اور سازش کرنے سے محفوظ رہتے ہیں۔ قانون مجادلۂ حیات اور بقائے اصلح کی گرفت سے کوئی مخلوق چھوٹ نہیں سکتی۔ اس کے لئے بقا ہر جگہ زیادہ باقی رہنے کی اپنے اندر استعداد و صلاحیت رکھنا ہے۔ اور فنا اس کی پیشانی پر لکھی گئی ہے جس نے استعداد۔ صلاحیت۔ اور قوت اور اخلاق کی تربیت نہیں کی۔ غیر مسلم اس وقت ہمارے آداب اور اخلاق کا جلی حرفوں میں مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کی نظر ہمارے عام افراد کے عادات و اطوار پر ہے آج کرۂ زمین پر جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اس جنگ میں بھی کامیابی اسی کی ہوگی جو زیادہ قوی ہو اور جس نے اپنے کو حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تیار کیا ہو۔ اسلام نے ہر قسم کے جنگ و جدال اور فرق و امتیاز کو مٹا کر ...... مقاصد کے مرکز اصلی پر انسانی توجہ کو جما دیا ہے اور مذکورہ پانچ ارکان کے بھی یہی مقاصد ہیں۔ وہ قبیلہ، وہ ملک اور وہ جماعت جن کو باہمی عداوت اور فساد نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے اسلام نے ان کو ایک جسم کی حیثیت دیدی ہے اور ایک دوسرے سے اس قدر مالوف بنا دیا کہ وہ سب ایک باپ کی محبت کیش اولاد سے زیادہ محبت کرنے لگے۔ ناچاقی بدمزگی اختلاف باہمی جاہلیت کی بیماریاں ہیں جو انسان کی عقل کو معطل اور روح کو مریض کر کے اس کو اس کے مبداء اور احساس سے دور ہٹا دیتی ہیں۔ ایسے فروعی اختلافات کو جن کو اسلام سے کوئی ربط نہیں۔ کشادہ دلی اور سوجھ سے ہم کو مٹا دینا چاہئے۔ نہایت افسوس ہے کہ ہماری قومی زندگی پر ایسی بحرانی کیفیت طاری ہے جس میں غیر اسلامیت کا بادل کڑک گرج اور چمک کے ساتھ جھوم جھوم کر آتا ہے۔ اور ہمارے اخلاق اور آداب کی زمین کو لرزہ براندام کر کے گزر جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے لاکھوں اور کروڑوں انسان انسانیت سے دور اختلافات کے انگاروں پر کروٹیں بدل رہے ہیں اور جس کے لئے خون، وقت اور مال برباد کر رہے ہیں۔ اسلام ایک نہایت سادہ دعوت کا نام ہے۔ ایک سادہ لائحہ عمل ہے جس کا ربط انسان کی دماغی، علمی، اجتماعی اور منزلی زندگی سے ہے اور جو خدا کے روح پرور تصور سے دل کو معمور کر دیتا ہے۔

مجھے جب کبھی اسلامیات پر قلم اٹھانے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔ تو اس کا محرک صرف یہی جذبہ نہیں ہوتا کہ میں اسلام کی حقانیت کو نہایت ہی گہرے طور پر محسوس کرتا ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ علم کے حصول تک زندگی ٹھہر نہیں سکتی۔

(ختم شد)

بقیہ حمیدہ

اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔" میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں حمیدہ اس کا نام کیا تھا"

" بتاتی ہوں جہاں پناہ !" حمیدہ آخری زینے کو طے کرکے گنبد پر چڑھ گئی

اب جہانگیر اور حمیدہ کے درمیان پورے بیس زینوں کا فرق تھا۔

"حمیدہ تم وہاں کہاں چلی گئیں ؟ سنو یہاں آؤ۔" جہانگیر نے بیتابی کے ساتھ زینے پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"جہاں پناہ آپ زینے پر نہ چڑھیئے۔ سُنیئے اس لڑکے کا نام سلیم تھا"

"حمیدہ ! میں ؟"

حمیدہ بولی" ہاں جہاں پناہ آپ ! سلیم سے جہانگیر بننے کے بعد آپ ہی نے مجھے بھلا دیا آپ ہی نے مجھے محبت کے آسمان پر چڑھا کر ہمیشہ کے لئے حسرت و محرومی کے غار میں اس طرح گرا دیا۔ ادہر دیکھیئے اس طرح !"

حمیدہ کی آواز میں غضب کا سوز و گداز اور بلا کا درد و اثر تھا جہانگیر نے دل تھام کر اوپر دیکھا اور ساتھ ہی جھیل میں ایک چھپاکے کی آواز ہوئی۔ پانی کی پر سکون سطح پر موجوں کا ہنگامہ برپا ہوگیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس کی سابقہ حالت عود کر آئی۔

ہر وقت شراب و ساغر رنگ و جمال ہر بط و نغمہ کیف و نشاط اور عیش و سرور میں گھرا ہوا رہنے والا جہانگیر وہ جانے کتنی دیر تک چتر منزل کے فرش پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔

(تمام شد !)

ادب لطیف :۔

اے میرے محبوب

(از جناب شیخ حسن صاحب شکل امراؤتی !)

تو فطرت کا وہ ساز ہے جس میں طائرانِ سبک نوا کے تمام نغمات جذب ہیں......

تو جذبات کا وہ رس بھرا نغمہ ہے جو عرش کی پرواز کو بھی شبک تر سمجھتا ہے۔

تو حرارتِ لطیف کا وہ متحرک عنصر ہے جو ذوقِ جمال کی تکمیل کرتا ہے۔
تو کلی کا وہ خوشگفتہ زمزمہ ہے جو نسیم گلستان کو مدہوش کردے
تو نور کی وہ رنگین قوس و قزح ہے جو انبساطِ روح کا سبب بن جائے
تو باغ و بہار کی وہ شادابی ہے جو جنوں نواز ثابت ہو۔
تو حسنِ خیال کا وہ مرقع ہے جو اپنی صنعت میں جواب نہ رکھتا ہو۔
تو مسرت و کیف کی وہ تنویر ہے جو قلوب میں مستی و سرشاری بھردے۔

بقیہ اردو ہندی ہندوستانی

یہی حال زبانوں کا بھی ہے مثلاً اگر آج کل آپ (بدن) کی جگہ (شریر) آسمان کے لئے (آکاس) اور سفید کی بجائے (سنگھ) وغیرہ انواع کے الفاظ کا استعمال جائز رکھیں گے تو شاید عوام کی ایک بڑی جماعت آپ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے گی۔ پس کیا ضرورت ہے کہ اردو زبان خوامخواہ ثقیل الفاظ سے بوجھل کی جائے۔ اب رہا رسم الخط کا سوال۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی رسم خط کی جگہ جو ناگری رسم خط استعمال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ حالانکہ ان ادب نواز حضرات کو خود ہی محسوس ہوتا ہوگا کہ ان کی یہ کوشش بھی کسی طور سے حق بجانب نہیں کہی جاسکتی۔

منجملہ ان امور کے اردو زبان دیگر اوصاف سے بھی متصف معلوم ہوتی ہے مثلاً اردو ہر خاص و عام کی روزمرہ کی زبان ہے۔ ہر شخص اس کو سمجھتا اور بولتا ہے۔ دفاتر پر بھی اس کا تسلط نظر آتا ہے۔ اس میں اخبارات کی تعداد بھی کثیر ہے۔ علاوہ بریں اس میں دوسری زبانوں کے مطالب ادا کرنے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اولی.. پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ دریافت کرنا کہ آخر اس سے پھر کیوں اجتناب بے سبب کیا جاتا ہے کوئی ناموزوں بات نہ متصور ہوگی۔ ہاں اس سے انکار نہیں کہ اردو رسم الخط میں کئی دشواریاں ضرور ہیں۔ جیسے انفصالی مشکلات صوتی مشکلات مشتبہ الصوت حروف کا املا وغیرہ لیکن اس کا مطلب یہ تو کبھی نہیں ہوسکتا کہ ہم اس زبان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیں بدیں وجہ کہ دنیا میں کوئی زبان بھی تو اس طور سے خالی از نقائص نہیں دکھائی دیتی بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو بعض زبانیں تو ہماری زبان سے بھی زیادہ پیچیدہ اور دشوار ملیں گی۔ لیکن دشواری کی وجہ سے کوئی شخص اپنی زبان چھوڑ کر دوسری زبان اختیار نہیں کرلیتا۔

پس ہم کو لازم ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کو چھوڑ کر اردو کی اشاعت میں کوشاں ہوں؛ کیونکہ جب تک پڑھے لکھوں کی تعداد زیادہ نہ ہوگی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ادب بھی مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہماری کوششوں کو فقط اسی تک محدود نہ رہنا چاہیئے۔ بلکہ مناسب اور ناگزیر تو یہی ہے کہ زبان کو مستحکم بنانے کی سعی میں قدم آگے بڑھایا جائے۔ اس میں ہر علم و فن کی کتابیں تصنیف کی جائیں۔ دنیا کی بہترین تصانیف کے تراجم سے اس زبان کو مزین کیا جائے تاکہ ہماری زبان اردو بھی دنیا کی دیگر ادبی زبانوں سے آنکھ ملا سکے۔ اور ان کے مقابلہ میں آنے کے قابل بن سکے۔

(تمام شد)

تمام مسلمان بھائیوں کو عید مبارک
اور ساتھ ہی ساتھ عید کی خوشی میں ایک پُر مسرت اعلان
اشوک پکچرس کی اولین سوشل پیش کش !
ڈائرکٹر
دیپک دیسائی
اداکاران
نسیم، کانتا، بابا
دیوی - عاشق حسین
للیتا - خان ، جمشید جی
بکنگ کے لئے لکھئے
ایکسلسیر فلم ایکسچینج بمبئی
انتظار کیجئے
عنقریب لیمنگٹن ٹاکیز کے پردۂ سیمیں پر پیش ہوگا
نوجوانوں کے لئے ایک خاص پیغام !
سماج کی بیہودہ رسم جہیز کے خلاف اعلانِ جنگ !
درشن واقعی درشن کے قابل ہے
پرکاش پکچرز کی انقلابی سوشل پیش کش !
ڈائرکٹر
لوھار !
میوزک
شاد علی !
افسانہ بجلی نوٹز - گانے وجد آور
مکالمے دل نشین
اداکاران
پریم ادیب - سس جیوتی - بدھواڈوانی ، پانڈے
شاکر ، ایم نذیر ، میرا ، کوشلیا اور امیر کرناٹکی وغیرہ
ایورگرین ریلیز !
روزانہ اوقات
لیمنگٹن ٹاکیز ۴ ، ۷ ، ۱۰ بجے
سنیچر - اتوار اور عید مبارک کے دن خاص شو ۱ بجے دوپہر
لیمنگٹن روڈ
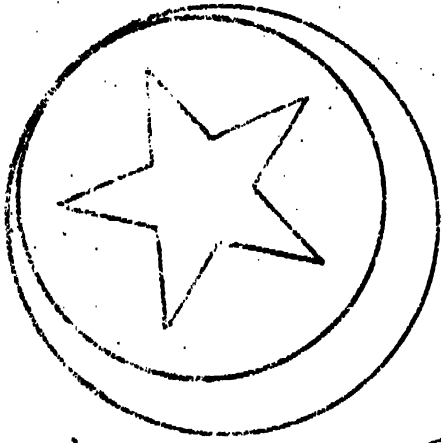
نیشنل اسٹبڈیوز اور ہندوستانی فلم کارپوریشن عید کی مبارک و
مسعود تقریب پر دلی مبارکباد دیتے ہوئے پیش کرتی ہیں
NATIONAL STUDIOS
میوزک :- انل بشواش
پوجا
دو بہنوں کا سنسنی خیز عبرت آموز و بصیرت افروز افسانہ جو کشاکش روحانی و مادی سے علیحدہ ہو کر بیک وقت ایک ہو جاتی ہیں۔
درخشندہ ستارے :- سردار اختر، ستارہ، ظہور راجہ وغیرہ
لاجواب ڈائرکشن اے، آر، کاردار
آنیوالے شاہکار :-
بہن
ڈائرکٹر :- محبوب
فلمی ستارے :- شیخ مختار، نلینی جیونت ....
نردوش
ڈائرکٹر :- دریندر دیسائی
ستارہ :- نلینی جیونت
کسوٹی
ڈائرکٹر :- رامچندر ٹھاکر
فلمی ستارے :- روز، پرلہاد، وینا
غریب کے لئے روٹی
ڈائرکٹر :- رامچندر ٹھاکر
ڈائرکٹر :- محبوب
مزید تفصیلات کے لئے لکھیئے
ہندوستانی فلم کارپوریشن ۱۶ بینٹنک اسٹریٹ کلکتہ
مبارک ہو عید الفطر مبارک ہو!
دی بھارت پکچرس لیمیٹڈ کے ذریعہ آپ نے ترقی اور مزاحیہ فلمیں دیکھیں اب یہی کمپنی عنقریب پیش کرنیوالی ہے
متصادم نظریات کا افسانہ پیش کرنے والا
اسپائر پکچرس کا جدید سماجی شاہکار!
درپن
ڈائرکٹر :- مسٹر علی!
ہندوستان میں عورتوں کا سماجی شاہکار!
سوامی ناتھ
آرہا ہے۔ کب۔ کہاں؟
فلمی ستارے :-
بکنگ :-
دی بھارت پکچرس لیمیٹڈ۔ سٹیل چیمبرس، فرنچ برج بمبئی
آگرہ اور دہلی

فاطمی سپہ سالار غازی جوہرؒ!

غازی جوہر کی ولادت سسلی ٹاپو میں ہوئی تھی آپ کا پورا نام ابوالحسن جوہر بن عبداللہ تھا اور آپ کے والد بزرگوار قلمرو حکومت ترکی کے باشندے تھے ابوالحسنؒ گریک کاتب کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن اس زمانے میں بھی چونکہ غلاموں کی تجارت عام تھی اس لئے آپ بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے اور آپ کو خلیفۂ بنی فاطمی معز دین اللہ نے اپنی خدمت میں لے لیا، کچھ عرصہ تک آپ خلیفۂ بنی فاطمی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بعدازاں عساکر بنی فاطمی میں شامل ہوئے اور اپنی دیانتداری وفاشعاری، شجاعت اور دلیری کی بدولت عساکر بنی فاطمی کے سپہ سالار کے عہدہ پر مامور ہوئے، اس زمانہ میں بنی فاطمیوں کی حکومت مغربی افریقہ میں تھی اور مصر کا حکمران جس کا نظم و نسق ناکارہ ہو چکا تھا۔ رعایا پر آئے دن مظالم ڈھا رہا تھا۔ اور جب اس کے مظالم کی کوئی انتہا نہ رہی تو باشندگانِ مصر کا ایک وفد خلیفۂ بنی فاطمی معز دین اللہ کی خدمت میں امداد و اعانت کی توقع پر گیا اور ۳۵۸ھ میں خلیفۂ بنی فاطمی کے حکم کے بموجب غازی جوہر معہ ایک لاکھ کی فوج کے مصر کی طرف روانہ ہوئے۔ اور ۳۵۸ھ میں الگزینڈرا کا محاصرہ کر کے زعمار حکومت کو صلح و مفاہمت پر مجبور کیا۔ غازی جوہر نے مصالحت و مفاہمت کے لئے جو مخلصانہ شرائط پیش کیں ان پر کم و بیش ہر فرقہ کے .... ذمہ دار لوگوں نے صاد کیا اور اظہارِ رضامندی کرتے ہوئے دستِ مصالحت بڑھایا لیکن اخشیدی عساکر کا سپہ سالار ان شرائط سے روگرداں رہا اور اپنا لشکر لیکر غیزہ کی جانب روانہ ہوا۔ جب غازی جوہر کو اخشیدی سپہ سالار کے کوچ کا علم ہوا تو موصوف نے اپنی فوج کو محاصرہ کا حکم دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عساکر اخشیدی کو شکست فاش ہوئی اور وہ راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئیں۔ اور اس بھگدڑ میں جو اخشیدی سردار اور سپاہی رہ گئے انہیں حراست میں لے لیا گیا۔ غازی جوہر نے اخشیدیوں کو شکست دینے کے بعد مصر کا رخ کیا اور جب باشندگانِ مصر کو غازی جوہر کی آمد کا علم ہوا تو انھوں نے اپنی طرف سے وزیر ابن الفرات اور امیر ابوجعفر کو غازی جوہر کے پاس بھیجا اور اس طرح رعایا کے صلاح و مشورہ کے بعد غازی جوہر نے مصر پر قبضہ کیا۔

مصر کا پرانا نام "فسطاط" تھا جسے خلیفۂ بنی فاطمی معز دین اللہ کی اجازت سے "القاہرہ" میں تبدیل کیا اور بعدازاں نئی عمارتیں۔ نئے راستے تعمیر کر کے الازہر یونیورسٹی کی اساس ڈالی۔ غرضکہ غازی جوہر نے خلفائے بنی فاطمی کی اطاعت و فرمانبرداری میں اپنی زندگی سرخروئی و نیکنامی کے ساتھ گذاری اور ۲۰ ذی القعدہ ۳۸۱ھ میں جامِ شہادت نوش فرمایا!!

سوگوار جوانی!

از ادیب انقلاب حضرت ملک سلمان الارشد فاروقی!

خاص برائے الاصلاح عید نمبر

ایک بصیرت افروز و عبرت خیز افسانہ!

نسیم سرمایہ دار کا دشمن۔ رسم ورواج کا قاتل، سماج کا مرتد اور آزادی کا پرستار تھا۔ اسکی نظر میں نوٹوں کی گڈیاں ردی کاغذ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھیں سونے اور چاندی کے سکوں کو اس نے کبھی سنگریزوں سے زیادہ قیمتی نہیں سمجھا۔ البتہ لیلائے آزادی کا دلیانہ اور وطن کا سچا پجاری تھا۔ اکثر اپنے اسی اصول کی بنا پر وہ کالج سے نکلتے نکلتے بچا۔ برخلاف اس کے جمیل آزادی کو ملک کے لئے مضر خیال کرتا تھا دولت کو وہ زندگی کا جزو لاینفک سمجھتا تھا۔ اس سلسلے میں اسے نہ غریبوں کی آہوں کی پروا تھی نہ مزدوروں کی فریاد اسکے دل کو موم کرسکتی تھی نہ یتیموں وبیکسوں کے گریے سے وہ متاثر ہو سکتا تھا۔ اس اجتماع ضدین کے باوجود وہ ایک دوسرے کے دوست تھے اور ایسے دوست کہ ایک دوسرے کے لئے اپنی زندگیوں کی بازی تک لگا سکتے تھے نسیم مفلس تھا مگر ایسا مفلس جسکو اپنی غربت پر غرور تھا۔ جمیل کی پرورش سونے اور چاندی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس نے متعدد بار نسیم کو مالی پیشکش کی۔ مگر خوددار اور غیور نسیم نے ہمیشہ اس پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میں گداگری کی نسبت موت کو ترجیح دیتا ہوں جمیل نے ہر چند کہا کہ یہ تحفۂ خلوص ہے مگر نسیم کی رائے میں یہ خیرات کا مہذب نام تھا شام کو منڈی کی مزدوری اور چند ٹیوشن اس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل تھے۔ زندگی نام ہی ہے تفکرات کا اسی لئے نسیم نے نہ تو ماں کی موت پر آنسو بہائے اور نہ باپ کے جنازے پر آہ و بکا کی۔

جمیل اور نسیم تعلیم ختم کرکے عملی دنیا میں داخل ہوگئے سنہرے خواب شرمندۂ تعبیر ہونے لگے۔ جمیل آئی سی ایس میں کامیابی حاصل کرکے جوڈیشیل آفیسر ہوگیا اور نسیم ایک معمولی وکیل۔ مگر خیالات میں تضاد اب بھی موجود تھا۔ البتہ خلوص کا چشمہ اسی تیزی سے اب بھی رواں تھا اور اس نے زمانہ کے تغیرات کے باوجود ہنوز راستہ نہیں بدلا تھا

ملاقاتوں کے سلسلے بھی برابر جاری تھے۔ زندگی کرب واذیت کے راستہ پر ہنوز گامزن نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کے نصف حصہ دار کے تخیل سے برابر دونوں لطف اندوز ہوتے جمیل کے اجلاس میں ایک حسین دوشیزہ قتل کے الزام میں ماخوذ تھی۔ اسکا ملکوتی حسن قانون داں صاحب کو متاثر کر رہا تھا۔ جمیل انسان تھا اسی لیئے اس نے نسیم کو مجبور کیا کہ وہ ملزمہ کی پیروی کرے اور نسیم نے نہ صرف اپنی خدمات اسکو پیش کیں! بلکہ دوران مقدمہ تک اپنے یہاں رہائش کی دعوت بھی دی جسکو تھوڑے سے انکار کے بعد حسین مجرمہ نے قبول کر لیا۔

نادرہ حسین تھی اور اسقدر حسین کہ اس کے حسن کو لفظوں کی بندشوں میں نہیں جکڑا جا سکتا تھا۔ وہ عمر خیام کی حسین رباعی کی دلکش تفسیر تھی، چغتائی آرٹ کا زندہ مرقع پھٹے ہوئے لباس میں بھی وہ یونان کے کسی ماہر فن سنگتراش کے حسین وجمیل نقش کا پرتو معلوم ہوتی تھی۔ شاید ہیلین اور کلوپٹرا کی رعنائیوں کے امتزاج سے اسکی تشکیل ہوئی تھی۔ طویل تنہائیوں نے ایکدوسرے کو آپسمیں اسقدر قریب کردیا کہ تعدد جفا ہوگیا شام کی چائے کے بعد نسیم نے اسکو مجبور کرکے اسکی سرگذشت کا حصہ دار بننا چاہا۔

میں ایک غریب جولاہے کی لڑکی ہوں جسکو دنیا ذلیل سمجھتی ہے۔ میں نے اسی ادنیٰ خاندان میں جنم لیا۔ جوان ہوئی اور قدرت نے میرے ماں باپ چھین کر مجھکو بے یارو مددگار بنادیا۔ نوکری پر دوسروں کا قبضہ تھا وہ مجھے نہ مل سکی مزدوری کے لئے نااہل قرار دیگئی۔ صرف سلائی ایک ایسا ذریعہ تھی جو کسی حد تک میرے پیٹ کی آگ کو کچھ ٹھنڈا کر دیا کرتی تھی۔ غریب کی جوانی اور خوبصورتی ایک مصیبت ہے البتہ وہ اگر عصمت کا سودا کرے تو فائدہ اٹھا سکتی ہے ورنہ تمام مصائب اسپر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے مکان کے برابر نواب احسن مرزا رہتے تھے مقتول خورشید ان کا ہی لڑکا تھا۔

سونے چاندی کے ڈھیروں کے وزن سے وہ معصوم جوانیوں کو کچلتا تھا۔ اسکی رائے میں غریب عورت کا حسن ہوتا ہی ہے امیروں کے لئے۔ مگر اس کے باوجود وہ غریبوں کے کشکول حسن میں چند طلائی و نقرئی ٹھیکریاں ڈال کر ان سے کھیلتا تھا۔ شروع شروع میں طلب براری کے لئے مجھے بھی یہی پیشکش کی مگر میں نے اس ذلیل پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا محبت کے محل تیار کر کے ان میں آنے کی دعوت دی گئی۔ میں نے ان محلوں کی بھی بنیاد ہلا دی۔ وہ اس چوٹ سے تڑپ گیا اور اس نے آخری تیر کو مجھ پر خالی کیا۔ ایک اندھیری شب میں گناہگاروں کی سی تاریک رات میں میرا سب کچھ لوٹنا چاہا۔ وہ مجھے نہ لوٹ سکا۔ مگر میں نے اسے لوٹ لیا۔ اس کی سب سے قیمتی شئے چھین لی اور اسکو مٹی کے قابل بنا دیا۔

اب انصاف اس "لوٹ" کے جرم میں میرا خون طلب کرتا ہے میں اس کیلئے تیار ہوں۔ اگر جرم اسی کا نام ہے۔ انصاف اسی کو کہتے ہیں۔ قانون یہی چیز ہے تو میں اس آماجگاہ پر اپنے خون کی بھینٹ چڑھانے سے نہیں ڈرتی۔ نادرہ یہ کہکر چپ ہوگئی نسیم کی آنکھوں سے چند آنسو نکلے ——

دونوں متحرک تھے ایکدوسرے کی قربت کیلئے۔ نادرہ اور نسیم اپنے میں ایک خاص کمی محسوس کر رہے تھے۔ نسیم نے اکثر ارادہ کیا کہ وہ نادرہ سے اس کمی کے بارے میں گفتگو کرے مگر ہمیشہ یہ سوچکر مجبور ہو جاتا کہ کہیں نادرہ اس شئے نتیجہ نہ نکال لے کہ اسطرح وہ احسان کا بدلہ چاہتا ہے جو وہ اپنا فرض سمجھ کر انجام دے رہا ہے۔

نادرہ ایک عورت تھی اور گہوارۂ مشرق میں اس نے پرورش پائی تھی اسی لئے وہ بھی اپنے اس راز کا نسیم کو حصہ دار نہ بنا سکی جو اکثر اسکو دنیا و ما فیہا سے بے نیاز کر دیتا تھا۔ نسیم بڑی محنت سے نادرہ کو تختۂ دار سے اُتارنے کی سعی کر رہا تھا۔

برسات کی کالی رات تھی پانی بڑے زور شور سے برس رہا تھا ٹھنڈی ہوا کے لطیف جھونکے نادرہ کے حسین بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ نسیم اور نادرہ ایکدوسرے سے بچکر ایکدوسرے کو دیکھ رہے تھے یکایک وہ بولی۔

" وکیل صاحب۔ اب مقدمہ کس مرحلہ پر ہے؟ پولیس تو آپکے خلاف کوئی مضبوط شہادت نہ پیش کر سکی۔ آپکا بری ہونا یقینی ہے۔

گر وکیل صاحب۔ نسیم نے فوراً بات کاٹتے ہوئے کہا۔ دیکھئے میں کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ آپ میرا نام لیا کیجئے وکیل صاحب نہ کہا کیجئے۔

یہ ناممکن ہے۔ میں اپنے محسن کا نام ہرگز نہیں لے سکتی۔ ایسے محسن کا جو مجھے تختہ دار سے واپس لا رہا ہو۔ میں تو اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ اب تو میں اپنے کو نئی نادرہ سمجھتی ہوں۔ بالکل نئی اور اس قالب میں نئی روح ڈالنے والے آپ ہیں۔

تو —— پھر —— یہ کہکر نسیم سگرٹ جلانے لگا۔

تو پھر کیا؟

وہ یہ —— نسیم کہتے کہتے رک گیا۔

کہئے۔ آپ تو خاموش ہو گئے۔

میں کہہ رہا تھا کہ۔ تو پھر۔ اس نئی زندگی کو آپ مجھے ہی بخش دیجئے۔ جملہ پورا کر کے نسیم گھبرا گیا اور اپنی اضطراری حالت کو چھپانے کیلئے اخبار دیکھنے لگا۔

نادرہ کا چہرہ گلہائے رنگا رنگ کی سرخیوں کا مرکز بن گیا۔

جذبات پر قابو پاکر نسیم نے کہا۔ اچھی نادرہ اس سوال پر خوب غور کرلو میں ابھی

جواب نہیں مانگتا۔

مگر سُنئے تو اس نے آہستہ سے کہا

کہو۔ اچھی نادرہ۔

وہ یہ کہ میں ایک جولاہے کی بیٹی اور قاتلہ ہوں۔ ایسی قاتلہ جس کی عصمت پر حملہ کیا گیا۔ جس کے متعلق دنیا نہ معلوم کیا کیا قیاس آرائیاں کرتی ہے۔ زیادہ تر لوگ اسکو بدچلن اور آوارہ سمجھتے ہیں۔ ایسی عورت کو آپ اپنانا چاہ رہے ہیں۔ غور کر لیجئے آپکی پوزیشن کیا ہو جائے گی۔ دنیا کیا کہے گی عدالت میں آپ وکیلوں کو کیسے منہ دکھا سکینگے جج و منصف کے اجلاس میں آپ کیسے جائیں گے۔ بازار میں گذرتے وقت لوگ آپ پر فقرہ چست کریں گے۔ کیا آپ یہ سن سکیں گے۔

نسیم نے یہ سنکر جوش سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

نادرہ تم حور ہو۔ تم فرشتہ ہو۔ جولاہے کے یہاں پیدا ہونے سے تمھاری عزت

بقیہ لال کنور!

مگر بادشاہ مبہوت حسن معصوم کی نگاہوں کو دیکھ رہے تھے جن میں دنیا بھر کا حسن سمٹ کر آگیا تھا جو اتنی گناہ آلود ہونے پر بھی معصوم معلوم ہو رہی تھی اور معصوم ایسی کہ سینکڑوں شہزادیاں کا حجاب نظر اُن پر قربان۔

بادشاہ دفعتاً محویت سے چونکے اور کہا ہمیں تم سے ہمدردی ہے۔ تمہاری عرضداشت کا جواب ہمارا عدل ضرور دیگا۔ مگر اس کے ساتھ تمہیں بھی ہماری نگاہوں کا جواب دینا ہوگا لال کنور ہر چند کہ ٹھٹھری مگر وہ تو طوائف تھی، ایسی رنگین باتیں سننے کی عادی تھی۔ ایسے نت نئے رنگین مزاج سے واسطہ پڑتا تھا جو اس کے قدموں پر نچھاور کرنے کے لئے ستاروں کی جنبش، چاند کی لرزش اور آفتاب کی روانی لانے کو تیار رہتا تھا۔ بھلا لال کنور ان الفاظ کو کیا اہمیت دے سکتی تھی۔ البتہ اتنا اثر ضرور ہوا کہ اُس نے بادشاہ کے الفاظ کی قدر کی۔ اور کہا:- "جہاں پناہ اگر انتقام میں میرا ہاتھ بٹوائیں گے تو میں آپکی لونڈی ہوں"۔ بادشاہ فرط مسرت سے کانپنے لگے۔ ان کے ہونٹوں پر لرزش تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر نہ کہہ سکے۔ آخر خون تیموریہ میں حدت پیدا ہوئی۔ اور بادشاہ نے پر وقار لہجہ میں کہا:"ہم اسکا پاس کریں گے"

یہ بادشاہ کے الفاظ تھے۔ ان میں بہت وزن تھا۔ لال کنور بادشاہ کے قدموں پہ جھک گئی۔ اور اب محل خاص کی دیواریں لال کنور کے حسن ضیا بار سے منور تھیں۔

(۳)

روزانہ قتل کی وارداتیں ہونے لگیں۔ تمام شہر میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ ہر گلی و کوچہ میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ ہر پولیس چوکی پر رپورٹیں ہونے لگیں۔ مگر قاتلوں کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا۔ ہر طرف سے بادشاہ کے پاس پیغامات آنے لگے۔ ایک طوفان تھا جو تمام دہلی پر چھا گیا۔ روزانہ فرمان شاہی جاری ہونے لگے لیکن قاتلوں کا کوئی سراغ نہ لگا۔ سراغ بھی کیسے لگتا۔ جبکہ وہ خود بادشاہ کی پناہ میں تھے۔

لال کنور خوش تھی کہ اس کے محبوب کا انتقام قانون کے فیصلہ کن ہاتھ خود لے رہے ہیں۔ اس کی مسرتوں کی انتہا نہ تھی۔ صرف اسلئے کہ وہ قانون کو خود اختیار بنا رہی تھی وہ ممتاز محل کیا بنی تھی کہ اُس کے پاؤں زمین پر نہ لگتے تھے۔ بادشاہ اس کی ہر جنبش نگاہ پر جان دینے کو تیار رہتا تھا۔ محل کی تمام بیگمات اب لال کنور کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ بادشاہ نے صرف لال کنور کو اپنی نوازشات کا مرکز بنایا بلکہ اس کے بھائی خوشحال خان کو اکبر آباد کی صوبیداری دیدی۔ محبت بھی اندھی ہوتی ہے جو یہ نہیں دیکھتی کہ صوبیداری جیسی اہم ذمہ داری کا کام ایک کوٹھے پہ بیٹھنے والی عورت کا دلال کیسے پوری کر سکتا ہے۔ اب ڈوموں کا دور دورہ تھا جس طرف نظر اٹھتی تھی ڈوم ہی ڈوم برسر اقتدار نظر آتے تھے۔ غرضیکہ محبت نے بادشاہ کو بے قابو کر دیا تھا جس نے بادشاہ کو غلام بنا لیا تھا۔ مگر ان تمام باتوں سے آصف الدولہ وزیر اعظم ناخوش تھا وہ بادشاہ سے یہ توقع نہ رکھتا تھا۔ روزانہ قتل کی وارداتوں اور بادشاہ کی اس محبت پرستی سے شہر میں بغاوت کے جراثیم پرورش پانے لگے۔ آصف الدولہ نے آخر اپنی انتھک کوششوں کے بعد قاتلوں کو گرفتار کر لیا۔

(۴)

جنوری ۱۷۱۳ء کی صبح درخشاں اپنی جلو میں سینکڑوں رنگینیاں لئے آئی مگر ان رنگینیوں کا عنوان بہت بے چین نظر آرہا تھا۔ جہاندار شاہ بادشاہ تخت شاہی پر جلوہ افروز تھا دربار عام میں اراکین سلطنت درجہ بدرجہ بیٹھے تھے۔ عوام ایک ہال میں جوق در جوق جمع ہو رہے تھے۔ بہت سی آوازیں مشترکہ طور پر آرہی تھیں۔ ایک مدبر آواز نے تمام مجمع کو خاموش اور متوجہ کر دیا اور یہ آواز آصف الدولہ بہادر کی تھی۔

"جہاں پناہ عوام کے مطالبہ کو جانتے ہیں۔ قاتلوں کے لئے کیا ارشاد ہے؟"

"ہم رعایا کی خواہش پر صاد کرتے ہیں۔ خون کا بدلہ خون ہونا چاہیئے۔ وہی فیصلہ جو جد امجد شہنشاہ جہانگیر نے دیا۔ بادشاہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ آصف الدولہ نے بادشاہ کی جانب اشارہ کیا:-

"قاتل جہاں پناہ ہیں، خاکسار اور رعایا کے پاس یہ ثبوت ہے کہ آپ کے ایما سے قتل ہوئے۔ آپ نے لال کنور کی محبت سے مجبور ہو کر ایسا کیا۔

ان الفاظ کی ادائی کے بعد لال کنور کو حاضر کیا گیا اور اس نے بادشاہ کے قاتل ہونے کے مختلف ثبوت بہم پہنچائے۔ بادشاہ تخت شاہی سے اٹھے۔ آہ دوست میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آرہا ہے۔ بادشاہ نے تاج شاہی تخت پر رکھ کر کہا:-

"ہم مجرم ہیں۔ ہماری رعایا ہمیں سزا دے سکتی ہے۔ ہم بیان نہیں کر سکتے کہ ہم نے

باغی عورت

ایک سبق آموز افسانہ!

از حضرت انجم سلمانی

خاص برائے الاصلاح عید نمبر

آسام کی پیچیدہ اور بل کھاتی ہوئی گھاٹیوں میں وہ خاموش سر جھکائے ہوئے جا رہی تھی۔ افق مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں اس کے افسردہ چہرہ کے گندمی رنگ کو اور زرد بنا رہی تھیں۔ اور سبک خرام باد صبا کے ہلکے ہلکے اور نرم نرم جھونکے اس کی پریشان زلفوں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے جیسے بادۂ شباب میں مخمور نوجوان کسی شوخ و طرار دوشیزہ سے چہل کرتا ہو۔ . . . آسمان پہ بادلوں کے سفید چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اسوقت ایک شفاف ندی کا منظر پیش کر رہے تھے جس کی مترنم روانی میں ایک کیف آگیں نغمہ پنہاں ہو اور وہ ساز سے نکلنے کے لئے بیچین ہو۔ مگر یہ روح افزا منظر اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ناکافی تھے اور وہ گردن جھکائے ہوئے اپنے خیالات میں مستغرق . . . کسی خیال میں کھوئی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اور اس کو اپنے ہموطنوں پہ رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ وہ کیوں اس جنگ آزادی سے متاثر ہو کر اور اس میں حصہ لے کر اپنی بیداری کا ثبوت نہیں دیتے۔ وہ بہت عرصہ سے سن رہی تھی کہ آج فلاں شہر کے نوجوانوں نے اپنے آپ کو آزادی کی دیوی پہ بھینٹ چڑھا دیا۔ آج فلاں شہر میں نوجوانوں کے ایک گروہ نے ظالم حکومت کے سنگین ایوانوں کو متزلزل کر دیا۔ اور فلاں جگہ کے سر فروش اور خوددار فرزند آزادی کے لئے اپنی جانیں ہتھیلیوں پہ لئے پھر رہے ہیں۔ یہ واقعات سنکر اس کے دل میں جوش پیدا ہوتا اور وہ خیال کرتی کہ کاش میں اس ظالم و کی لڑائی میں حصہ لے سکتی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور صہبائے شباب سے مخمور آنکھیں ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف اٹھائیں۔ شفق کی خون جیسی سرخی میں ڈوبا ہوا سورج اپنی آخری کرنوں سے اسکو کوئی پیغام نو . . . . . دیتا ہوا معلوم ہوا۔ اس کے نازک لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جیسے کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل نہ پا کر اپنی کمزوری چھپانے کیلئے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتا ہے اس نے اپنی پریشان زلفیں برابر کیں اور پھر اپنا راستہ طے کرنے لگی۔

(۲)

وہ آسام کی پروبت قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس نے اپنے خاندان کے فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ایک مشن اسکول میں نویں کلاس تک تعلیم حاصل کی تھی اس لئے سر زمین آسام کے پہاڑی لوگوں کی نظروں میں اس کی بہت وقعت تھی اور وہ خیال کرتے تھے کہ یہ نیلی آنکھوں والی دوشیزہ . . . شاید کوئی دیوی ہے۔ جو ہماری نیکیوں کا دنیاوی معاوضہ عطا کرنے کے لئے ایک عورت کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے۔ وہ خود بھی ایک روشن دماغ خاتون تھی اس نے اپنی اس تھوڑی سی عمر میں جبکہ وہ اپنی زندگی کی انیسویں بہار دیکھ رہی تھی۔ اپنی قوم کو ایسے سبق دیئے کہ پہاڑی لوگوں کا یہ خیال یقین میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ:-

"خدا نے ہمکو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ تمام پیشوں کو چھوڑ کر ہم صرف اس کی پرستش ہی کو اپنی روزی کا وسیلہ بنالیں اس طرح ہم سے خدا خوش نہیں ہوتا۔ ہم کو چاہیئے کہ نظام زندگی کے تمام شعبوں میں حصہ لیکر نہ صرف اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیں بلکہ اس طرح خدا کو بھی خوش کریں تاکہ وہ ہماری نیکیوں کا دنیاوی معاوضہ عطا کرے"۔

اس کے اس عقیدہ نے اس کی تمام قوم میں ایک ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ انھیں دنوں میں ملک کے آزادی پسند طبقہ نے حکومت کو چیلنج کیا کہ ہمارا مطالبہ حریت منظور کیا جائے۔ ورنہ ہم اپنے پیارے وطن پہ قربان ہونے کو تیار ہیں۔ ان کا مطالبہ جائز تھا۔ مگر افسوس کہ ان کی آواز صدائے بازگشت ہو کر رہ گئی۔ اور حکومت نے اسکا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ پھر کیا تھا! ملک کے گوشہ گوشہ میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اور انقلاب پسند دھڑا دھڑ جیلوں

بقیہ رزار!

روگریڈی نے یہ بھی کہا کہ وہ اس جھونپڑی کے پاس تنہا رہکر شیر کا انتظار کرینگے۔ وہ اس رات کو تنہا وہاں گئے۔ نہ گرین اس کے ساتھ گیا نہ میں، انھوں نے بھی ساتھ چلنے کے لئے ضد نہیں کی۔ شاید انھوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ہم لوگ اپنے کمیل کے ساتھی کو گولی سے ہلاک کرنے کیلئے زیادہ بیچین نہیں ہیں۔

روگریڈی رات بھر بیٹھے رہے۔ مگر اتفاق سے شیر نظر نہ آیا۔ میرے ایک ہندوستانی شکاری دوست نے جھونپڑی کے آس پاس کی جگہ کا معائنہ کرکے بتایا کہ اس شیر نے جس کا ایک پنجہ غائب تھا جھونپڑی کے کچھ فاصلے پر چکر لگایا تھا۔ شاید اسے شبہ ہو گیا تھا اسلئے وہ جھونپڑی کے زیادہ قریب نہیں آیا تھا۔

کچھ دنوں بعد پھر کسی شیر نے کوئی ۶ میل کے فاصلے پر ایک بکری مار ڈالی بکریوں کے چرواہے نے شیر کو بکری مارتے ہوئے صاف دیکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ شیر کے ایک ہی کان تھا۔ اوگریڈی نے بھی اس جگہ کا معائنہ کیا۔ رزار ہی کے پاؤں کے نشان تھے۔ وہ اُسے گولی مارنے کی غرض سے بیٹھے تھے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی طرح تھوڑے عرصہ میں آٹھ نو گھریلو جانور مار ڈالے گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سب رزار ہی کی حرکتیں ہیں۔

ہملوگ ایک روز شام کو اوگریڈی کے بنگلے میں بیٹھکر رزار کی ان حرکتوں کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ خوب اندھیرا ہو گیا۔ بھیڑیوں نے ایک دم سے الاپنا شروع کر دیا تھا۔ بھیڑیوں کی چیخ و پکار سنکر اوگریڈی کا بل ٹیریر کتا باہر جاکے بھونکنے لگا۔ یکایک ہم لوگوں نے اس کی ہولناک چیخ سنی ساتھ ہی کئی بار گرج سنائی دی پھر بالکل سناٹا چھا گیا۔ ہم تینوں بھاگے ہوئے باہر گئے، اور جیمی کو بار بار آواز دینے لگے مگر اسکا کچھ پتہ نہ چلا۔ ان کا کتا غائب ہو گیا جسے انھوں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ رزار نے اتنے دنوں کے بعد جیمی سے انتقام ہی نہیں لیا بلکہ اسے مارکر اپنا پیٹ بھی بھرا۔ شیر کتوں کا فرشتۂ موت ہے۔

اوگریڈی کے اس نقصان کا مجھے بہت صدمہ ہوا وہ اپنے موٹے تازے جیمی سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آگئی کہ میں نے رزار کو آزاد کرکے بہت برا کیا۔ مگر اب پچھتانا بیکار تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ رہا کرنے کے بعد رزار سے میری دو دفعہ ملاقات ہوگی۔ ایک بار مجھے وہ اپنے قابو میں پائے گا اور دوسری بار میں اسے اپنے قابو میں پاؤں گا۔

اس واقعہ کے کوئی تین ہفتے بعد اس سے میرا سامنا ہوا۔ بارش کا شروع زمانہ تھا۔ دھوپ نکلا تھا پانی برسنے کے بعد شام کو کھلا تھا۔ میں اپنی بندوق لیکر نکل پڑا میں کچھ شکار ہی کھیلنے کی غرض سے نہیں نکلا تھا لیکن سوچا بندوق ساتھ میں رہے پھر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا۔

میں جنگل میں گھسکر ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور وہاں بیٹھکر قدرتی منظر کی سیر کرتے کرتے سنبھر کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد یکایک ٹیلے کے نالے میں ایک سنبھر دکھائی دیا وہ میرے قریب آگیا تھا سنبھر کے رنگ ڈھنگ سے معلوم ہوا کہ وہ خوفزدہ ہو رہا ہے اور سہمی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کیوں خوفزدہ ہو رہا ہے میں بھی چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ سنبھر بڑی تیزی سے وہاں سے بھاگا اور اسکی جگہ رزار دکھائی دیا وہ پہلے سے بڑا اور طاقتور ہو گیا تھا۔ مگر بدن سے کچھ دبلا نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے قد و قامت کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک جنگلی کتوں کا ایک غول آ پہونچا۔ یہ کتے بڑے خوفناک ہوتے ہیں۔ اور شیر کے خون کے لالچ سے دل بندی کرکے شیر پر حملہ کرتے ہیں۔ شیر ان کے ڈر سے جنگل چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کتوں نے چاروں طرف سے رزار کو گھیر لیا۔ رزار ڈر کے مارے "غوں غوں" کرنے لگا۔ اور رہ رہ کر "پیچ پیچ" کی آواز کے ساتھ دانت دکھانے لگے۔

یہ بات مجھ سے برداشت نہ ہو سکی۔ کہ میرے پالے ہوئے شیر کو میری آنکھوں کے سامنے کتے پھاڑ کر بکا بوٹی کر ڈالیں۔ میں نے بندوق اٹھا کر داغ دی۔ یہ دیکھکر کہ کئی کتے مر گئے اور باقی کتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ رزار بچ گیا۔

بندوق کی آواز سنکر رزار نے اوپر نگاہ اٹھائی تو مجھے ٹیلے پر بیٹھے دیکھا میں نے بندوق اٹھا کر اس پر نشانہ باندھا۔ چالاک جانور میرے ہاتھ میں اسطرح بندوق دیکھکر

شاید سمجھ تو گیا ہوگا کہ میں جب چاہوں اسکا خاتمہ کرسکتا ہوں۔ مگر وہ میرے سامنے سے بھاگا نہیں۔ شاید یہ خیال کرکے کہ میں نے اس کی جان بچائی ہے وہ اطمینان سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں بھی اسپر نشانہ باندھکر بھی گولی نہ چلاسکا۔ رزار ایکدفعہ میری طرف دیکھ دیکھ کر آہستہ آہستہ ایکطرف چلاگیا۔

گھر آنے کے بعد میں نے تمام باتوں پر غور کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے رزار پر گولی چلاکر بہت بڑی غلطی کی۔ مجھ سے بڑی حماقت ہوئی جو اُسے ختم کرنیکا موقع پاکر بھی میں نے اسکو چھوڑ دیا۔ یہ خیال کرکے کہ آیندہ وہ نہ جانے کتنے لوگوں کا نقصان کریگا جی چاہا کہ اپنے ہاتھ سے اپنا سر پیٹ لوں۔

اس کے بعد سخت بارش ہوئی۔ کئی ہفتے گذر گئے۔ رزار کی کسی نئی شرارت کی خبر نہیں ملی وہ کئی ہفتے بالکل غائب رہا۔ میں نے سمجھا کہ وہ اس پہاڑی علاقے سے نیچے اتر گیا ہے۔ میں اسے بھول گیا تھا کہ یکایک خبر ملی کہ ایک شیر نے ایک گڈریے کو مارڈالا ہے سننے میں آیا کہ ایک بڑے شیر نے یکایک بکریوں کے غلّے پر حملہ کیا۔ خوفزدہ گڈریے نے کوئی اور چارہ نہ دیکھ کر اپنی لاٹھی سے شیر کو مارا۔ چوٹ کھاتے ہوئے شیر نے گڈریے پر حملہ کرکے اسے ہلاک کرڈالا۔ مرے ہوئے گڈریے کے ایک نوجوان ساتھی نے ہملوگوں سے یہ سب حال بیان کیا۔

ہم لوگوں نے مقام واقع پر جاکر گڈریے کی لاش اور رزار کے بے پنجے کے پاؤں کا نشان دیکھا ہملوگ اسی وقت اسکی تلاش میں جنگل گئے۔ مگر کوشش بیکار گئی۔ رزار مردم خور بن گیا اب میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ رزار کو دیکھتے ہی اسپر گولی چلادوں گا۔ لوگوں کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ جس شیر کے منھ آدمی کا خون لگ جاتا ہے اس سے زیادہ چالاک دوسرا شیر نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ کے بعد ایک مقامی شکاری صبح کے وقت جنگلی مرغیوں کا شکار کررہا تھا کہ رزار کے سامنے پڑگیا۔ رزار نے اسے بھی مارڈالا۔ ہملوگوں نے جاکر شکاری کی بے سر لاش دیکھی۔

ہملوگ ایک ہفتے تک رزار کی تلاش کرتے رہے مگر ہماری کوئی کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ اب اوگریڈی نے اسکا نام "شیطان ملعون" رکھدیا۔

رزار کی تلاش میں کمی ہوتے ہی اسکا حملہ پھر شروع ہوگیا۔ کچھ مزدور عورتیں ایک جنگل کا کنارہ صاف کررہی تھیں یکایک رزار ان پر ٹوٹ پڑا اور ایک کو منھ میں دبا کر چل دیا۔ اس کی اس حرکت سے پتہ چل گیا کہ اب اسے آدمی کے گوشت کے سوا کسی جانور کا گوشت پسند نہیں آتا۔

اس حادثہ سے مزدوروں میں دہشت پھیل گئی۔ ان کی بے چینی دیکھکر ہملوگوں کو اندیشہ ہوگیا کہ کہیں یہ ہمارا کام چھوڑکر بھاگ نہ جائیں۔

ہمیں اطلاع ملی کہ رزار کے پاس کے ایک گھنے جنگل میں گھستا دکھائی دیا ہے میں نے کچھ ہندوستانی شکاریوں کو بلایا وہ ٹھیک وقت پر آگئے۔ ان کے آتے ہی میں نے اوگریڈی کو اطلاع بھیجدی۔ اور خود ٹہلتا ہوا آگے بڑھا کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ اسلئے بندوق نہیں لی۔ میں نے جسجگہ رزار کو اس کے بچپن میں دیکھا تھا۔ ٹہلتا پھرتا اس جگہ جا پہونچا۔ موڑ سے گھومتے ہی بغل کیطرف میری نظر پڑی۔ میں دھک سے رہ گیا۔ مجھ سے تیس چالیس فیٹ کے فاصلے پر خوفناک شکل کا ایک شیر بیٹھا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا یہ وہی کن کٹا رزار تھا۔ وہ پورے قد کا موٹا تازہ شیر تھا اس کے مضبوط بدن کی رگیں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ ایک پہلوان سا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ہولناک صورت دیکھ کر میں نے بھاگنا چاہا مگر مجھ سے بھاگا نہ جاسکا۔ میرے پاؤں بوجھل معلوم ہورہے تھے۔ مجھ سے قدم نہ اٹھ سکا۔ میں صفائی کے ساتھ قبول کرتا ہوں کہ شیر کو دیکھ کر میں خوف سے کانپنے لگا۔

رزار شکار پر کود پڑنے کے لئے سینے کے بل بلّی کیطرح بیٹھ گیا۔ اس کے کان بھی سر سے مل گئے۔ اس کے بیٹھنے کا وہ انداز اور اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے گذرے ہوئے دنوں کی یاد آگئی۔ رزار اسی طرح بیٹھ کر مجھ سے کھیلا کرتا تھا میں نے اسکی طرف دیکھ کر پکارا۔ "رزار! رزار!"

میری آواز سنکر شیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسکی ٹیڑھی دم کتنی خوبصورت تھی۔ چپ چاپ سہمے ہوئے کھڑے ہوکر دیکھا اس نے اپنے سامنے کا ایک پاؤں کا پنجہ بالکل پہلے کی طرح اٹھایا وہ بچپن میں مجھ سے کھیلتے وقت اسی طرح پنجہ اٹھایا کرتا تھا۔ میں نے پھر پکارا: رزار! رزار!"

تھوڑی دیر میں اس کے کان پیچھے کیطرف لٹک گئے۔ اور وہ بہت آہستہ سے دو تین قدم آگے بڑھ آیا۔ پھر جیسے وہ خوش ہوکر دوڑتا ہوا میری طرف آنے لگا۔

اسی درمیان میں جنگل کی آڑ سے میں نے رائفل کی ایک آواز سنی۔ ساتھ ہی رزار کے قدم رک گئے۔ وہ دوبار چکر کھاکر میرے قدموں کے پاس گرپڑا اور مرگیا۔ وہ پہلے پہل جس جگہ مجھ سے ملا تھا۔ تقریباً اسی جگہ وہ مجھ سے آخری بار رخصت ہوا۔

چند ہی لمحہ کے بعد اوگریڈی نے میرے سامنے آکر جوش کے ساتھ کہا: "خدا کا شکر ہے صاف بچگئے۔ تمہاری آواز سنکر مجھے خیال ہوا کہ تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ اسکے بعد میں نے جھاڑی سے دیکھا کہ وہ تم پر حملہ کرنے کے لئے دوڑا۔ اگر مجھ سے ایک لمحہ کی بھی دیر ہوجاتی تو وہ شیر تمھیں کھاڈالتا"!

اسوقت اگرچہ میں نیم بیہوش ہوں۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ اوگریڈی کا یہ کہنا درست ہے۔ میں اوگریڈی کو چھوکر کہہ سکتا تھا کہ میری آواز سنکر رزار کو اپنا بچپن یاد آگیا تھا اور اپنے بچپن کو یاد کرکے وہ اس وقت بھی اسیطرح پیار کی امید سے میرے پاس آرہا تھا..... ممکن ہے میرا خیال درست نہ ہو!!

ہفتہ وار الاصلاح کا مطالعہ آپ کو تمام جرائد سے بے نیاز کردے گا!

میں سٹونس دیئے گئے۔ سرفروش کو پھانسیاں دی گئیں۔ آزاد خیال نوجوانوں کے جسموں کو بیتوں کی سزا برداشت کرنا پڑی مگر ہوشہ ان باتوں کے باوجود ایسا...... وہ روز ان کے حالات اخباروں میں پڑھتی تھی اور دل ہی دل میں اپنی کمزوری پر پیچ وتاب کھا کر رہجاتی۔ آج کی رات کو اس کی برادری میں کسی کی شادی کی تقریب تھی اور اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ کہ وہ آج ضرور وقت کا پیغام لوگوں کو سنائے گی اور ان سے استدعا کرے گی۔ کہ تم خواب غفلت سے چونک کر اپنی بیداری کا ثبوت دو!

(۳)

سورج غروب ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ آسمان پر تاریکی اپنا تسلط جمانا چاہتی تھی مگر ننھے منے تارے اسکو اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہونے دیتے تھے وہ اس گاؤں کے بالکل قریب پہونچ چکی تھی جہاں کہ شادی ہو رہی تھی۔ لوگ اپنے ہاتھوں میں بڑی بڑی مشعلیں لئے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے تاشوں کی کرخت آواز کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتی تھی اور تاشوں کی کرخت آواز میں بانسری کی سریلی آواز.. کسی مظلوم کی ہلکی سی چیخ کے مانند سنائی دیتی تھی۔ وہ سب کی نظروں سے بچتی ہوئی ایک پوشیدہ جگہ میں جاکر بیٹھ گئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر لوگوں کو اس کی موجودگی کا علم ہو گیا تو وہ تمام کام چھوڑ کر اس کی تعظیم و تکریم کرنے لگیں گے اس لئے اس نے ابھی اپنے کو ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ آدمیوں کی مختلف قسم کی آوازیں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا شور تاشوں کی آواز میں مل کر فضا میں ایک عجیب قسم کا تنوع پیدا ہو گیا تھا گاؤں میں اسقدر مشعلیں روشن کی گئی تھیں کہ انھیں دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ شاید یہاں آگ لگ گئی ہے۔ کچھ دیر بعد پہاڑی لوگوں کا ناچ شروع ہوا۔ یہ لوگ اپنے جسم سے جانوروں کی کھال لپیٹے ہوئے تھے۔ گلے میں ہڈیوں کی مالائیں پہنے ہوئے اور سروں پر لانبے لانبے پروں کی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص کے ہاتھ میں خوفناک برچھی نما ایک ہتھیار تھا جسکو وہ لڑائی کے انداز میں گھما رہے تھے یہ لوگ مست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ اور ناچنے میں قسم قسم کی آوازیں منہ سے نکالتے تھے۔ یہ خاموش اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور ان لوگوں کی غفلت پر آنسو بہا رہی تھی۔ ایک گھڑی رات گذر جانے کے بعد دولہا کی برات آئی اور سب لوگوں نے مسرت سے اس کا استقبال کیا۔ اب شور بند ہو گیا تھا۔ اور ہر شخص یا تو دولہا کی خاطر مدارات میں مصروف تھا یا براتیوں کی تواضع کر رہا تھا۔ تاشہ اور بانسری بجانا بھی اسوقت موقوف کر دیا گیا تھا اور بجانیوالے خاموشی سے دولہا کی صورت دیکھ رہے تھے۔ جو شیر کی کھال لپیٹے ہوئے اور سفید پروں کا مجد اتاج اپنے سر پر رکھے ہوئے نہایت شان و تمکنت سے بیٹھا ہوا تھا اتنے میں ایک پروہت آیا اور اس نے بیاہ کی رسومات ادا کیں اور دلہن کو لاکر دولہا کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ شادی کی تمام رسمیں ادا ہو چکی تھیں۔ . . . . وہ براتیوں کو اپنا پیغام سنانے کے ارادہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ان کی طرف جانے سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

"اے خدا — اگر کروڑوں انسانوں کا مطالبہ آزادی سچا ہے اور
میرا جذبہ صادق ہے تو مجھ میں ہمت پیدا کر اور میری زبان میں ذلاقت
عطا کر جس سے میں ان لوگوں کو ان کے حقوق کا احساس کرا سکوں۔"

یہ دعا مانگ کر وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی۔ جیسے اس کو یقین آگیا کہ اس کی آواز پر یہ تمام لوگ لبیک کہیں گے۔ وہ براتیوں کی طرف چلی اور بہت جلد ان کے پاس پہونچ گئی جس طرح ایک صنم پرست پوجا کرتے وقت خلاف توقع بت میں جلوۂ حقیقی دیکھ کر ہوا اور جوش مسرت سے سب نے چلا کر کہا۔

"دیوی ——— !"

اور سب کے سر عقیدت مندانہ انداز میں جھک گئے۔ جیسے وہ اس کی تعظیم کر رہے ہیں۔ وہ سب کے بیچ میں آکر کھڑی ہو گئی۔ ہر شخص پر کامل خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے وہ اس کے منہ سے کچھ سننے کے لئے منتظر ہیں۔ سب کو خاموش دیکھ کر اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لئے منہ کھولا مگر...... ایک مرتبہ اور اس کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا اور اس کا نصف منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ . . . لیکن فوراً ہی اس نے اپنی حالت درست کر لی اور غصہ میں چیخ کر کہا۔

"بھارت کے غلام بیٹو"...... شیر انسانوں کے گیدڑ بچو"!!

تمام مجمع کانپ گیا۔ ان میں سے کسی نے آج تک اس کو غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ سب لوگ پوری توجہ سے اس کی بات سننے لگے...... وہ کہہ رہی تھی۔

"میں تم کو آج ایک نیا پیغام سنانے آئی ہوں مجھے تم پر اعتماد ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ تم اس پیغام کو غور سے سنوگے اور اس پر عمل کروگے۔"

تمام لوگ اس کا پیغام سننے کیلئے بیتاب ہو گئے ان میں سے ایک شخص بے اختیار کھڑا ہو گیا اور اس نے نہایت ادب سے سر جھکا کر کہا۔

"دیوی...... ہمیں خوشی ہے کہ تمھیں ہم پر اعتماد ہے۔ خدا کے لئے اپنا پیغام سناؤ ہم لوگ اس پر عمل کرنے کو تیار ہیں۔" (باقی صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ کیجئے)

بقیہ معصوم گداگر!

دیکھا کہ ایک معصوم بچہ جس کی عمر بمشکل دس سال ہوگی نہایت خستہ حالت میں کھڑا ہے۔ پھٹے ہوئے کپڑے کی ایک جھولی کندھے پر پڑی تھی۔ جسم پر ایک بہت ہی میلا اور بوسیدہ قمیص پہنے ہوئے تھا۔ جس کے کف کتے کے کان کی طرح لٹک رہے تھے۔ گلا پورا کھلا تھا۔ دامن چونکہ بیچ سے بالکل جدا ہوگیا تھا اس لئے گرہ باندھ کر دونوں پلے ملا دیئے تھے۔ اسی طرح ایک پھٹی پرانی دھوتی باندھے تھا۔ اس کا خوبصورت جسم میل اور گرد و غبار سے اٹا پڑا تھا۔ سر کے بال اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ ریچھ کی شباہت کا شبہ ہوتا تھا۔ مجھے اس معصوم گداگر کی حالت دیکھکر رحم آگیا۔ میں نے اسے اندر بلایا' نام پوچھا۔ "بھیّا تمہارا نام کیا ہے؟"

"کونسا نام بتاؤں؟"

"کیا تمہارے کئی ایک نام ہیں؟"

"ہاں نا بائی۔ میرے تین نام ہیں"

"اچھا تینوں نام بتاؤ؟"

"میرے کو باپ عجمت الی (عظمت علی) بولتا تھا۔ ماں بابو کہہ کر پکارتی تھی۔ اور سب لوگ بچو بولتے ہیں۔"

"تمہارے باپ ہیں؟" میں نے تشفی آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"نہیں۔ ماں باپ نہیں ہیں" اس نے گردن نیچی کرکے کہا۔

"کیا تمہارے ماں باپ دونوں مرگئے؟"

"نہیں — کھالی (صرف) باپ مرگیا ہے۔"

"اور ماں؟"

وہ چپ ہوگیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد بولا — "وہ میرے کو چھوڑکر کدھر چلی گئی۔"

"تو تم ابھی کس کے پاس رہتے ہو۔؟"

"وہ میرا دوست ہے نا الّو۔ ہم سب لڑکے اس کے پاس رہتے ہے۔"

"تم کھانا کھاؤ گے؟"

"نا — مائی جی۔ میرا پیٹ بھر یلا ہے۔ پن عید کو کپڑا نئی ہے۔"

"تم بھیک مانگ کر پیسہ کیا کرتے ہو کپڑے کیوں نہیں بنواتے؟"

"وہ ابو بھائی سب پیسے لے لیتا ہے۔ اور بولتا ہے کپڑا کدھر سے مانگ لاؤ"

"تم نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟"

"میرا دل تو ہے۔ پن ابو بھائی بولتا ہے بھیک اچھی ہے۔ اچھا اچھا کھانے کو ملتا ہے۔ پن پھکٹ کا پیسہ ملتا ہے۔ اور کسی کا تابا (تابع) نہیں۔ نوکری میں بوت منت (بہت محنت) ہے اور دوسرے کی تابیداری (تابعداری) ہے۔"

میں نے اس معصوم عظمت علی کو جو یو۔پی۔ کے ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ مگر والدین کی غلط کاریوں اور برے ماحول میں رہنے کی وجہ سے اپنی زبان اور بالیدگی کی زندگی کو گداگری جیسے سبک اور رسوا کن پیشہ کی نذر کر چکا تھا۔ بہت سمجھایا۔ وہ ابو بھائی سے جو اس جیسے معصوم گداگروں کا سردار یا سرغنہ تھا۔ بہت ڈرتا تھا۔ اور بار بار کہتا "نا بائی جی ابو پکڑ کر مارے گا" مگر میں نے اسے ہر بار تسلی دی۔ بہت کچھ سمجھانے بجھانے کے بعد وہ نوکری کرنے پر رضامند ہوگیا۔ میں نے فوراً حجام کو بلوا کر اس کے بال کٹوائے۔ ملازمہ کو حکم دیا کہ اس کے نہانے کے لئے ضروری سامان اور فلاں کپڑوں کا جوڑا جو نوکر کے لئے تیار ہوا ہے غسل خانے میں رکھدو حکم کی دیر تھی۔ سب کام ٹھیک ہوگیا۔

میں نے غور کیا کہ یہ خاندانی بچہ ہے۔ اس کا مستقبل بنانا میرا فرض ہے۔ میں نے اسے ایک ایسی جگہ ملازم رکھا دیا جہاں وہ تنخواہ کے علاوہ تعلیم و تربیت بھی پا رہا ہے۔ اور صاحب خانہ اُسے اولاد کی طرح رکھتے ہیں۔

عظمت علی گاہے گاہے میرے یہاں آتا ہے۔ وہ خوش ہے اور جب وہ اپنی گداگری کی زندگی کے قصے سناتا ہے تو رنج و افسوس کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آجاتی ہے۔

(ختم شد!)

بقیہ لال کنور!

کیوں ایسا کیا؟"

پادشاہ تخت کی سیڑھیوں سے سر جھکائے اترے اور اپنے آپ کو... آصف الدولہ کے سپرد کر دیا۔

یہ کہہ کر عزیز کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ چونکہ وہ بھی جہاندار شاہ کی اولاد تھا۔ یہ کہانی سنتے ہمیں شام ہوچلی تھی۔ مالک ریسٹورنٹ نے ریڈیو کھولا۔ کوئی گا رہا تھا:۔

آج پھر دیوار گلشن پر گری ہیں بجلیاں
ہم قفس نے آشیاں کی یاد پھر آئی تجھے

(تمام شد!)

ایک تھی ناری۔ ایک تھا نر۔ ناری لائی جوانی کا نشہ۔ اور نر لایا محبت کا امرت۔ دونوں نے ساتھ مل کر زندگی کی پیالیوں میں امرت گھولا اور پی گئے۔ لیکن ایک دوسری ناری کی چشم عتاب اپنا کام کر گئی . . . اور ان دونوں کی زندگی کے امرت میں زہر گھول دیا
وینس پکچرس کا شاہکار
ڈائرکٹر کنجال
افسانہ راگنیکر
میوزک بالی
آرہا ہے
کرتی
ان ستاروں کا جھرمٹ:-
للیتا پوار۔ پی جیراج۔ جگدیش سیٹھی۔ نالینی
سوشل کمار۔ ارمیلا۔ اوما کا دیوا سکر اور غلام حسین وغیرہ۔
وینس پکچرس کی بہترین فلم
وینس پکچرس۔ یوسف بلڈنگ۔ فلورا فاؤنٹین
مہاتما گاندھی روڈ۔ فورٹ بمبئی
موہن پکچرس بصد مسرت پیش کرتی ہے:-
عیدالفطر کی مبارک تقریب کے لئے
۱۸ اکتوبر سے شروع ہے
اسلامی کلچر سے متصف داستان
مسلم کا لال
ڈائرکٹر اے۔ ایم۔ خان
فلمی ستارے:- کلیانی۔ امینہ اور بنجامن وغیرہ۔
ڈائمنڈ ٹاکیز
عیدالفطر کا جدید پروگرام
عیدالفطر کا جدید پروگرام
دیوالی اٹریکشن
۱۱ اکتوبر سے شروع
سنت چوکھا میلہ
مراٹھی زبان میں
ڈائرکٹر:- ڈی کے کالے
نیو ویسٹ اینڈ میں (لیمنگٹن روڈ)
عنقریب پیش کیا جائے گا
بلبل بغداد
ڈائرکٹر:- کے امرناتھ
فلمی ستارے:- اندورانی۔ یعقوب۔ جینت اور ڈبلیو ایم خان وغیرہ
۱۸ اکتوبر سے دہلی، سہارنپور اور بنارس میں دکھایا جا رہا ہے !!!
تیار ہو رہی ہے:- سرور کی سندری
بکنگ کے لئے لکھئے
دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک شمار ہونیوالی ہندوستان کے آرٹ کا کمال پیش کرنیوالی سنگ مرمر پر کندہ کیا ہوا محبت کا گیت
آگرہ کی عظیم الشان عمارت اور اسکے بنانیوالے کی زندگی
کا تاریخی شاہکار
تاج محل
ڈائرکٹر نانو بھائی وکیل
فلمی ستارے:- کمار۔ سوجنی۔ اندورانی۔ مبارک اور رام مراٹھے۔
رمنک لال موہن لال اینڈ کمپنی ——— کھیت واڑی۔ مین روڈ بمبئی نمبر ۴

صاحبقران تیمور یا تمرلنگ ابن امیر طراغان کا دربار اور حمیدہ بانو بیگم

حمیدہ بانو بیگم جن کا اصلی نام امتہ الحبیب تھا، سلطان یزدانی جنرل افواج بایزید کی صاحبزادی اور صاحبقران تیمور کی چوتھی بیگم تھیں۔ آپ کی فہم وذکاء، علمی استطاعت وقابلیت اور بلند حوصلگی وعلو ہمتی کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف تیمور جیسا تندخو اور جابر شہنشاہ بہ نسبت دیگر بیگمات کے آپ سے مہربانی ومحبت سے پیش آتا تھا۔ بلکہ جس وقت بایزید اور صاحبقران تیمور کی افواج میں جبل الطیر کے وسیع اور خوفناک میدان میں جنگ ہوئی تو آپ زرہ بکتر پہنے ہوئے تیموری فوج پر مسلسل تیر برسا رہی تھیں، لیکن جب منجملہ دیگر سرداروں اور لشکریوں کے آپ کو بھی بحیثیت ایک قیدی کے امیر تیمور کے سامنے پیش کیا گیا، تو آپ نے تیمور کے حکم گردن زدنی پر تیوری چڑھاتے ہوئے انتہائی دلیری کے ساتھ باآواز بلند کہا۔ "عرض دارم! اس للکار پر تمام اہل دربار اور صاحبقران تیمور ورطۂ حیرت میں مستغرق ہوئے۔ اور کچھ دیر خاموشی کے بعد متحیر شہنشاہ نے اجازت دی کہ جو" کچھ تو کہے گا اسے مابدولت بخوشی سنیں گے۔"

امتہ الحبیب یا حمیدہ بانو بیگم اپنی اسی مردانہ ہیئت میں گویا ہوئیں کہ آپ نے بایزید پر چڑھائی کرکے نہ صرف ستر ہزار بیگناہ ترکوں کو سرنگ کے ذریعہ اڑا کر اپنے سر عذاب لے لیا ہے بلکہ اسلام کی قوت کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دی ہے۔" یہ کہہ کر حمیدہ بانو بیگم نے اپنی زرہ بکتر اتار کر پھینک دی اور للکار کر کہا کہ اے امیر میں خاتون ہوں مجھ سے ہی تو اندازہ لگا سکتا ہے کہ جن کی عورتیں ایسی بہادر ہیں ان کے مرد کیا کچھ نہ ہوں گے، امیر تیمور جو اس نڈر اور بہادر خاتون کی تقریر پر عش عش کر رہے تھے اُسکی نسوانی رعنائیوں پہ دیکھ کر فریفتہ ہوگئے اور انتہائی لجاجت وترمی سے جواب دیا کہ میں نے تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو معاف کردیا بعد ازاں امتہ الحبیب کے والد سلطان یزدانی کو نکاح کا پیغام بھیجا جسے سلطان یزدانی نے حمیدہ بانو بیگم کی مرضی پاکر منظور کر لیا اور امیر تیمور کی زوجیت میں دیدیا۔ نکاح کے بعد حمیدہ بانو بیگم کی وفاداری وشوہر پرستی کا یہ عالم تھا کہ آپ ہر خوفناک موقع پر زرہ بکتر پہنے ہوئے امیر تیمور کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ آپ اصل میں آتش پرست تھیں لیکن اپنے والد سلطان یزدانی کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ آپ ترکی، عربی، اور فارسی زبانوں کے علاوہ انتہائی فصاحت وسلاست سے چینی اور زرتشتی زبان میں بھی گفتگو کیا کرتی تھیں۔ اور موسیقی سے بھی کافی دلچسپی تھی۔
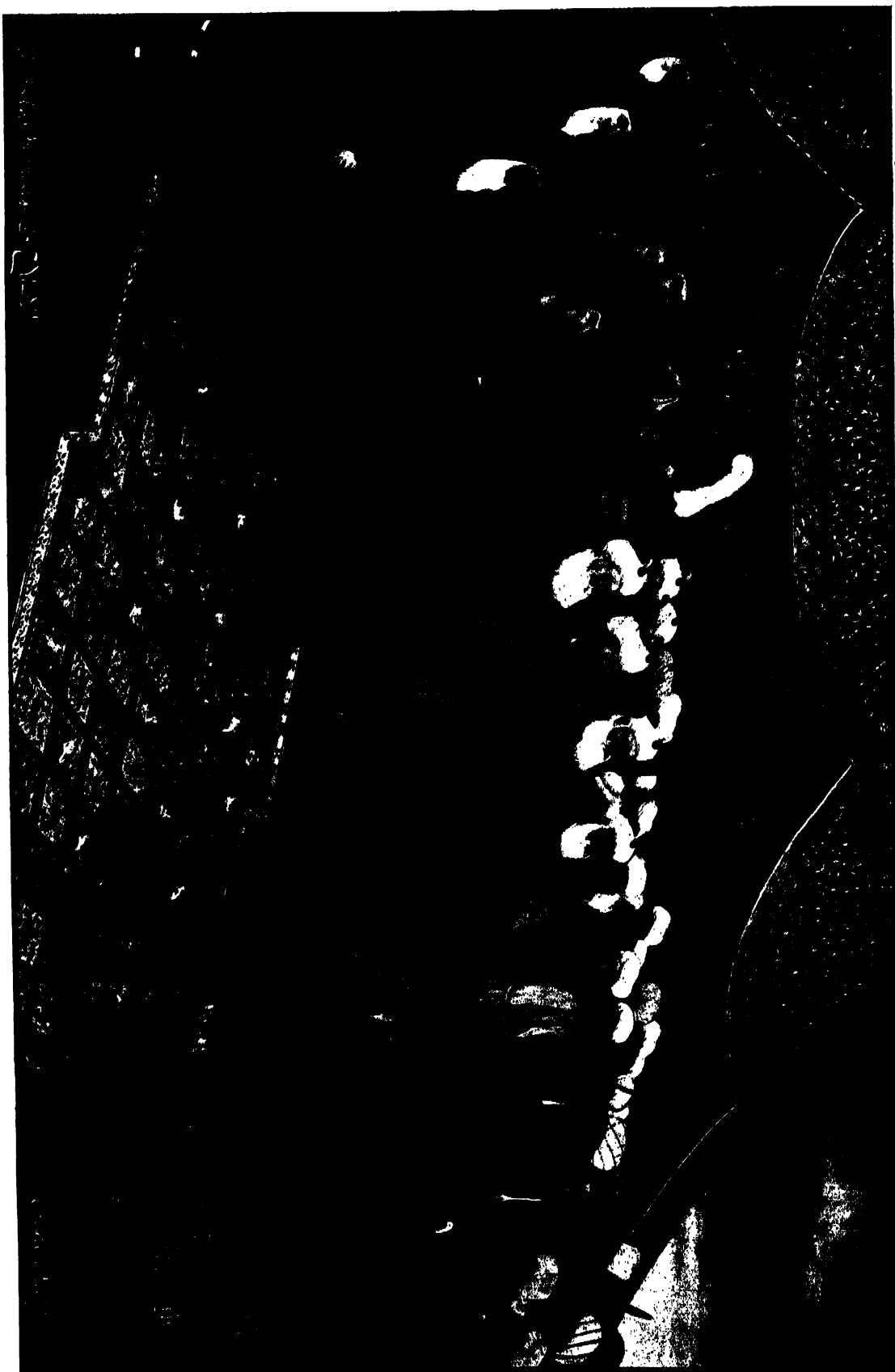
ISMAILI P. PRESS BOMBAY, 0

بقیہ سوگوار جوانی !

میں کیا کمی ہوسکتی ہے۔ یہ تمہاری غلطی نہیں اگر قصوروار ٹھہرانا ہی ہے تو اسکو قدرت کی لغزش کہا جاسکتا ہے مگر قدرت سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ میں ان عام لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ نادرہ میں سماج کے ان طاغوتی قوانین کو پارہ پارہ کر دینا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم میری ہمنوا ہوجاؤ۔ رہا یہ سوال کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں تو اس کی مجھے مطلق پرواہ نہیں کیونکہ میں تمہیں چمن کی ایسی کلی سمجھتا ہوں جسے مالی نے چھوا تو کیا دیکھا تک نہیں۔ ایسی خوشرنگ اور اچھوتی کلی کو پاکر نہ میں صرف روحی طور سے طمانیت حاصل کرسکوں گا بلکہ میں اپنا سر فخر کے ساتھ یہ کہہ کر بلند کرسکوں گا۔ کہ مجھے وہ بیش بہا لال مل گیا جسے دنیا نے پتھر سمجھکر پھینکدیا تھا۔ میں نے وہ دولت حاصل کرلی جس پر لوگ قدرت رکھتے ہوئے بھی اسے نہ پاسکے

نادرہ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

تم رو رہی ہو نادرہ، اگر میری کسی بات سے تمہیں صدمہ پہونچا ہے تو بخدا میں تم سے خلوص دل سے معافی مانگتا ہوں۔

نہیں نہیں نسیم صاحب۔ میں یہ سوچکر رو رہی ہوں کہ آپ ایسی لڑکی سے گفتگو کر رہے ہیں جس کی موت وزیست کا سوال قلم کی ایک جنبش میں مضمر ہے۔ ایسا سنہری موقعہ مجھے عمر بھر میں اب ملا ہے مگر میں نہیں کہہ سکتی کہ میں اس سے بہرہ ور بھی ہوسکوں گی یا نہیں۔ اسلئے کہ اگر فیصلہ آپکی امید کے خلاف ہوا تو ناممکن!

نادرہ ناممکن! اسقدر وزنی دلائل کے بعد تمہارا سزا پانا ناممکن ہے۔ میں تمکو مظلوم ثابت کرنے میں کامیاب ہوچکا ہوں۔ پھر بھی تمکو اگر کوئی اندیشہ ہے تو یقین رکھو کہ میرا ایک لفظ جمیل کے فیصلہ کو یکسر بدل دے گا۔ وہ میرا دوست ہے۔ بھائی دنیا میں سب کچھ کھوکر میں نے اسکو حاصل کیا۔ میرے لئے وہ دولت، عزت، شہرت، حکومت سبکو قربان کرسکتا ہے۔ یہ تو پھر معمولی بات ہے۔ آہ! اسکو یہ جانکر کسقدر خوشی ہوگی کہ تم میری زندگی کی نصف حصہ دار بننے پر آمادہ ہوگئی ہو۔ نادرہ بولو اب بھی کیا تمکو یقین ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے فیصلہ تمہارے خلاف ہوگا

بولو نادرہ کیا تم میری ہو؟

اس نے اپنی سرمگیں آنکھوں سے چڑیا کے ایک جوڑے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا

جب دنیا میں ہر چیز سے میں ناامید ہوچکی ہوں۔ اس وقت آپ میری زندگی میں ایک شعاع امید بنکر داخل ہورہے ہیں۔ اگر میں اس خوفناک تاریکی میں اس روشنی سے منزل مقصود پر گامزن ہوسکوں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔

نسیم اور نادرہ پر بط مسرت سے نکلے ہوئے نغموں کی دنیا میں کھوگئے۔ دو لبوں کے اتصال نے عشق کی فتح اور حسن کی شکست کا اعلان کردیا۔

جمیل نے نادرہ کو جس روز سے دیکھا تھا اس کے دل میں اس روز سے کچھ چنگاریوں نے بھڑکنا شروع کیا۔ نسیم کے گھر پر نادرہ کی مسلسل ملاقاتوں نے ان چنگاریوں کو اور بھی ہوا دیدی تھی۔ وہ نادرہ کی خاموش پرستش کر رہا تھا۔ یہ پہلا

موقعہ تھا کہ جمیل نے کسی لڑکی کو اس پاکیزہ جذبہ کے ماتحت دیکھا۔ نادرہ اس پر چھائی ہوئی تھی۔ اسکا ارادہ تھا کہ اس کی برہت کے بعد وہ نسیم کے ذریعہ سے اسکو جذبۂ محبت پیش کریگا۔ اور اسکو خود اس سے ہی مانگے گا۔

صبح کے کھانے کے دوران میں نسیم نے جمیل سے سب کچھ کہدیا وہ یہ سنکر چپ ہوگیا۔ ایک مکمل سکوت تھا۔ نسیم کے کہنے کے بعد۔ مگر نسیم اس اضطرابی کیفیت کو نہ سمجھ سکا۔ جمیل رات بھر کروٹیں بدلتا رہا خواب میں بھی اسکو نسیم اور نادرہ ہی نظر آتے رہے۔

جمیل کے مسلسل سکوت اور غمگین حرکات وسکنات سے آخر نسیم بھانپ ہی گیا وہ اس نے اسلئے اقبال محبت کرا ہی لیا۔

ایکطرف فرض دوستی اور دوسری طرف تھے۔ محبت کے حسین لمحات رنگین، رات بھر کے غور کرنے کے بعد نسیم نے جمیل کے حق میں فیصلہ کردیا اور نادرہ کو اپنی اس تجویز سے مطلع کیا۔ اس نے اسکی سختی سے مخالفت کی۔ نادرہ کا انکار نسیم کے لئے سوہان روح بن گیا۔ بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس کی موجودگی میں نادرہ ہرگز اسبات پر آمادہ نہیں ہوگی۔

دن پہ دن گذرتے چلے گئے مگر نادرہ کا انکار برابر جاری تھا۔ آخر ایک صبح نسیم کا بستر خالی پایا گیا صرف اس کی یادگار میں اسکا ایک تحریر کردہ پرچہ ملا۔

اگر واقعی تمکو مجھ سے محبت ہے تو میری محبت کا واسطہ جمیل کا دل نہ توڑو ۔۔۔۔ نے جمیل کو سب کچھ کھونے کے بعد حاصل کیا تھا۔ آج کیا تم میرے جمیل کے ۔۔۔۔ پارہ کرنا چاہتی ہو۔ میں اسپر سے اپنے کو اور سب کو قربان کرسکتا ہوں مجھ ۔۔۔۔ نے کی ناتمام سعی نہ کرنا کیونکہ یہ لاحاصل ہوگی۔ اس دنیا میں تو نہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ البتہ اس دنیا میں اس شرط پر میں تم سے ضرور ملوں گا کہ اگر تم میرے جمیل کی ہوگئیں ورنہ میں وہاں بھی تم سے خفا رہوں گا۔ تمھاری یاد ایک بہن کی حیثیت سے میرے ساتھ رہے گی۔ مجھے اعتماد ہے کہ تم اپنے بھائی کی اس آرزو ۔۔۔کمیل میں مدد دوگی۔ خدا کرے تم اور جمیل بھائی ہمیشہ مسرتوں سے ہمکنار رہیں تم دونوں کیلئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ بھائی کو گاہے گاہے یاد کرلیا کرنا۔

ہمیشہ تمھارا بھائی نسیم

جمیل خط پڑھکر اسقدر رویا کہ اسکی ہچکیاں بندھ گئیں۔ نادرہ اس صدمہ سے بیہوش ہوگئی ــــــــ ہوش آنے پر نادرہ نے صرف اتنا کہا جمیل صاحب

میں آپکی ہوں اگر آپ مجھے حاصل کرسکیں تو۔

جمیل مسرور بھی تھا اور غمگین بھی۔ جمیل نے نادرہ کے مقدمہ کی پیروی کیلئے ایک بیرسٹر کی خدمات حاصل کیں۔

کورٹ کا ہال اخبارات کے نمایندوں اور عوام سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ایک تو قتل کا مقدمہ دوسرے ملزمہ ایک حسین عورت۔ اکثر لوگ تو صرف حسین مجرمہ کے حسن جانسوز کی زیارت کرنے آتے تھے۔ سوائے ارکان پولیس اور سرکاری وکیل کے سب حسین مجرمہ کے ہمدرد تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تھا تو وہ زبردستی اسکو عدالت سے لے جاتے۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی ملزمہ کیطرف سے صفائی پیش کرنا تھی صفائی کے گواہ کو بلوایا ہی گیا تھا کہ یکایک نادرہ بولی۔

"میں صفائی پیش نہیں کرنا چاہتی۔ میں عدالت کو زیادہ دیر تک غلط فہمی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتی ہوں۔ مسٹر نسیم نے میرے ضمیر کے خلاف مجھ سے غلط بیان دلوایا تھا۔ مگر میرا ضمیر رہ رہ کر مجھے ملامت کرتا ہے اس لئے میں عدالت کو یقین دلاتی ہوں کہ میں نے ملزم کو قصداً قتل کیا اور اسکی وجہ یہ تھی کہ میں ملزم کی داشتہ تھی۔ اسی دوران میں میری دوستی ایک اور نوجوان سے ہوگئی۔ واردات قتل کے روز میں اور وہ نوجوان کیف پرور دنیا میں تھے کہ مقتول آگیا وہ نوجوان اسکو دیکھکر بھاگ گیا۔ مقتول کو اسپر بیحد غصہ آیا اور اس نے مجھکو برا بھلا کہا

جسکو میں برداشت نہ کر سکی اور میں نے اسکو جوابات دینا شروع کئے وہ مجھے مارنے بڑھا۔ پاس ہی لوھے کا کرچھا پڑا ہوا تھا میں نے اٹھا کر اس سے مقتول کو مارنا شروع کیا اور اسوقت تک مارتی رہی جب تک کہ مقتول کا بھیجا نہ پھٹ گیا جیسا کہ ڈاکٹری رپورٹ سے ثابت ہے۔ اس بیان کے بعد میں عدالت سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ بلد از جلد میرے جرم کی پوری پوری سزا دے تاکہ میں اس گناہ عظیم سے سبکدوش ہو سکوں اور مجھے اطمینان قلب حاصل ہو۔۔۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ جمیل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سرکاری وکیل اور پولیس کے افسران مسکرائے، اخبارات کے نمایندوں نے جلدی جلدی شارٹ ہینڈ میں ملزمہ کا بیان قلمبند کیا۔

جمیل نے موقعہ کی نزاکت کا احساس کرکے اجلاس چند منٹ کیلئے برخاست کر دیا ۔۔۔ وہ مجسٹریٹ تھا۔ انصاف کی کرسی پر متمکن تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عقل کچھ کام نہیں کر رہی تھی۔

نادرہ نے محبت کے دیوتا کے اوپر بہت بڑی بھینٹ چڑھائی تھی ۔۔۔

نادرہ اب جمیل کی نہیں ہو سکتی۔ قانون نادرہ کو اس سے چھین رہا تھا وہ مجبور تھا۔ اس کے ایوان تصور کی حسین ملکہ نے اپنے نازک و حنائی ہاتھوں سے خود اس قیمتی ڈگمگاتے ہوئے ایوان کو ڈھا دیا۔ دنیا اس کے بغیر بے کیف نظر آنے لگی۔ زندگی میں کوئی کیف نہ رہا۔ دوست گیا اور آخر ملکوتی حسن کی خداوندہ بھی اس سے چھین گئی تھی۔ مگر سوائے صبر کے وہ کر بھی کیا سکتا تھا مجسٹریٹ کی حیثیت سے اس نے خود اپنے دل کی رانی کو قانون کے جنگل میں دیدیا۔ نادرہ سشن سپرد ہو گئی۔ جمیل نے ایک ماہ کی چھٹی لے لی ۔۔۔ عدالت سشن نے اسکو حبس دوام کی سزا دی۔ جمیل نے اس سے مل کر اسکو اپیل کرنے کا مشورہ دیا مگر نادرہ نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ نسیم کے بغیر اب اس زندگی میں میرے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ اب خواہ اس سوگوار جوانی کو جیل کی مضبوط اور آہنی سلاخوں کے اندر رہکر گذارا جائے یا خواہ کھلے اور پر فضا میدانوں میں یا کشمیر کی وادیوں میں میرے لئے سب برابر ہیں۔ اس لئے اس کی فضول کی نہ مجھے ضرورت ہے اور نہ آپ ایسی کوشش کیجئے جس سے آپکو بعد میں شرمندگی ہو ۔۔۔ جمیل آنسو بہاتا چلا گیا۔

بانکی پور کے زنانہ جیل میں اب بھی ایک بڑھیا اکثر راتوں کو سوتے میں یہ کہہ کر چونک پڑتی ہے۔

"آ گئے نسیم! بہت انتظار دکھایا ۔۔۔ خفا کیوں ہو۔ دور کیوں کھڑے ہو گئے۔ آ جاؤ میرے قریب آ جاؤ!"

کشمیر میں ڈل کے قریب جو باغ ہے اس کے مغربی سمت سرو کے درخت کے پاس جو قبر ہے اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ وہاں سے نادرہ کو پکارنے کی انھوں نے آوازیں سنی ہیں۔

سر جمیل احمد آئی۔ سی۔ ایس چیف جسٹس کے عہدہ سے حال ہی میں نیکنامی کے بعد ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ ان کے بڑے لڑکے کفیل نے اسی سال آئی۔ سی۔ ایس کی ٹریننگ ختم کرکے واشنگٹن میں اپنے عہدہ کا چارج لے لیا!

(المعز اد)

ایک شعر:- نگاہ ناز تیری شوخیوں سے بدگمانی ہے پتہ یہ چنگاری میرے سینہ میں تو نے تو نہیں رکھدی

ہر چہار طرف عید الفطر کی چہل پہل تھی۔ چھوٹے۔ بڑے۔ بوڑھے اور جوان سب عید کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بازاروں میں جدھر دیکھئے مسلمانوں کے ہجوم سے میلا لگا ہوا تھا۔ غرض تمام شہر پر عید اور خوشی کے سہانے بادل چھائے ہوئے تھے۔

حامد کے ابا نے بھی اپنے بچوں کی فرمائشات کی فہرست بنائی۔ ایک بار اس کو بغور دیکھا اور مسکراتے ہوئے اپنے دونوں لڑکوں اور لڑکی کے چہرہ کا بغور جائزہ لیا۔ جو مسرت سے نوشگفتہ گلاب کی طرح تر و تازہ اور پر از بہار تھے۔ سچ یہ ہے کہ بچوں کے بغیر بوڑھوں یا جوانوں کو نہ عید کا لطف آتا ہے اور نہ کسی تقریب میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ حامد کے ابا کو ان باتوں کا پورا پورا خیال تھا۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ میں آج اپنے تینوں بچوں کو خوش کرکے رہوں گا!

شوفر سے کہا۔ موٹر تیار کرو۔ اس نے فوراً ہی حکم کی تعمیل کی اور حامد کے ابا اپنے تینوں بچوں کو لئے بازار کی طرف چل دئے اس وقت صبح کے کوئی دس بجے کا ٹائم تھا۔ عید میں ابھی چونکہ صرف سات آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اور ہر شخص یہی خیال کر رہا تھا کہ اس وقت تک عید کی تیاریوں میں جو دیری ہوئی سو ہوئی۔ اب مزید تاخیر کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ لوگ بالعموم یہی خیال کرتے ہیں کہ بڑے بڑے تہواروں کے موقعہ پر جس قدر جلد ممکن ہو بازار سے کپڑے لتے۔ جوتے۔ ٹوپی اور دیگر تمام ضروری چیزیں خرید لینے سے ایک تو مال بکفایت ملتا ہے اور ساتھ ہی اچھا بھی ۔۔۔ عید برات کے موقعوں پر اس قسم کے معاملات میں تاخیر کرنے سے اکثر حسب خواہش چیزیں نہیں مل سکتیں۔ ان ہی وجوہات سے گذشتہ ایک ہفتہ کے مقابلہ میں آج بازار کی چہل پہل اپنے عروج و کمال کو پہونچ چکی تھی۔ حامد کے ابا بھی شہر کے سب سے بڑے بازار میں اپنے بچوں کو لئے ہوئے پہونچے اور فہرست پر پھر ایک بار غور کیا! ۔۔۔ ایک ایک چیز خرید لی گئی تھی۔ افطار کے بعد دسترخوان پر حامد کے ابا معہ اپنے اہل و عیال کے کھانے میں مصروف تھے۔ آج بچے کھانے کے مقابلے میں باتیں زیادہ کر رہے تھے حامد کے چھوٹے بھائی اور بہن نے ہنس ہنس کر اپنی چیزوں کی تعریف کرنی شروع کی لیکن حامد دسترخوان کے ایک طرف خاموش سر جھکائے بیٹھا آہستہ آہستہ کھانے میں مصروف تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو کسی چیز سے اطمینان نہیں ہوا ہے۔ وہ بظاہر کھا تو رہا تھا لیکن اس کا دل کسی اور طرف گھوم رہا تھا اور وقتاً فوقتاً اس کی یاس و حسرت سے بھری ہوئی نظریں سامنے کی تصویر پر جا پڑتی تھیں۔ وہ فوراً ہی نیچے دیکھنے لگتا۔ حامد کے ابا نے اس حالت کو بغور دیکھا انھوں نے اندازہ کیا کہ وہ کچھ اور چاہتا ہے لیکن ادب و احترام سے اس کی زبان نہیں کھلتی۔ انھوں نے سامنے کی تصویر پر نظر ڈالی۔ یہ پٹیل برادرس کا کلینڈر تھا۔ بچے بڑے اچھی اچھی اور خوبصورت ترکی ٹوپیاں پہنے دکھائی دے رہے تھے۔ حامد کا راز معلوم ہو گیا وہ پٹیل برادرس کی دوکان پر پہونچے۔ حامد کی مسرت و تعجب کی کوئی حد نہیں رہی حامد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

بقیہ باغی عورت

ہاں سنو! اس کی آواز جوش میں کانپنے لگی۔۔۔ یہ میرا پیغام نہیں وقت کا پیغام نہیں نہیں خدا کا پیغام ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ تم زیادہ عرصہ تک ۔۔۔۔ تم شدید کا فکار بنے رہو۔ تم ان لوگوں کے غلام بنے رہو۔ جو تم میں سے نہیں ہیں تم ان کے محکوم ہو۔ جنہوں نے تمہارے آباؤ اجداد کے خون سے ہولی کھیلی ہے۔ اور ان کی محنت۔ دمشقت کی کمائی غصب کرکے آج تم پر حکومت کر رہے ہیں۔۔۔ خدا نہیں چاہتا کہ وہ زیادہ عرصہ تک تم کو اپنے حق سے محروم رکھے اور تم اپنی دولت و ثروت کھو کر مظلومانہ زندگی بسر کرو اس لئے سنو!۔۔۔۔ اور کان لگا کر سنو!۔۔۔ خدا کا حکم ہے کہ تم اس طوق غلامی کے ٹکڑے کر دو۔ جو غیر ملکی مہاجرین نے زبردستی تمہارے گلے میں ڈالدیا ہے تم ان سے انتقام لو اپنے آباؤ اجداد کا۔۔۔ جن کی مظلوم روحیں صرف اس لئے بیچین ہیں کہ تم کب اپنا انتقام لوگے۔۔۔ خدا کا یہ پیغام ہے کہ تم بیدار ہو جاؤ اور اپنی دولت و عزت جس کو تم کھو چکے ہو۔ واپس لیکر انسانوں کی سی زندگی بسر کرو۔ آخر تم کبتک جانوروں کی سی زندگی بسر کروگے ۔۔۔۔ تمہاری ماں؟۔۔۔ تمہاری اس حالت کو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ تم سے قربانی کا مطالبہ کر رہی ہے۔۔۔۔۔ ماں اپنا حق مانگ رہی ہے کیا تم ماں کی بات ٹھکرا دوگے؟"

تمام لوگ جوش میں آکر کھڑے ہو گئے۔ اور دیوانہ وار چلائے۔

"دیوی!۔۔۔۔ دیوی!!۔۔۔ اب ہم میں سننے کی تاب نہیں۔۔۔ ہم قسم کھاتے ہیں اپنے دھرم کی۔ کہ یا تو حاکمانہ زندگی بسر کرینگے۔ یا اپنی آزادی پر قربان ہو جائیں گے!!"

(۴)

بہت جلد آسام کے قرب و جوار میں اس کی تحریک پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق اس کی آواز پر لبیک کہنے لگے اپنے مقصد میں خلاف توقع اس قدر جلد کامیابی سے وہ بہت متاثر ہوئی اور اس نے حریت پسند عوام کا ایک بڑا اگروہ جمع کر لیا اور یہ اعلان کیا کہ

اگر حکومت نے جلد از جلد ہمارے حقوق تسلیم نہ کئے تو ہماری طرف سے سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی اس کی اس آواز نے حکومت کے کان کھڑے کر دیئے اور حکومت نے محسوس کیا کہ اگر جلد از جلد اس خطرہ کا تدارک نہ کیا گیا تو آسام بھی اسی آگ کی نذر ہو جائے گا۔ جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے چنانچہ بہت جلد حکومت نے پھلی کی اور ان لوگوں کے لئے جو اس تحریک میں شریک تھے سخت سزاؤں کے احکامات نافذ کر دیئے گئے۔ جن لوگوں پر شبہ ہوا ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔۔۔ صرف یہیں تک بس نہیں کیا گیا۔ بلکہ جس گاؤں یا قصبہ میں حریت پسندوں کے مکانات تھے ان کو لوٹ لیا گیا۔ اور جگہ جگہ آگ لگا دی گئی۔ جس میں کئی لوگ جھلس کر مر گئے اور سیکڑوں خاندان برباد ہو کر در در بھیک مانگنے پر مجبور ہوئے۔ مگر ان کے جوش و استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ اور زیادہ سرگرمی سے حکومت کے اس جور و استبداد سے تنگ آکر مجبور ہو گئی کہ حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دے اسنے بالکل آخری مرتبہ حکومت کو نوٹس دیا کہ۔

وہ ایک ہفتہ میں اپناظالمانہ رویہ بدل دے ورنہ اس چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا جائے گا ـــــــ اس کا خیال تھا کہ بیرون آسام میں ہر جگہ حکومت کو شکست ہو رہی ہے۔ مگر اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ حکومت نے اپنا ظالمانہ رویہ عوام کے حق میں اور زیادہ سخت کر دیا ہے مگر اس نے اپنے نوٹس کے موافق ایک ہفتہ تک صبر کیا اور حکومت کے تمام جائز و ناجائز قوانین کی پوری پابندی کی۔ ۔ ۔ لیکن ایک ہفتہ کے بعد صبح جبکہ سورج یہ المناک منظر دیکھنے کیلئے نکلا بھی نہیں تھا کہ ۔۔ ۲۰ کے قریب اشخاص نے حکومت کے قائم طاغوتی قوانین کی دھجیاں فضائے آسمان میں بکھیر دیں اور نہایت خوشی سے بیرحم حکومت کی دعوت منظور کر لی ـــــــ شام تک ایسے لوگوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب پہونچ گئی جنہوں نے حکومت کے ہر اس قانون کی خلاف ورزی کی جو ان کی آزادی کے راستہ میں سدراہ تھا۔ اس دن سے آسام بھی انھیں شعلوں کی نذر ہو گیا جو تمام ملک میں بھڑک رہے تھے دوسرے روز صبح لوگوں نے شہر کی دیواروں پر بڑے بڑے سفید پوسٹر چسپاں دیکھے جو حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے۔

"اگر وہ ایک سال تک کسی بھی مجمع میں تقریر ۔ ۔ ۔ یا حکومت کے خلاف کوئی سازش کرے گی تو اس کو مروجہ قانون کے مطابق گرفتار کر لیا جائے گا"

اس اعلان کے بعد اس کے تمام ساتھیوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں ۔ ۔ ۔ اس نے بھی حکومت کے اس اعلان کے زیادہ خاموش رہنا اپنی بزدلی سمجھی۔ چنانچہ

دوسرے ہی روز اس نے ایک بیان شایع کیا اور اس کے آخر میں لکھا کہ:۔

"حکومت ہم کو ڈرا دھمکا کر ہمارا حق ہم سے نہیں چھین سکتی اور وہ ۱۲ ستمبر کے ہونیوالے جلسہ میں ضرور تقریر کرے گی"

شہر میں اس کے اس بیان سے ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور لوگ بے چینی سے اس دن کا انتظار کی گھڑیاں ختم نہ ہوئیں حکومت کو اس کی ذات سے خطرہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ زیادہ دنوں تک آزادی کی فضا میں سانس لے۔ چنانچہ جس دن اس نے قانون کی خلاف ورزی کا اعلان کیا اس کے تیسرے روز رات کو جب کہ وہ اپنا پروگرام بنا رہی تھی اس کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ساتھیوں کو اس کی گرفتاری کا علم اس وقت ہوا جبکہ وہ شہر سے دو سو میل دور پہونچ چکی تھی۔

یہ بہادر بہن کون تھی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ رانی گائیڈلو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو آج بھی آسام کی کسی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں اپنی جوانی کے دن گذار رہی ہے ہندوستان حالانکہ اپنی اس بہادر بیٹی کو بھول چکا ہے لیکن اس کے ہموطن اب بھی اس کو بڑے فخر سے یاد کرتے ہیں ۔ ۔ شاید انھیں معلوم نہیں کہ گڈالو حکومت کی نظروں میں ایک باغی عورت ہے ۔ ۔ ۔ لیکن ایسی باغی عورت میں پر قوم کو ناز ہے اور طبقہ صنف نازک بھی اس سرفروش اور خودار عورت پر ہمیشہ فخر کرے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس نے ایک حکومت کو مقابلہ کا چیلنج دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

بچہ انتظار کرنے لگے جس دن کہ یہ باغی عورت غلط قانون کی دھجیاں اڑانے والی تھی لیکن افسوس کہ عوام کے اس

بقیہ عید کا تحفہ

صابری سے میری آخری ملاقات عید کے روز ہوئی۔ میں کئی دنوں سے اس کے پاس نہیں گیا تھا۔ اس روز اس کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ لیکن میرے پہنچنے پر وہ سنبھل کر اٹھ بیٹھا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مسکرا کر بولا۔

آج عید کا دن ہے، لوگ خوش ہوں گے اور ایکدوسرے کو تحفے تحائف پیش کر رہے ہوں گے۔ میں بھی خوش ہوں اور تمھیں کچھ تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ چند کتابیں جنھیں دکھلانے کیلئے میں تمھیں پہلی بار اپنے یہاں لایا تھا تمھاری خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس ان کے سوا اور کچھ ہے بھی نہیں۔ تم جانتے ہو کہ میں نے اپنی ہر چیز کو حالات سے مجبور ہو کر بیچ دیا ہے مگر ان کتابوں کو نہیں بیچ سکا حالانکہ ان سے زیادہ قیمتی اور قابل قدر کتابیں میرے پاس تھیں۔ لیکن یہ مجھے بہت عزیز ہیں۔ اکثر میں سوچا کرتا تھا کہ میرے بعد ان کتابوں کا کیا ہوگا۔ یہ خیال میرے لئے تشویشناک تھا مگر اب کوئی مجھے فکر نہیں رہی اب مجھے مرنے میں تکلیف نہ ہوگی۔

صابری یکایک خاموش ہوگیا۔ اس کی طاقت آہستہ آہستہ زائل ہوتی جارہی تھی اور وہ زیادہ دیر تک بیٹھا نہ رہ سکتا تھا۔ میں نے اسے سہارا دیکر لٹا دیا۔

"تم نے اس روز سچ کہا تھا کہ تم میرے حالات سے یکسر ناواقف ہو۔ میں نے دانستہ تمھیں اپنے حالات سے آگاہ نہیں کیا۔ مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے واقعات بتانے ہی ہوں گے۔ کیونکہ اب بھی میں نے ایسا نہ کیا تو تم ان کتابوں کی اہمیت کو نہ سمجھ سکو گے اور یہ تمھاری نگاہوں میں وہ وقعت نہ حاصل کرسکیں گی جو میں چاہتا ہوں"۔
وہ دم لینے کے لئے رک گیا۔

"کتابیں پڑھنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ اس شوق کے باعث میں اکثر شہر کی پبلک لائبریری میں جاتا اور گھنٹوں کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ آمدنی کا ذریعہ معقول تھا اس لئے کبھی کبھی تو تمام دن لائبریری میں گذار دیا کرتا تھا۔ میرے علاوہ وہاں جو لوگ آیا کرتے ان میں سے ایک لڑکی بھی تھی۔ اسے میری ہی طرح کتابوں سے عشق تھا بہت دنوں تک میں اس سے قطعی ناآشنا رہا اور میں نے کبھی اسکی طرف توجہ نہ دی۔ کتابوں کی لذت نے مجھے دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز کر دیا تھا حتیٰ کہ صنف لطیف میں بھی میرے لئے کوئی دلکشی اور جاذبیت نہ تھی۔ لیکن کتابوں کے لگاؤ نے ہم میں لگاؤ پیدا کر دیا اور ہمیں ایکدوسرے سے دلچسپی پیدا ہوگئی جس نے دوستی کی صورت اختیار کرلی۔ اب ہم ایک دوسرے سے ملا کرتے اور کبھی کبھی لائبریری سے نکل کر سیر کیلئے بھی چلے جایا کرتے تھے۔ عشق و محبت کا ہم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہم صرف اسلئے ملتے تھے کہ کتابوں کے متعلق گفتگو کریں اور مختلف مضامین پر ایکدوسرے کے خیالات معلوم کریں۔

یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا لیکن آہستہ آہستہ ہمیں محسوس ہونے لگا کہ جب تک ہم مل نہیں لیتے ہمیں بےچینی سی رہتی ہے۔ اس بات کا اظہار ہم نے کئی دفعہ ایک دوسرے سے کیا اور ہمیشہ اپنی اس حالت پر متعجب ہوئے۔ لیکن ہمارا یہ تعجب زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا اور ہمیں بہت جلد معلوم ہوگیا کہ ہم ایکدوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ محبت ہمارے لئے ایک نئی چیز تھی اور ہمیں اس میں کتابوں سے کہیں زیادہ لذت حاصل ہونے لگی۔

ہمیں اپنی حالتوں کا صحیح اندازہ ہو چکا تھا لیکن ہم بکھرے نہیں بلکہ اپنے کو سنبھالتے رہے

بہی خواہان اردو جلد توجہ فرمائیں!

نووارد لکھنوی:۔ (بمبئی کے ایک ان پڑھ راہگیر سے) آداب عرض ہے، آداب عرض ہے۔ اجی قبلہ بار خاطر نہ ہو تو حضور ذرہ سی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔

بمبوی راہگیر:۔ کیا ہے؟

لکھنوی:۔ اجازت ہو تو بندہ کچھ عرض کرے

بمبوی:۔ کیا بولنے کا ہے بولونا یار جلدی کھالی مچ کیوؤں کھاتے ہو۔

لکھنوی:۔ آپ خفا نہ ہوئیگا عرض یہ ہے کہ..........

بمبوی:۔ کیا عرج یہ ہے لگائے ہو یار کیا بولنے کا ہے تو جلدی بولونا ایکتو یاں بکھت ہو رہا ہے۔

لکھنوی:۔ ہیں ہیں آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں عرض یہ ہے کہ.....

بمبوی:۔ پھر او ہی عرج یہ ہے کہ

لکھنوی:۔ جی جی سنئے تو عرض یہ ہے۔ کیا جناب از راہ مہربانی یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ وہ مشہور ٹوپی کی دوکان کہاں واقع ہے۔ جہاں کئی اقسام کی بہترین ٹوپیاں مثلاً شیر گولہ۔ اصل مینارہ اور جناح کیپ۔ پرنس کیپ وغیرہ وغیرہ نہایت ارزاں نرخ پر دستیاب ہوتی ہیں۔ اور کیا نام جہاں ہمیشہ کم خرچ بالانشیں کی مثال بالکل صادق آتی ہے اور ہاں عرض یہ ہے........

بمبوی:۔ ہر گیا بابا تم سے ہر گیا کون سی دوکان چیئے پٹیل برادرس ٹوپی والے کی۔

لکھنوی:۔ جی جی نوازش عنایت خدا آپ کی عمر دراز فرمائے وہی وہی دوکان ٹھیک بیان فرمایا آپ نے.........

بمبوی:۔ دیکھو یہ بھینڈی بزار ہے یاں سے سیدھے جاؤ تو اگل پایدھونی آئے گی۔ واں تم کو ایک دیول ملے گا.........

لکھنوی:۔ قطع کلام معاف کیا خاکسار یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ دیول کسے کہتے ہیں۔

بمبوی:۔ عجب آدمی ملے ہے ہو یار تم بی ارے دیول نئیں سمجھتے جہاں ہندو لوک پوجا کرتے ہیں۔

لکھنوی:۔ غالباً آپ کا مقصد مندر سے ہے۔

بمبوی:۔ ہاں ہاں بابا ہاں مندر و ندر جیسے سمجھو تو بس وہ پایدھونی کے باجو بیچ دوکان ہے اور پٹیل برادرس ٹوپی والے کے نام کا بڑا پاٹیا بی لگا ہے۔

لکھنوی:۔ جی شکریہ شکریہ اور میں عرض کر رہا تھا...... بمبوی:۔ بس جاؤ یار جاؤ ابی یا اتیم نہیں۔ ہے تمارا ٹیم بی مالوم پڑتا ہے کھراب ہوگیا ہے۔ اچھا سلام علیکم۔

صابری تھوڑی دیر کیلئے ٹھہر گیا اسکی آواز کمزور ہوتی جارہی تھی ۔ میں نے اسے تھوڑا سا پانی پلایا اور خاموشی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا ۔

" داستان بہت طویل ہے اور وقت تنگ " وہ بولا میں تمہارے سامنے تمام تفصیلات بیان نہیں کرسکتا ۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہمارے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ ایکدوسرے کے بغیر ہمارا جینا مشکل ہوگیا ۔ آخر ہمنے شادی کرلی ۔

اب ہماری زندگی بڑی خوشگوار رہنے لگی تھی ۔ دن بھر ہم پڑھتے تھے اور کتابیں ، اور جب کتابوں سے جی اکتا جاتا تو ایکدوسرے سے پیار و محبت کی باتیں کرتے اسطرح ایکسال گذرگیا اور میرے گھر میں ایک نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے ۔ ہمیں اس کی بہت خوشی تھی کیونکہ عنقریب ہماری محبت ایک اور زندگی کی صورت اختیار کررہی تھی ۔ مگر آہ ! کسے خبر تھی کہ یہی چیز جو ہمارے لئے انتہائی مسرت ثابت ہونیوالی تھی ۔ ابدی غم کا باعث ہوگی ۔

بچہ کے پیدا ہونے سے ایک مہینہ پہلے ناہید بیمار ہوئی اور ایسی کہ پھر نہ سنبھل سکی ۔ ناہید کی موت کے بعد میری دنیا ہی بدل گئی ۔ اب میرے لئے کہیں کوئی مسرت نہ رہی ۔ کتابوں سے بھی مجھے نفرت ہوگئی ۔ ہر وقت ناہید کی یاد میری زندگی کو کھانے لگی ۔ رنج و غم نے مجھے پاگل بنادیا ۔ میں کچھ کرنے کے لائق نہ رہا اور میری تمام آمدنی ختم ہوگئی ۔ یہاں تک کہ فاقوں کی نوبت آگئی ۔ آخر میں نے گھر کا تمام سامان اور کتابیں بیچ دیں کچھ دنوں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا ۔ آخر طبیعت کو کسی قدر سکون آہی گیا ۔ لیکن میری صحت خراب ہوگئی اور آج یہ حالت ہے کہ اب مجھے اپنی زندگی کی کوئی امید نہیں ۔

صابری پھر ٹھہر گیا

یہ چند کتابیں جو میں اسوقت تمہیں تحفہ کے طور پر دے رہا ہوں یہ ناہید کی یادگار ہیں ۔ یہی وجہ تھی کہ بری سی بری حالت میں بھی میں انھیں بیچ نہ سکا اور دل و جان سے ان کی حفاظت کرتا رہا ۔ ناہید کی موت کے بعد جب اس کی یاد بہت ستاتی تو میں ان کتابوں کو اٹھاکر جی نہ چاہنے کے باوجود پڑھتا اور اس سے کچھ سکون ہوجاتا ۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ کتابیں مجھے کتنی عزیز ہوں گی ۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میرے مرنے کے بعد یہ کسی ایسے شخص کے پاس پہونچیں جو ان کی قدر اسطرح نہ کرسکے جس طرح میں چاہتا ہوں ۔

زندگی کے آخری لمحوں میں میری روح مطمئن ہے کہ میں ناہید کی اس یادگار کو تمہارے حوالہ کررہا ہوں ۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم ان کی اسی طرح حفاظت کروگے جسطرح میں نے کی ہے ۔

میری داستان ختم ہوچکی لیکن میرے ختم ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے اب مجھے کچھ اور نہیں کہنا ہے ۔ اور میں چاہتا ہوں کہ خاموشی کے ساتھ موت کا انتظار کروں ۔

صابری نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور میں اس کے پاس بیٹھا ہوا اس کے پرسکون چہرہ کو دیکھتا رہا ۔

دو شعر

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں ۔ اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

کیا پھر تم نے روتا دیکھ کر دیدار کا وعدہ
پھر ایک بہتے ہوئے پانی پہ بنیادِ مکاں رکھ دی

نفسیات کا مسئلہ ہے کہ ہر انسان رنج سے دور رہنا چاہتا ہے اور خوشی کا متمنی ہوتا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کیلئے انسان نے سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، ریاستوں کو منظم کیا۔ قوانین وضع کئے، اخلاق کے اصول مرتب کئے اور صحیح معاشرتی زندگی کی بنیاد ڈالیں۔

ان تمام کوششوں کا واحد مقصد یہ تھا کہ وہ تکالیف جو جدوجہد للبقا میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کو دور کیا جائے اور انسانی زندگی کو مسرت اور خوشی کا گہوارہ بنایا جائے۔ علوم کی تدوین، فنون کا ارتقاء، سائنس کی کرشمہ سازیاں، نئے نئے خیالات کی ترویج غرضکہ ہر شئے کا یہی مقصد تھا اور آج بھی یہی مقصد ہے کہ انسانی زندگی سے رنج و محن کو دور کر کے انبساط و سرور کی راہیں نکالی جائیں۔

اس مقصد کے حصول میں انسان نے پہلا قدم جو اٹھایا ہے وہ تدبیر منزل تھا۔ اس نے اپنے تمام کاموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا، پہلے تو وہ فرائض جو گھر کے اندر کے اندر ہوں اور دوسرے وہ فرائض جو گھر کی چار دیواری کے باہر بیرونی دنیا سے تعلق رکھتے ہوں۔ دونوں کاموں کی تقسیم کے بعد اس نے عملی صلاحیتوں کا جائزہ لیا اور جب یہ دیکھا کہ دونوں کام وہ بیک وقت اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا تو اس نے ان دونوں کاموں کو اپنی دونوں اصناف میں تقسیم کردیا۔

مرد مقابلتہً طاقتور تھا اس لئے باہر کے کام تفویض کئے گئے۔ انتظام حکومت، دفاع وطن، کسب معاش، صنعت و زراعت وغیرہ مشکل کام حصہ میں آئے اور گھر کا انتظام پرورش اطفال اور اسی طرح کے وہ تمام کام جو گھر کے اندر سے تعلق رکھتے تھے۔ عورتوں کے سپرد کئے گئے۔

ہزارہا سال گذر چکے ہیں جب سے یہ انتظام جاری ہے اور انسان کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے۔ اب اسمیں ذرا بھی تبدیلی کی گئی تو سارے معاشرتی نظام میں اختلال پیدا ہو جانا یقینی ہے۔

معاشرت انسانی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے حقوق و فرائض کی نگہداشت کریں۔ ایکدوسرے کے حقوق پر ڈاکہ نہ ڈالیں۔ اور ایک دوسرے کے فرائض میں رخنہ اندازی نہ کریں۔ دونوں اپنے دائرہ عمل میں محنت، تندہی اور دلچسپی سے کام کریں اور اسطرح گھر اور باہر کی دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیں۔

تعلیم کا مقصد بھی یہی ہے کہ مرد اور عورتیں اپنے اپنے حقوق کو جانیں، اپنے فرائض سے آگاہ ہوں اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں رہتے ہوئے ان فرائض کو جو معاشرتی قوانین نے ان کے سپرد کردئے ہیں بطریق احسن انجام دیں۔
ہندوستان میں بدقسمتی سے عورتوں کی تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتی حالانکہ جتنی ضرورت مردوں کو تعلیم کی ہے اتنی ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ عورتوں کو تعلیم درکار ہے۔ اسلئے کہ آئندہ نسلوں کی تعمیر ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر آئندہ نسلوں کو بہتر بنانا ہے تو عورتوں کو تعلیم دینا اور اچھی تعلیم دینا سخت ضروری ہے۔ ورنہ ع کار طفلاں خراب خواہد شد۔

عورتوں کو اعلیٰ ترین تعلیم دینا چاہئے اس لئے کہ جتنی عمدہ ان کی تعلیم ہوگی اتنی ہی عمدہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دے سکیں گی اور اتنی ہی اچھی نسل کی تربیت کرسکیں گی۔

مگر تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستانی عورتوں کو "میم صاحبہ" بنا دیا جائے کنگھی، چوٹی اور فیشن کا اتنا دلدادہ کردیا جائے کہ وہ اپنے خانگی فرائض کو بھول بیٹھیں، ناولوں کے مطالعہ میں اولاد کی تربیت ترک کردیں۔ سو نہار اور ادو میں کھو کر شوہر کی خدمت سے آنکھیں بند کرلیں اور تعلیم کے زعم میں گھر کے معاملات

مشہور نکٹائی مارکہ زردہ
ہندوستان بھر میں اپنی خصوصیت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اعلیٰ درجے کے تمباکو سے ماہرین کیمیا اور خود مالک کارخانہ کی نگرانی میں یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے جس محنت اور احتیاط سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے۔ ان کی صحت و کامیابی تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے یہ زردہ تمام مضر اجزا سے پاک ہے جس صفائی اور ستھرائی سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے۔
نکٹائی مارکہ زردہ:- نکٹائی مارکہ کارخانے کی بے مثل و بے نظیر دیگر چیزوں کی طرح نکٹائی مارکہ مشکی قوام بھی اپنی آپ نظیر ہے۔ اس قوام میں بہترین اور مفید ترین اجزا کے علاوہ مشک خالص اور زعفران کا حصہ غالب ہے۔ گلاب اور کیوڑہ کے عرق میں اس کا قوام تیار کیا جاتا ہے۔ نہایت خوش ذائقہ اور خوشبودار، دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ پان کھانیوالوں کو خصوصیت سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ نفاست پسند طبیعتوں کے لئے بہترین تحفہ ہے یہ قوام دراصل ایک طرح کا منجن ہے ایک بار آزمائش کیجئے۔ اس کی تمام خوبیاں آپ پر روشن ہو جائیں گی۔
کیسر بلاس:- پان کا نہایت خوشبودار اور خوش رنگ بے انتہا لذیذ بے حد مزیدار مسالہ ہے۔ ہمارے کارخانہ کی یہ خاص ایجاد ہے جو علم سائنس کے ذریعہ اور ان کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔ کیسر بلاس معدہ کی تمام شکایتوں کو دور کرتا ہے۔ دل اور دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ آپ پان کھاتے ہوں تو کیسر بلاس ضرور استعمال کریں۔ اس لئے کہ بازار کا کوئی مسالہ ہمارے کیسر بلاس کی لذت خوشبودار ذائقہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
محمد مصطفےٰ احسین مالک کارخانہ نکٹائی مارکہ زردہ نمبر ۱۸۱
ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ۔ کلکتہ!
شاخیں!
نمبر ۵ کلایو اسٹریٹ کلکتہ نمبر ۱۱ آرسکن روڈ بمبئی۔ نمبر ۱۸ اسی مورتی بازار رنگون نمبر ۱۵ کیننگ اسٹریٹ کلکتہ

دی ولکن انشورنس کمپنی لمیٹیڈ بمبئی

قائم شدہ ۱۹۱۹ء ـــــــــ صدر دفتر بمبئی

بیمہ کی قسمیں

آگ ـــ پانی ـــ حادثات ـــ اور ملازمین ـــ کی ذمہ داری

بورڈ آف ڈائرکٹرز :-

سیٹھ چمن لال ایچ سیتل واڈ کے سی، آئی، ای (چیرمین) سٹھ حکم چند سیٹھ روپچند ناٹ دیلچی لکھمی بی، اے، ایل، ایل، بی، سرچینو بھائی مادھو لال بیرونیٹ، مرکاؤس جی جہانگیر بیرونیٹ کے، سی، آئی، ای، منگلداس بی مہتا سالیسٹر، جے سی سیتلواڈ۔ ایکس آفیسو۔

منیجنگ ایجنٹس :- ـــــــ جے، سی، سیتلواڈ اینڈ کمپنی۔

شاخیں

۲ لائن بیچ مدراس، ۱۳۵ کیننگ اسٹریٹ کلکتہ، بمبئی روڈ، کمپالا (یوگنڈا) دی مال، لاہور، ۴۲ فائراسٹریٹ رنگون کرنچ، بھدر، احمد آباد، کروسے بلڈنگ۔ لکشمی روڈ۔ پونہ !!

ہند اور بیرون ہر جگہ ایجنسیاں ہیں !!!

126, Bardanwalla Building, 1st Chinch Bunder Road, BOMBAY, 9.

اگر آپ کو ماڈرن پلمبنگ کا کام کرانا ہے تو ہم نے بمبئی کی مشہور و معروف بلڈنگوں کے کام کئے ہیں۔ موجودہ زمانے کے لحاظ سے "لیٹسٹ" کام ہوا کرتے ہیں جو کنسیل باتھ روم، لو ڈاؤن باتھ لیوٹری وغیرہ وغیرہ۔ نیز گرم اور ٹھنڈے پانی کے گیزر وغیرہ کی فٹنگ کا کام نہایت کفایت بھاؤ سے کیا جاتا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ شائقین ایک بار کام کرا کر دیکھیں گے۔

المشتہر :- غلام، ایچ، جعفر لائسنس پلمبر

ٹیلیفون نمبر ۹۳۴۹۳ ـــ ۱۲۶ باردان والا بلڈنگ۔ فرسٹ چنچ بندر روڈ کمرک بمبئی نمبر (۹) ـــ ٹیلیفون نمبر ۳۴۹۳۹

تان سین اور دیپک راگ

تان سین کا اصلی نام ٹانٹ سینا یا ٹونا سا ٹنا تھا' اطالیہ کا رہنے والا تھا۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ تان سین ہندوستان میں پیدا ہوا تھا' لیکن جلال الدین شروانی اس کی پیدائش کی جگہ کشمیر بتاتے ہیں' تان سین کی آواز قدرتی طور پر سُریلی اور بلند تھی۔ سنہ ۱۵۶۷ء میں تان سین کشمیر سے لاہور آیا' اور ملا سلامت کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۸ برس کی تھی۔

ایک دن محفل عیش و نشاط گرم تھی' تان سین' زین خان اور ملا عبد القادر وغیرہ بھی بیٹھے ہوئے تھے' دیپک پر بحث چھڑ گئی۔ شہنشاہ اکبر نے تان سین کی طرف دیکھا۔ اور ایک دن جمنا کے کنارے دیپک گانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ تان سین نے ناف تک پانی میں کھڑے ہو کر دیپک گانا شروع کیا۔ چند لمحے بعد پانی سے شعلے بلند ہونے لگے اور پانی تیل کی طرح پکنے لگا۔ اکبر نے یہ منظر دیکھ کر یہ خیال کر کہیں سارا دربار نہ بھڑک اٹھے تان سین کو اشارہ سے روک دیا اور نغمہ و سرود کی محفل برخاست کر دی گئی۔ غرضکہ تان سین نہ صرف ایک باکمال مغنی تھا۔ بلکہ علم و فضل میں بھی اسے کافی دسترس حاصل تھی۔

تان سین اکبر کا آٹھواں رتن تھا اور سنہ ۱۵۹۵ء

میں

بعمر ۴۶ سال

اس کا انتقال ہوا۔"

ISMAILI PRESS, BOMBAY, 4.

ہی سے بے خبر ہو جائیں ۔

عورت کی تعلیم کا مقصد اسکو ایک اچھی عورت بنانا ہے تاکہ وہ باپ کے گھر میں ایک سعید بیٹی، شوہر کے پہلو میں ایک نیک عورت اور اولاد کی موجودگی میں ایک اچھی ماں بن سکے ۔

عورتوں میں اخلاقی بلندی پیدا کرنے کے لئے ان کو مذہب کی بھی اچھی تعلیم دی جانا چاہئے ۔ مگر ایسی مذہبی تعلیم نہیں جو ان کو قدامت پسند، متعصب اور قابل نفرت بنا دے بلکہ ایسی تعلیم جو ان میں عفت کا پاس، عصمت کا لحاظ، آبرو کی قدر، ایثار کا جذبہ، خدمت کا شوق، شوہر کا احترام اور عمل کا ذوق پیدا کر دے

عورتوں کی صحت کیطرف بھی توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس لئے کہ ایک اچھا دماغ تندرست بدن ہی میں نصیب ہو سکتا ہے ۔ اگر عورتوں کی صحت خراب رہے گی تو وہ نہ تو شوہر کو خوش رکھ سکے گی، نہ تربیت اولاد پر کافی توجہ دے سکے گی اور نہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لے سکے گی ۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خانگی زندگی ایک وبال بن کر رہ جائے گی ۔

عورتوں میں اگر تعلیم عام ہو جائے تو جاہلانہ رسوم اور فرسودہ توہمات بھی آسانی سے دور ہو سکتے ہیں ۔ اور گھر کی فضا صحت بخش اور روشن بن سکتی ہے

عورتوں کو چاہیئے کہ وہ اب بیدار ہوں، اپنے حقوق کا احساس پیدا کریں اپنے فرائض کی بجا آوری میں پوری طاقت سے منہمک ہوں، علم حاصل کریں اور علم کی روشنی میں اپنے گھروں کو جنت کا نمونہ بنانے کی کوشش کریں ۔ آئندہ نسلوں کی تعمیر میں پوری دلچسپی لیں اور اپنی اولادوں کو ملک کے لئے باعث فخر اور قوم کے لئے باعث صد نازش بنانے میں دن و رات ایک کر دیں اس لئے کہ حقیقی مسرت اور دائمی خوشی فرائض کی ادائیگی ہی میں مضمر ہے ۔ یہ عورت کے فرائض ہیں اور جب وہ ان کو بوجہ احسن ادا کرلے گی ۔ تب ہی اسکو اپنی زندگی مسرتوں سے بھر پور معلوم ہو گی ۔

اسلام کا معاشی نظام

اشتراکیت و سرمایہ داری کی موجودہ اصطلاحات کی روشنی میں

از مولانا ابو الاقبال محمد جمیل الرحمٰن صاحب سیوہاروی

اسلام نے جائداد منقولہ اور غیر منقولہ میں شخصی ملکیت اور اس ملکیت میں مالکانہ تصرفات کا حق ایک محدود دائرہ میں تسلیم کیا ہے اور اسلام کے بیان کردہ ذرائع آمدنی ...... مثلاً تجارت۔ وراثت۔ ہبہ، مزدوری و کاشتکاری وغیرہ وغیرہ ذرائع سے جو دولت بھی ...... حاصل ہوتی ہے اس پر شخصی ملکیت کے نتیجہ میں عشر و زکوٰۃ، مہر و نفقات، خراج وغیرہ مختلف ٹیکس اشخاص پر عاید ہوتے ہیں اور جس طرح جائداد منقولہ میں یہ شخصی تملک معتبر ہے۔ ٹھیک اسی طرح جائداد غیر منقولہ میں ہے اسلام کا قانون ملکیت ناطق ہے ...... چنانچہ اسلام کے متفقہ اور مشہور قانون شفعہ کی بنیاد اسی پر قایم ہے قرآن عظیم نے سورۃ الکہف میں جس باغ کا تذکرہ فرمایا ہے اس کی ملکیت باغ کے زمینداروں کی جانب فرمائی ہے اور اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام نے شخصی ملکیت کو آئینی حیثیت سے تسلیم کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ کتاب و سنت اور ائمہ کے اجماعی مذہب کے پیش نظر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام نے شخصی ملکیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہر موقعہ پر دو اصول محفوظ رکھے ہیں۔

اول یہ کہ دولت کی پیداوار کے ذرائع کسی ایک ہی طبقہ میں سمٹ کر نہ رہ جائیں۔

دوسرے یہ کہ شخصی اور ذاتی سرمایہ میں بھی عوام کا مستقل اور معقول حصہ آئینی حیثیت سے موجود رہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے، کیلا تکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (تاکہ دولت تمہارے سرمایہ داروں میں سمٹ کر نہ رہ جائے) اور فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (تمہاری دولت میں غریب اور فقیر کا بھی حق ہے) نیز پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے توخذ من اغنیائھم و ترد الیٰ فقرائھم (دولتمندوں سے لیکر غریبوں میں بانٹ دیا جائے)

اور ایک جگہ پر قرآن عظیم نے فرمایا ہے۔ الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم (توبہ) جو لوگ سونے اور چاندی کو سرمایہ بنا کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کے بتلائے ہوئے راستہ میں قوم کے (ضرورتمند طبقہ پر) خرچ نہیں کرتے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔ اس ارشاد ربانی کی بنا پر اسلام کے ایک مشہور صحابی حضرت ابو ذر غفاریؓ کا عقیدہ یہ تھا کہ معمولی ضروریات زندگی کے علاوہ اسلام میں قطعاً سرمایہ داری جائز نہیں ہے۔ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ (اس مسئلہ میں) حضرت ابو ذر کے تقریباً ہمنوا تھے فرق صرف یہ تھا کہ وہ معمولی ضروریات کو چار ہزار درہم یعنی مروجہ سکہ سے تخمیناً ایک ہزار روپیہ سالانہ میں محدود سمجھتے تھے۔ اس سے زائد سرمایہ ان کے نزدیک بھی جائز نہ تھا بلکہ اس کو قوم کے ضرورتمند طبقہ پر صرف کر دینا ضروری تھا۔ اسلام کی مشہور شخصیت امام ضحاکؒ ان "معمولی ضروریات" کا تخمینہ اس سے کچھ زیادہ یعنی ڈہائی ہزار روپیہ فرماتے تھے۔

(اتحاد السادۃ للزبیدی و شرح احیاء العلوم جلد ۴ صفحہ)

لیکن یہ واضح رہے کہ ان حضرات کا یہ اختلاف اصولی نہ تھا بلکہ اپنے اپنے تجربہ کے مطابق ضروریات زندگی کو دیکھتے ہوئے ایک تخمینہ تھا جسے ہر شخص ہر زمانہ میں جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔

جمہور علماء اسلام کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن عظیم نے اس سرمایہ کی شدید مذمت کی ہے جس میں سے قوم کے ضرورتمند افراد کے لئے زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کی معقول مقدار نہ نکالی جائے۔

جائداد غیر منقولہ کے بارے میں مالکانہ تصرفات کے لحاظ سے ائمہ اسلام کے حسب ذیل اقوال مذکور ہیں۔

امام حسنؒ۔ طاؤسؒ۔ اور امام اعظمؒ کے نزدیک جائداد صحرائی میں کسی ایک شخص کو صرف

اس فاضل آراضی کو بدولت معاوضہ دوسروں کو دینا ضروری ہے۔ (طحاوی جلد ۲ حواشی الموطا امام محمد وغیرہ)

امام جعفر صادق علیہ السلام کے خیال میں خود کاشت کی اس زمین کا تعین حکومت کی تجویز پر منحصر ہے (مبسوط سرخسی جلد ۱۳ صفحہ ۲۳)

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ ایک مقررہ لگان کے بعد زمینداری کو جائز سمجھتے ہیں۔ (طحاوی وغیرہ) دیگر علماء کے نزدیک لگان اور بٹائی کی دونوں صورتیں جائز ہیں۔ (عالمگیریہ و عام کتب)۔

لیکن ان تمام حضرات کے نزدیک کاشتکار زبردست مراعات کا ہر وقت مستحق ہے مثلاً آفات ارضی و سماوی کی بنا پر بقدر نقصان لگان خود بخود کم یا معاف ہوتا رہے گا ایک ہی سال کا لگان رہتے ہوئے بعض حادثات کی بنا پر مدت کاشت معاہدہ سے اندر ہو سکے گی۔ وغیرہ وغیرہ (عالمگیریہ و قاضیخان)

جائداد غیر منقولہ میں ملکیت کے لحاظ سے ذیل کی قسم اراضی ذاتی ملکیت کے ماتحت نہیں آسکتی۔

(۱) وہ چراگاہ جو آبادی کے متصل ہو۔
(۲) وہ زمین جس کے درختوں کی لکڑی جلانے کے کام میں آئے۔
(۳) نمک کی کان (۴) دریا (فتاوی عالمگیریہ و کتاب احیاء الموت)

مستقل طور پر اسلام نے چار چیزوں میں ہر انسان کا اشتراکی حق تجویز کیا ہے۔
(۱) قدرتی پانی (۲) خودرو گھاس (۳) کان کا نمک (۴) جلانے کی لکڑیاں جو خود رو درختوں سے لیجائیں۔ اور آگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔۔۔ الناس شرکاء فی ثلث فی الماء والکلاء والنار تمام انسان تین چیزوں میں باہم شریک ہیں۔ پانی میں۔ گھاس میں۔ آگ میں (ہدایہ) ابو داؤد کی روایت میں اس سوال کے جواب میں ما الشی الذی لا یحل منعہ یعنی وہ کیا چیز ہے جس کا روکنا جائز نہیں آپ نے فرمایا کہ الملح یعنی نمک۔ صاحب نہایہ نے لکھا ہے کہ آگ سے مراد وہ خودرو درخت ہیں جن کی لکڑی جلانے کے کام میں آئے۔

اسلام نے سونے چاندی کے زیور اور نقد سامان تجارت میں زکوٰۃ یعنی سرمایہ کا چالیسواں حصہ عوام اور قوم کے حاجتمند کے لئے سالانہ ٹیکس کی حیثیت سے مسلمانوں کے ذمہ تجویز کیا ہے۔ زکوٰۃ کا فلسفہ یا اس تجویز کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام دولت کو محفوظ سرمایہ بنانے کی اجازت نہیں دیتا ہے فرض کیجئے ایک شخص مسلمان اپنی ابتدائی عمر میں چالیس لاکھ یا چالیس کروڑ یا کسی بڑے سے بڑے سرمایہ کا مالک بنتا ہے۔ تو اسلام کے قانون کے مطابق از روئے حساب سالانہ چالیسواں حصہ نکالتے رہنے کے اعتبار سے یہ تمام کا تمام سرمایہ تقریباً پچاس سال کے اندر اندر اس کے ہاتھ سے نکل کر عوام تک پہنچ جائے گا۔ معلوم ہے کہ انسان کی عمر طبعی ۶۰ یا ۶۵ سال ہوتی ہے۔ اور پندرہ سال تک وہ ایک غیر مختار رہنے کی حیثیت سے دوسروں کی سرپرستی میں گذارتا ہے لہذا ہوش اور خود مختاری کے اس پورے دور میں پچاس سال تک اسلام ایک مسلمان کو یہ اجازت تو دیتا ہے کہ وہ حدود شرعیہ میں رہ کر قیام زندگی کیلئے اس سرمایہ سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دولت کی کسی

بھی مقدار کو محفوظ سرمایہ بنا کر چھوڑ دے بلکہ فی اموالھم حق معلوم (ان کے مال میں غریبوں کا حق ہے) کے قانون کی بنا پر ایک سرمایہ دار اپنی عمر طبعی سے پہلے ہی اس مال کو عوام میں بانٹ دینے پر مجبور ہے۔

واضح رہے کہ سرمایہ کی مثال میں یہ مقدار جمہور کے خیال کے پیش نظر ہے ورنہ ابو ذر غفاریؓ اور علی مرتضیٰؓ وغیرہ حضرات کے مسلک کے پیش نظر تو سرمایہ کی ایک محدود معین مقدار کے علاوہ باقی کل سرمایہ عوام کی ملکیت ہے۔

مسلمان کی پیداوار میں بارانی اور آبپاشی کے فرق سے دسواں اور بیسواں حصہ (عشر) عوام کے حق کا تجویز کیا گیا ہے۔

مویشیوں کی معتدبہ تعداد پر مختلف اصناف کے لحاظ سے مختلف حصہ (زکوٰۃ کے نام سے) عوام کے لئے مقرر کیا گیا ہے

تلقی اور احتکار یعنی تجارت کے وہ طریقے جو عوام پر اثر انداز ہوں اور جن میں سامان ضرورت کو ضرورت کے باوجود گرانی کے انتظار میں روک لیا جاتا ہے اور اسی طرح کسی تجارتی جماعت کا نرخ پر اس طرح قابو پالینا جس سے عوام متاثر ہوتے ہوں۔ تجارت کے یہ تمام پہلو اسلام میں قانوناً جرم ہیں اور حکومت کے ذمہ ان کی نگرانی تجویز کی گئی ہے۔ (ہدایہ و قاضیخان و عام کتب)

اگر عوام پر کوئی حادثہ آجائے یا وہ سخت مفلس ہو جائیں تو سرمایہ داروں کو بلا قیمت سامان زندگی مہیا کرنے پر مجبور کیا جائیگا۔ (الحسبہ فی الاسلام لابن قیم)

اسی طرح کسی معاشی حادثہ کو روکنے یا عوام کو پریشانی سے محفوظ رکھنے کے لئے سرمایہ داروں کی دولت کو جبراً صرف کرنا ضروری ہوگا۔ (فتاویٰ عالمگیریہ بیان کرسی الانہار کتاب الشرب)

اسلام کے مذکورہ بالا نظریات کی روشنی میں جو اجمالی طور پر پیش کئے ہیں حسب ذیل نتیجہ برآمد ہے۔ "اسلام نے شخصی ملکیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ہر موقعہ پر سرمایہ میں عوام کا حق تجویز کیا ہے۔ حتیٰ کہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے اپنے معاشی نظام میں عوام کی ضروریات کا جیسے بڑی حد تک سرمایہ داروں کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔"

لہٰذا ان تمام امور کے پیش نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اسلام کے نظام معیشت کو اگر چہ موجودہ عہد کی غیر فطری اور ناکام اشتراکیت یا انسانیت سوز سرمایہ داری کی اصلاح سے معنون کرنا درست نہیں ہے تاہم اس نے کافی حد تک اعتدال کے ساتھ اشتراکی ضروریات کو پورا کر دیا ہے۔"

جمہوریت!

جمہوریت یا ڈیموکریسی کے لغوی معنی جماعت یا گروہ کے ہیں۔ اصطلاح میں متحدہ طور کے نظام حکومت کو کہتے ہیں۔ اقالیم نوع انسان کو حقیقی طور پر کسی طریقۂ حکومت کے ماتحت فلاح و بہبود اور آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ تو وہ صرف جمہوریت کے اصول و آئین ہیں۔ نظام جمہوریت عوام الناس کی آواز، منشا اور جذبات کا حامل صحیح معنوں میں ترجمان اور ہر ایک ضروریات کا کفیل ہے۔ جمہوریت کا نظام ہی دنیا میں ایسا ہے کہ جس کی رو سے ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی قوموں میں مذہبی ملکی سیاسی تفریق ہونے کے باوجود بھی انھیں انکے جائز اور واجبی حقوق.. حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا میں آج تک جتنے بھی دستور حکومت قائم ہوئے۔ ان کا اکثر و بیشتر حصہ جمہوریت کے اصولوں سے ماخوذ تھا جمہوریت کا مطمح نظر یہ ہے کہ دنیا سے ظلم و تشدد۔ بھوک افلاس اور غلامی کی لعنت کو دور کر کے خوشحالی و امن و امان بلحد سلامتی کا پرچم لہراتا ہر قوم و ملت کی منتخبہ نمائندگی کے ساتھ حکومت کرنا جمہوریت اپنے مخصوص فلسفے اور بنیادی اصول بھی رکھتی ہے جن کا منشاء مساوات شخصی اور سیاسی آزادی سے ہر شخص کو چند شرائط کے ماتحت رائے دینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اور اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر بڑی سے بڑی جگہ یا عہدہ حاصل کر سکتا ہے۔

جمہوریت سیاست دان عالم کے لئے مشعل ہدایت ہے۔ اور اس کی روشنی ایسی ہے جیسی کہ آفتاب اپنی روشنی سے ہر غریب امیر چھوٹے بڑے کو یکساں طور پر فائدہ پہنچاتا ہے آج برطانیہ عظمی امریکہ اور ٹرکی کا عروج مفکرین اور مدبرین عالم کے لئے تو تیا چشم ہے ان کو جو کچھ خوشحالی اور علمی و فنی ترقی حاصل ہوئی ہے وہ جمہوریت کے زیر سایہ رہکر۔ برطانیہ عظمی کے رہیں سطحی طور پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کا طرز حکومت شہنشاہیت کے ماتحت ہے میں اسکا جواب اسوقت بخوف طوالت بطور اختصار دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ برطانیہ عظمی کے طرز حکومت کو شہنشاہیت کے نام سے موسوم کیا ہے اگر گہرائی کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جائیگا کہ وہ تمامتر جمہوری اصولوں کے ماتحت ہے اسکے ثبوت میں پارلیمنٹ کے قیام اور اسکے معاملات کو دیکھکر کہی جا سکتی ہے نظام جمہوریت زر زمین اور روٹی کے مسئلہ کو مکمل طور پر حل کر سکتا ہے میرا تو جمہوریت کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ جمہوریت

اقوال زریں

۱۔ عیب جوئی سے چشم پوشی بدرجہا بہتر ہے۔
۲۔ مرد تلون پسند ہوتا ہے۔ بیکس عورت محبت کی تشنہ۔
۳۔ گناہ کو گناہ سمجھکر احتراز نہ کرنا دوہرا گناہ ہے۔
۴۔ کامیابی عمل میں مضمر ہے۔
۵۔ بیجی کا دوسرا نام بے غیرتی و بے حیائی ہے۔
۶۔ زندگی کے لئے ہر گام پر موت ہے۔ اور موت رازِ بقا ہے۔
۷۔ مذہب سے بیگانگی گمراہی پر وال ہے۔
۸۔ پست حوصلگی کامیابی کی دشمن ہے۔
۹۔ اپنی آپ عزت کرو، زمانہ تمہاری عزت کریگا۔
۱۰۔ کسی کام کو انجام دینے سے قبل مآل کار پر نظر رکھنی چاہئے۔
۱۱۔ کوئی ایسی بات نہ کہو کہ جو ذلت کا باعث ہو۔
۱۲۔ کسی کے لئے "بارِ خاطر" ہونے کی بجائے "یارِ خاطر" ہونا بہتر ہے۔
۱۳۔ مصائب سے گھبرا کر نجات حاصل نہیں ہوا کرتی۔
۱۴۔ ہمیشہ اپنے ہی بل بوتے پر ہر کام انجام دو۔

اپنے بالوں کی حفاظت کرو!

بالوں کی جڑوں کو پوری اور اچھی غذا ملنی چاہئے اور یہ غذا

کامینیا آئل (رجسٹرڈ) ہے

کامینیا آئل سب سے پہلے بفا (خشکی) کو ابھارتا ہے۔ جو کنگھی کرنے سے نکل جاتا ہے اور اس کی تخلیق کا ہمیشہ کیلئے انسداد کرتے ہوئے بالوں کی جڑوں میں بطور غذا پہنچ کر بالوں کو تقویت اور ان کی نشو و نما میں رہبری کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے دماغ میں تر و تازگی رہتی ہے۔ سارا دن کام کاج سے تھک کر چور ہونے والے انسان کے لئے انتہائی مفید ہے۔ یہ تیل نہ صرف تھکان دور کر دیتا ہے بلکہ آرام و سکون بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بالوں کیلئے "کامینیا آئل" درحقیقت ایک عمدہ اور طاقت بخش تیل ہے۔ اگر بال اچھی حالت میں ہوں تب بھی اس کے استعمال سے وہ مزید خوبصورت، دراز، ملائم اور چمکدار بنجاتے ہیں۔ لہذا "کامینیا آئل" کا استعمال سب کیلئے یکساں طور پر مفید اور کارآمد ہے۔

قیمت فی بوتل — ایک روپیہ۔
تین عدد بوتل — دو روپیہ دس آنے
وی، پی، خرچ علیحدہ
مفت نمونہ کیلئے ۱ ر کا ٹکٹ بھیجئے۔

پھولوں سے مہکتا ہوا باغیچہ

یعنی

اوٹو دل بہار (رجسٹرڈ)

زمانہ ماسبق کے باغیچہ کی مہکتی ہوئی خوشبو صرف اوٹو دل بہار کی الکحل سے پاک شیشی میں میسر آسکتی ہے۔ اس کی مہکتی اور لہکتی ہوئی خوشبو طویل عرصہ تک قائم رہتی ہے اور جو ہر عطر فروش کے یہاں دستیاب ہوسکتی ہے لہذا آج ہی ایک شیشی خریدیے جو نہ صرف تمہارے لئے دل پسند اور خوش کن ثابت ہوگا۔ بلکہ اسکی بھینی بھینی اور میٹھی میٹھی خوشبو آپ کے دل کو لبھائے بغیر نہ رہے گی۔

قیمت ½ اونس کی بوتل —/۴/۱ ایک ڈرم کی بوتل —/۱۲/—
نصف ڈرم کی بوتل —/۸/— (پیکنگ اور محصول ڈاک علاوہ)

کامینیا صندل صابن

صندل کے صابن آپ نے ہر قسم کے استعمال کئے ہوں گے۔ لیکن کامینیا صندل صابن کی ساخت قطعی نرالی ہے۔ صندل کے تیل کے ساتھ جراثیم کش اجزاء ہونے کی وجہ سے جلد کو بہت زیادہ منفعت بخش اور سازگار ہے۔ اس کی میٹھی خوشبو خوش کن اور دل پذیر ثابت ہوئی ہے۔

قیمت تین ٹکیوں کا بکس ۱۲ آنہ۔ وی، پی خرچ علیحدہ۔
اطمینان کے لئے آج ہی نمونہ کی ٹکیا نصف آنہ کا اسٹامپ ارسال کر کے طلب کیجئے۔ اس سے زیادہ اور کیا اطمینان دلایا جاسکتا ہے۔

چہرہ کی جلد کو خوبصورت اور ملائم رکھنے کیلئے

کامینیا اسنو (رجسٹرڈ) استعمال کیجئے

اس کے وقتاً فوقتاً استعمال سے جلد نرم، ملائم اور دلکش بنجاتی ہے۔ چہرہ کی جھریوں، مہاسوں اور دھبوں کو صاف کر کے چہرہ کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیتا ہے۔
قیمت فی شیشی ۱ر۔ وی، پی خرچ علیحدہ۔
نمونہ کی شیشی ۲ر آنہ

ایجنٹ صاحبان توجہ فرمائیں

دی اینگلو انڈین ڈرگ اینڈ کیمیکل کمپنی ۲۸۵ مارکیٹ بمبئی نمبر ۲

تمام اسلامی ممالک میں سول ڈسٹری بیوٹرس درکار ہیں

از حقیقت نگار حضرت گرامی چشتی

یہ ایک ایسا عنوان ہے جس پر انسان اپنی ذہنی کاوشوں کے باوجود بھی خامہ فرسائی میں بہت کم کامیاب ہوتا ہے۔ چونکہ آمریت کے دونوں رخ متضاد ہیں۔ اگر بنظر تعمق مطالعہ کیا جائے تو دونوں طرف دو متضاد شکلیں دکھائی دیں گی۔

آمریت:۔ درحقیقت شخصیت پرستی کا دوسرا نام ہے۔

آمریت:۔ ایک طرف تو اس بات کی متلاشی ہے کہ انسان کے حقوق بلحاظ قومیت یا اکثریت یکساں ہوں۔ تو دوسری طرف اپنی شخصیت کے پیش نظر نام و نمود کے لئے بڑی قربانیاں دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ جس کا ماحصل خواہ حقیقت پر مبنی ہو یا نہو۔ بہر حال اس کی نظر میں بے گناہ اور گنہگار دونوں یکساں ہیں۔ اور اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے دوست دشمن کی تمیز نہیں رہتی۔

آمریت کبھی تنظیم نو کی اشاعت کے لئے دیوانہ وار کوشاں و سرگرداں رہتی ہے۔ کبھی تنظیم کا وہ سکون و اطمینان کا شیرازہ جو سہانی روشنی میں پروان چڑھتا رہتا ہے۔ اپنے گنہگار اور ظالم ہاتھوں سے پل میں برباد کرنے سے بھی باز نہیں آتی۔

میرا نظریہ جہانتک ہے اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے کا وہ ضرور اس بات سے متفق ہوں گے۔ بلکہ پورے وثوق سے کہہ سکیں گے۔ کہ آمریت سے انسانوں میں وہ نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اتنے بیدار ہو جاتے ہیں کہ بعد میں اس بیداری کی قربان گاہ پر اپنے عزیز ملک کے معصوم و مظلوم اور نو شگفتہ کلیوں کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ جس کا مکمل ثبوت یورپ کی ہٹلری آمریت ہے جس کی بیداری نے آنکھوں کی روشنی کو جلا ڈالا اور اس آمریت کے دل و دماغ میں وہ حس نہ رہی جو بے گناہوں کے خون سے لرزا اٹھتی ہے۔ یہ ہے وہ آمریت جس نے لاکھوں کروڑوں بے گناہوں کا خون بہایا۔ سیکڑوں کو خانماں برباد کر دیا۔ یورپ کے وہ پروردگار آمریت۔ آمریت کے دامن سے یہ بدنما داغ دور کر سکتے ہیں اور آمریت کو جو مورد الزام گردانا جاتا ہے۔ کیا اس کی صفائی میں کوئی معقول دلیل پیش کر سکتے ہیں؟ نہیں بلکہ سر جھکائے خاموش زمین کی گردش دیکھا کریں گے۔

نہایت مناسب
تجارتی نرخ
کم منافع
زیادہ
بکری
BOMBAY
FURNITURE HOUSE
PROP :— HABIB ISMAIL
MUTTON STREET, NULL BAZAR, BOMBAY 3.
ہمارے یہاں انتہائی خوبصورت، زینت دہ۔ دلکش اور آرائشی ہر قسم کا موجودہ وضع قطع اور بہترین ڈیزائن کا فرنیچر۔ دفاتر اور مکان کی زیب و زینت اور آرائش کے قابل ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اور حسب دلخواہ اور بموجب ہدایت تیار کرکے دیا جاتا ہے۔ بالخصوص شادی کی پُرمسرت و مبارک تقریب پر بہترین اور دیدہ زیب وضع قطع اور موجودہ مروجہ ڈیزائن کے تحت اپنی ذاتی نگہداشت میں بہ پابندئ وقت اعلیٰ قسم کا فرنیچر جہیز میں دینے کے لئے تیار کر دیا جاتا ہے۔ لہذا صرف ایکبار تشریف ارزانی فرما کر آزمائش و اطمینان حاصل کیجئے :-
مخصوص فرنیچر خریدنے والوں کے لئے —— صرف ایک ہی قابل اعتماد مرکز
بمبئی فرنیچر ہاؤس!
ٹیلیفون نمبر (۳۱۳۳۰)
ٹیلیفون نمبر (۳۱۳۳۰)
مالک :- حبیب اسمٰعیل
مٹن اسٹریٹ، نل بازار، بمبئی نمبر (۳)

اس کو نہ پڑھیے
اگر پڑھیے تو اس سے فائدہ اٹھائیے
مالک روزنامہ انجام دہلی کیا کہتے ہیں
آج کل اشتہار بازی نے ایک ذریعہ معاش کی صورت اختیار کر لی ہے اور پبلک کو ایسے تلخ تجربے ہوئے ہیں کہ اشتہار خواہ کتنا ہی سچا ہو مگر مشکل سے یقین ہوتا ہے۔ لیکن مجھے مسرت ہے کہ اس بے اعتمادی کے زمانے میں مشہور و نامور کارخانہ:-
انڈو جینوئن کیمیکل ورکس رجسٹرڈ دہلی!
محمد عثمان آزاد
سائنٹفک آئل
دافع جریان و احتلام
جوہر عشرت
ہر شہر اور قصبہ میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے
اس فرم کا جرمنی سے کوئی تعلق نہیں۔
دہلی کا نامور گورنمنٹ رجسٹرڈ کارخانہ:-
انڈو جینوئن کیمیکل ورکس نزد ڈاک خانہ جامع مسجد دہلی

زین خان کوکا اکبر کا چھٹا رتن

زین خان کا مختصر سا ذکر بیربل کی سوانحِ عمری میں پایا جاتا ہے۔ زین خان کے ایجاد کئے ہوئے سازوں کو شاید ہی کوئی ایسا ہو کہ جس نے یورپ کے عجائب خانوں میں دیکھ کر اظہارِ تعجب نہ کیا ہو آپ ناخواندہ تھے لیکن شہنشاہ اکبر نے زین خاں کو دولت تعلیم سے مالا مال کیا۔ اور آپ اکبر کے چھٹے رتن کی حیثیت سے ہمیشہ اکبر کے ساتھ رہے۔

آپ کے گانے میں یہ کمال تھا کہ اگر آپ کہیں کسی جنگل میں نغمہ سرائی کرتے تو جنگل کے تمام درندے اور چوپائے آپ کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ فروری ۱۵۹۶ء کا ذکر ہے کہ جب اکبر دکن کی مہم میں سرگرم تھے تو آپ نے زین خان سے فرمایا کہ تمہاری موسیقی کا کمال جب جانیں کہ جنگل کے ہرن خود بخود سر دھننے لگیں۔ زین خاں نے کہا حضور یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کہہ کر گانا شروع کیا اور جنگل کے تمام ہرن اور چوپائے آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ نصف گھنٹہ تک زین خان جنگل کے ایک گوشے میں گاتے رہے۔ اور شہنشاہ اکبر ہرنوں کے غول اور دیگر چوپایوں کو مست و بے خود دیکھ کر متعجب ہوئے

لیکن جب زین خاں نے گانا ختم کیا تو ہرن

اور دیگر جانور اپنے اپنے مسکن کی طرف لوٹ گئے

ISMAILI P. PRESS, BOMBAY, 9.

પૈસા પ્રાપ્ત કરવા ઈચ્છનારાઓ માટે ઉપયોગી પાંચ અપુર્વ પ્રકાશનો

●

આ લડાઈના સંજોગોમાં નાણાં કમાવાની અનેક અપુર્વ તકો છે. આ માટેનું માર્ગદર્શન હજીસુધી એકેય પુસ્તકમાં અપાયેલ નથી. તે ખોટ મુંબઈની મેસર્સ એન. એમ. ઠક્કરની કંપની (૧૪૦, પ્રિન્સેસ સ્ટ્રીટ, મુંબઈ ૨) તરફથી બહાર પડેલાં પાંચ પુસ્તકોનો સેટ પુરી પાડે છે.

પ્રથમ પુસ્તક–'હુન્નર ઉદ્યોગ ને વ્યાપાર યાને કોમર્સ એન્ડ ઈન્ડસ્ટ્રીઝમાં, ત્રણ ભાગોની અંદર અનુભવસિદ્ધ કિંમતી પાંચસો પ્રયોગો, દોઢસો માર્ગદર્શક ચિત્રો ને ડીઝાઈનો સાથે સુંદર બોક્સમાં આપવામાં આવે છે. આ પુસ્તકમાંનો એકાદ પ્રયોગ અજમાવી ઘેર બેઠાં પુષ્કળ પૈસા મેળવી શકાય છે. આવા આવા અનેક પ્રયોગો ને યોજનાઓ આ કિંમતી પુસ્તકમાં આપવામાં આવેલ છે.

બીજા પુસ્તક 'ઓલ ઈન્ડીયા મરચન્ટસ ડીરેક્ટરી'માં ઉછળતાં ઉછળતા વેપારીઓનાં ૭ હજાર ઉપરાંતનાં સીરનામાંઓ તેમજ એક્સપોર્ટ, ઈમ્પોર્ટ, ઈન્કમટેક્ષ, પાર્ટનરશીપ એક્ટ, હિંદના દેશી રાજ્યોના સીરનામા, સીનેમાઉદ્યોગની માહિતી વિ. અનેક પ્રકારની વ્યાપારોપયોગી બાબતો સાતસો પાનાની અંદર બે રૂપીયાની સામાન્ય કિંમતે આપવામાં આવેલ છે.

ત્રીજા પુસ્તક 'બીઝનેસ ગાઈડ યાને વેપારી ભોમીયો'માં ધંધાદારી માટે એક્સપોર્ટ, ઈમ્પોર્ટ, બેંકીંગ, હુંડી, અંગ્રેજી-ગુજરાતી ટુંપત્રવ્યવહાર, વ્યાપારના નિયમો વિગેરે પુષ્કળ માહિતીઓ આપવામાં આવેલ છે. તેની કિં. ફક્ત રૂ. ૩) છે.

ચોથું પુસ્તક 'વ્યાપારી નામું'. દરેક ધંધાદારી માટે પધ્ધતિસરના નામાનું જ્ઞાન હોવું આવશ્યક છે. પધ્ધતિસરનું નામું તમારા હજારો રૂપીયા કેમ બચાવી આપે છે ને ઈન્કમટેક્ષમાં કયી રીતે ફાયદો થાય છે તે બધું આ પુસ્તકનાં ચાર વિભાગનાં ૬૨૫ પાનામાં બતાવવામાં આવેલ છે.

પાંચમું પુસ્તક 'વ્યાપારી હિસાબ'નું છે. બાર જુદા જુદા વિભાગો દ્વારા દરેક ધંધાના, બજારના ને દરેક વજનના તોલમાપ મુજબના હિસાબોની સરળ ને સ્હેલી રીતો આપવામાં આવેલ છે. દરેક ધંધાદારીએ, વ્યાપારી પેઢીએ કે ધંધાદ્વારા નાણાં કમાવા ઈચ્છનારે આ પાંચ પુસ્તકોનો સેટ વસાવી સ્હેલાઈથી પૈસા મળવાની યોજનાઓ ને પ્રયોગોનો ઉપયોગ કરવો જોઈએ.

આવા વ્યાપારોપયોગી પ્રકાશનો પ્રગટ કરવા બદલ મેસર્સ એન. એમ. ઠક્કરની કંપનીને અમો ધન્યવાદ આપીએ છીએ.

કૃપા કરી આટલું કરજો

"અલ–ઈસલાહ" ઈદ અંકમાં જાહેરાત આપનારા વ્યાપારિઓ પાસેથી માલ ખરીદ કરતી વખતે "અલ–ઈસલાહ"નું નામ લખવાની કૃપા કરજો.

આંતરડાના રોગનો શક રહે. એ વખતે દાકતરી તપાસ કરાવવી એ સૌથી સારો ઇલાજ છે.

કેન્સર એને છેલ્લે પગથીએ પહોંચે ત્યારે તેનો ખાત્રિપુર્વકનો કંઇ ઉપાય નથી, તેને માટે પ્રથમથી જ ચિકિત્સા કરાવવી અને અટકાવ કરવો જરૂરી છે. વાર્ષિક શારીરિક પરિક્ષા કરાવવી એ પણ અગત્યનું છે, પરંતુ શરીરમાં વજનનો ઘટાડો થાય કે બાંધો માફકસર બને ત્યાં સુધી શારીરિક તપાસ મુલ્તવી રાખવી નહિં. ઉપરની પીડા અને ગાંઠના વિકાસ અથવા લંબાતું કબજીયાતપણું કે જઠરની વ્યાધિ એ બધી શંકારપદ બાબતો તરફ ખાસ કાળજી રાખવી આવશ્યક છે અને દાકતર કેન્સરની શરૂઆત જાણી શકે તેટલા માટે આ બધી બાબતો તેની પાસે રજુ કરવી જોઇએ. શસ્ત્રવિદ્યા, એક્સ-રે અને રેડીયમ એ જ કેન્સરને કાબુમાં લેનારાં જાણીતાં સાધનો છે, તે સિવાય બીજા ઉંટવૈદો જે માર્ગ બતાવે તેના પર ચાલીને મુર્ખ ન બનવું જોઇએ.

અકસ્માત, એ આપણી જીંદગીને હણનાર પાંચમો રાક્ષસ છે. ઘરમાં, ફેકટરીમાં કે રસ્તામાં થતા અકસ્માતનો એમાં સમાવેશ થાય છે. તે માત્ર ઘટતી સંભાળ, લાયકાત અને દીર્ઘદ્રષ્ટિથી દુર કરી શકાય છે.

આવી રીતે મોતનાં ખાસ નવ કારણો આપણી જીંદગીને કે જે એક સદી પહેલાં ઘણી લાંબી હતી તેને અત્યારે એકંદરે યુવાવસ્થામાં ગુંગળાવી મારી નાંખે છે. આવા પ્રાણઘાતક કારણો દુર ન થઇ શકે એટલું કાંઇ આ કઠણ નથી, પણ તે પ્રત્યે આપણી જ બેદરકારી છે. આપણે બધાં સારી તંદુરસ્તી અને સુખી જીવન ગાળવા ઇચ્છીએ છીએ. પણ ખરી રીતે શોખના નામ પાછળ આપણે શું કરી રહ્યા છીએ?

પેટંટ દવાઓ પાછળ વર્ષે દહાડે અમેરીકામાં ૫૦,૦૦,૦૦,૦૦૦ (પચાસ કરોડ) ડોલર ખર્ચાય છે, તેથી ક્યાંય વધારે ડોક્ટરને અપાય છે. જ્યારે બીમાર હોઇએ અથવા ક્યારેક તો સારૂં થવાની આશા પણ ન રહે ત્યારે આપણે ડાક્ટરને બોલાવીએ છીએ. આપણે આવી રીતે કૃત્રિમ ફેશનેબલ જીવનના શોખીન બનીને ખરી તંદુરસ્ત જીંદગી જીવવાનું ભુલી ગયા છીએ.

આપણું જીવન લંબાવવાને તથા તાઝગીભરી તંદુરસ્તી માટે બે નિયમ ખાસ કરીને પાળવા જોઇએ. નાના બચ્ચાંઓની માવજતનાં શિક્ષણનો પ્રચાર કરવો જોઇએ કે જેથી ઓછામાં ઓછી ૧૦ વર્ષ જીંદગી વધી શકે. ઉગતા છોકરા અને છોકરીઓનું દર મહિને વજન કરવું જોઇએ અને તેમાં કાંઇ ફેર માલમ પડે તો તેનાં કારણો શોધી કાઢવાં જોઇએ.

તરૂણ યુવાનોનાં બદનની વાર્ષિક દાકતરીપરિક્ષા કરાવવી જોઇએ અને તેનું વ્યાજબી વજન વધે તે માટે યોગ્ય ખાનપાન, ખુલ્લી હવા, નિયમિત કસરત અને હદ ઉપરાંતના કામનો અટકાવ—કે જે તંદુરસ્તીનાં મુખ્ય અંગો છે, તેનો પ્રબંધ કરવો જોઇએ.
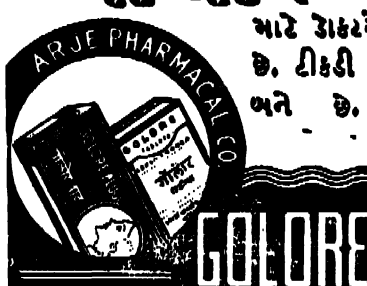
મોતનું આવાહન નિરંતર અને તિક્ષ્ણ છે. તેને હઠાવવાને માટે આપણો પ્રબંધ સાદો છતાં અસરકારક છે અને તેના બદલામાં આપણને શું મળે? આપણું આયુષ્ય જ તો!

હાર્ટફેલ્યર પણ લગભગ આવાં કારણોમાંથી જ નિપજે છે. મગજમાં ધોરીનસના છેડાનો વધુ પડતો ધડકો લાગે અને તેનાથી જે ઝટકો (Shock) લાગે છે, તેથી પણ જીંદગીનો અંત આવે છે. આ પ્રમાણે બીજાં દર્દો જેટલી જ, લોહીના દબાણના કે તેને લગતા બીજાં દર્દોની ગણત્રી થાય છે કે જેને લીધે મરણ નીપજવાનો ભય રહે છે. તો પણ આ કાળ અટકાવી શકાય તેવી છે. આપણી જીંદગીને ટુંકાવનારા તેનાં ખાસ બે કારણો છે. એક રોજની હદ ઉપરાંત મહેનત અને બીજું રોજીંદો અતિ હદ બહારનો આહાર.

જો આ બન્ને બાબતમાં હદ વટાવી જવાની આદત હોય તો આપણાં બદનમાં તેમાંથી ઝેરી ગેસ ઉત્પન્ન થાય છે. આ ઝેરને કાઢી નાખવા માટે હૃદય અને ધોરીનસ વધારે લોહીનો જથ્થો ઉંચકી લ્યે છે એટલે તુરત લોહીનું દબાણ થવા માંડે છે. શરીરનું આખુ મશીન એકધારૂં અટકી પડે છે અને પરિણામે હાર્ટફેલ્યર કે મગજમાં લોહી ચડીને પણ મરણનો ભોગ બનવું પડે છે.

હદ ઉપરાંતનો શ્રમ અને તેને પરિણામે થતાં લોહીનાં દબાણ માટે નિયમિત અને સાવધપણે વ્યવસ્થિત આરામ લેવો એ ઉત્તમ ઉપચાર છે. જમતાં પહેલાં માત્ર થોડા વખત પુરતું સ્વાસ્થ્ય અને શારીરિક વિશ્રામ આ રોગનાં લક્ષણને ખાસ ઘટાડે છે. એટના લાઇફ ઇન્સ્યુરન્સ કંપનીના પોલીસી હોલ્ડર્સ અને કામદારોના ૭૮ કેસોમાંના ૧૫થી ૨૫ ટકાના દર્દીઓને, જમવા પહેલાં નિયમિત આરામ અને યોગ્ય ખોરાકની પધ્ધતિથી સારા કરવામાં આવ્યા હતા.

આહારમાં અતિરેકતાથી આપણી શકિત ઘટે છે એટલું જ નહિં, પરંતુ આપણી પાચનક્રિયામાં ઝેરી ગેસ ઉત્પન્ન થાય છે. આપણે આપણી કેડ અને પેટ ઉપર એક મોટી શીલાનું વજન મુકીએ છીએ. જેમ આપણે જાડા થતા જઇએ તેમ આપણા હૃદય, ધોરી નસ અને ગુર્દા ઉપર વધુ ને વધુ બોજો થતો જાય છે—મોત નજીક આવતું જાય છે. ૩૫ વર્ષની ઉમર પછી જેમ હદ ઉપરાંતનું દબાણ વધે છે તેમ મરણ દર એક રતલ વધુ દબાણે એક ટકો વધુ નજીક આવે છે. જો તમો હમણાં વધુ પડતો ખોરાક લેતા હો તો જ્યાંસુધી શરીરનો બાંધો, ઉંચાઇ અને ઉમર એ ત્રણેય સાથે યોગ્ય માપસરના ન લાગે ત્યાંસુધી હંમેશા ખોરાક થોડો થોડો ઘટાડવો જોઇએ. વ્યાજબી રીતે ખાનપાનમાં ઘટાડો કરવો એ જીવનનું ઉત્તમ રક્ષણ કરવા બરાબર છે.

ન્યુમોનીયાનું નિદાન શરૂઆતના બે કે ત્રણ દિવસમાં થઇ જાય એ ઘણું જરૂરનું છે. તેની ભયંકરતાના મુકાબલે તેનું નિદાન કરવું સરળ છે. સામાન્ય રીતે શરદી થઇ જવાથી અને શરીરમાં એકદમ ઠંડી કે ગરમી (Temperature)નું પ્રમાણ વધી જવાથી ન્યુમોનીયા થાય છે. તેમાં ખાંસી પણ હોય છે અને થુંકના બડખામાં લોહીનો તાંતણો પડે છે, તેમજ ચહેરો ચમકતો લાગે છે. પ્રયોગશાળામાં થુંકનું પૃથક્કરણ કરીને કઇ જાતનો ન્યુમોનીયા છે તે પારખવામાં આવે છે.

૩૦ વર્ષ પહેલાં ક્ષય અને પછીથી "સફેદ મરકી"ને નામે ઓળખાતો એ રોગ, મરણ નીપજાવનાર રોગ તરીકે સૌથી પ્રથમ ગણાતો હતો. અત્યારે તેનું સ્થાન સાતમું છે. અને દિન પ્રતિદિન તે સ્થાન હજી પણ ઘટતું રહેશે. ક્ષયની આધુનિક ચિકિત્સાના શોધક ડોકટર એડવર્ડ એલ. ટ્રુડોના કહેવા પ્રમાણે તેનો સારામાં સારો ઉપચાર એ છે કે દર્દીના રૂમની બારી ઉઘાડી રાખવી, દર્દીએ બિછાનામાં સુતાં જ રહેવું અને સ્વાસ્થ્ય જાળવી રાખવું. આ ભયાનક રોગ સામે દાકતરી કોશીષો ઘણીવાર ફળીભુત થઇ છે છતાં પણ ક્ષય એ ખાસ કરીને યુવાન જીંદગીનો અંત આણનાર રાક્ષસ છે. દરેક છોકરા અને છોકરીઓને ખુલ્લી હવામાં હરવાફરવા અને રહેવાનું શિખવાડવું જોઇએ. તેમ જ કામ કે રમતમાં હદ ઉપરાંતનો શ્રમ વેઠવામાંથી તેમને દુર રાખવાં જોઇએ. જો એક ઉગતું બાળક પોતાની ઉમરનાં પ્રમાણ કરતાં વજનમાં ઓછું હોય તો ખચિત એ એક જોખમ છે. બડખાની પરિક્ષા ઉપરથી દાકતર ક્ષયને અટકાવી શકવા અને તેનો અસરકારક ઇલાજ કરવા શકિતમાન બની શકે છે.

અજીર્ણના સાધારણ હુમલામાંથી અને પેટના સખ્ત દુઃખાવામાંથી 'એપેન્ડીસાઇટીસ'ની શરૂઆત થાય છે. જો આ અસર જણાય તો રેચક પદાર્થનો ત્યાગ કરવો. જો પ્રત્યક્ષ કારણ સિવાય પેટનો દુઃખાવો ફરીને થાય તો

જાણો છો?

પગલાં લેવાં જોઈએ?

“ રૂરિમ ”

… સંતતિની સરેરાશ ઉમરમાં ૩૫ વર્ષથી એક પણ વર્ષ વધારે થતું નથી. ૫૦ અને ૭૦ વર્ષની વચ્ચે જીંદગીનો જે સંભવ એક સદી પહેલાં હતો, તેવો સંભવ આધુનિક દવા અને શસ્ત્રવિદ્યાનાં સાધનો હોવા છતાં પણ અત્યારે નથી રહ્યો. અત્યારે એવું કયું આસુરી બળ છે કે જે આપણી જીંદગીનો અકાળે નાશ કરે છે? તેના ઉપર કબજો મેળવવો એ સૌથી અગત્યની ફરજ છે.

માણસની જીંદગીનો અકાળે અંત લાવનારાં કારણોમાં મુખ્ય નવ કારણો અમેરીકામાં ગણાય છે. હૃદયરોગ, કેન્સર, અંગવિકૃતિ કે મગજમાં લોહીનું ચઢી જવું (Apoplexy), ન્યુમોનીયા, અકસ્માત, ગુર્દાનું દર્દ (Nephritis), ક્ષય, મધુપ્રમેહ (Diabetes) અને આંતરડાનો રોગ (Appendicitis). એટલું તો ચોક્કસ છે કે આવાં દરદોમાંથી કેટલાક કેસો પાંચથી વીસ વર્ષ સુધી વધારે ઉમર લંબાવી શકે છે, અને ઘણીવાર તો કેટલાક કેસો બીલકુલ મોતના પંજામાંથી બચી જાય છે.

મોતનાં મુખમાંથી બચી જવાનો પ્રથમનો ખાસ ઉપાય બીલકુલ સરળ છે. દરેક જણ જાણે છે કે વર્ષમાં એકવાર દાક્તર પાસે પોતાનાં બદનની બરાબર પરિક્ષા કરાવવી એ શારીરિક આપત્તિની સામે વિમો ઉતરાવવા બરાબર છે, પરંતુ ઘણા જ થોડા માણસો આ જાણીતી બાબતનો અમલ કરે છે. એ બાબત માટે ડૉ. એમરસન લખે છે કે, મને અનુભવ છે કે સુખી માણસોમાનાં ૨૦ ટકા જેટલાઓએ તો બીલકુલ દાક્તરી તપાસ કરાવી જ નથી. બાકીનામાંથી ૪૨ ટકા જેટલાઓએ પાંચ વર્ષ થયાં પોતાનું બદન દાક્તરને દેખાડયું નથી. નાનપણથી જ બેદરકારીને લીધે શારીરિક સ્વાસ્થ્યની જાળવણી માટે દાક્તરી તપાસ કરાવવાની કાળજી લેવામાં નથી આવતી.

આપણી ઇંદ્રીઓમાં થતા વિકારની પ્રથમ નિશાની પરથી જ આવી રીતે તપાસ કરાવીને અકાળે થતાં મરણને અટકાવી શકાય છે. દાખલા તરીકે પેશાબમાં સાકરનો ભાગ દેખાય તો દાક્તરને શક જાય છે કે દર્દી મધુપ્રમેહના રોગથી પીડાય છે. આવા કેસમાં ખોરાકની ખાસ કાળજી રાખવી જરૂરી છે. પેશાબમાં સફેદ પદાર્થ કે લોહીનો અંશ માલમ પડે તો ગુર્દા અસરકારક કામ નથી કરતા એ જણાઈ આવે છે. એવી રીતે ટોનસીલ્સ (ગળાનો સોજો), દાંતનો રોગ, હૃદયરોગ કે ગુર્દાના રોગના ખાસ કારણો અને નિશાનીઓ દાક્તરી તપાસ પરથી માલમ પડે છે. ક્ષય અને કેન્સર જેવા હઠીલા દર્દોમાં રક્તવાહિનીઓમાં થતા ફેરફાર એક્સ-રે (X-Ray) સારવારથી જાણી શકાય છે. આવી રીતે શરૂઆતથી જ પગલાં ભરવામાં આવે તો અકાળ મરણને શરણ થવું પડતું નથી.

તમે જીવો

તંદુરસ્ત જીવન જીવવા શાં

લેખકઃ—

જેમ જેમ વખત પસાર થતો જાય છે, તેમ તેમ મનુષ્યની સરેરાશ ઉમરનું પ્રમાણ પણ ઘટતું જાય છે. એટલે મનુષ્યની એકંદર તંદુરસ્તી પણ ઓછી થતી ગઈ છે, એ સ્વાભાવિક છે. ભુતકાળના માનવીના સુડોળ અને બળવત્તર બદનના દ્રષ્ટાંતો આપણને ઇતિહાસો અને શાસ્ત્રોમાંથી મળી આવે છે. તેવા દ્રષ્ટાંતો આધુનિક યુગમાં ક્યાંક જ આપણે સાંભળીએ છીએ અને એકાદ મલ્લરાજનું રૂષ્ટપુષ્ટ બદન જોઈને આપણને ક્યારેક તો નવાઈ થાય છે.

માનવીના મોટા ભાગની પ્રકૃતિ જ એવી હોય છે કે એક નજીવા ગણાતી બાબત તરફ તે બેદરકાર રહે છે, પરંતુ, જ્યારે તે ગંભીર રૂપ પકડે છે, ત્યારે જ તે ચોંકે છે. એની પ્રથમ શરૂઆત પોતાને જ હાથે થઈ છે એટલું ભાન તો ઘણાંઓને નથી હોતું. તંદુરસ્તી ઘટવાનું કારણ એમાંથી જ મળી રહે છે.

આજનો માનવી બાહ્ય દેખાવનું કૃત્રિમ જીવન જીવવામાં બડાઈ માને છે. તેના અપ-ટુ-ડેટ પહેરવેશથી જેટલો તે શોભે છે તેટલો જ એનું નગ્ન બદન જોતાં એ બેડોળ લાગે છે. એને જેટલી એનાં કપડાંલત્તાની કાળજી છે તેટલી એની તંદુરસ્તીની કાળજી નથી રહી.

દરેક બાબતમાં નિયમિતતા એ તંદુરસ્તીનું મુખ્ય અંગ છે, પરંતુ અત્યારનો જીવનવ્યવસાય જ એવો થઈ પડયો છે કે એવી નિયમિતતા કેટલાક નથી જાળવી શકતા, અને ઘણા જાળવતા નથી.

શારીરિક સ્વાસ્થ્ય માટે આપણા દેશમાં એટલી બધી કાળજી લેવાતી હોય એમ નથી લાગતું. ક્યારેક કોઈ મલ્લરાજનો કુસ્તીજંગ હોય ત્યારે એ તરફ લક્ષ ખેંચાય છે અને એ વખતે એવી પ્રવૃત્તિનાં મંડાણ થાય છે, પરંતુ તે કાયમ સુધી એટલી જ અમલી નથી રહેતી. અલબત ક્યાંક આવી પ્રવૃત્તિ છે પણ ખરી, પરંતુ, તેને જોઈએ તેટલું જાહેર પીઠબળ નથી હોતું, એટલે એનો વિકાસ જ રૂંધાઈ જાય છે. આ પ્રવૃત્તિ અમુક કોમ કે એકાદ પ્રાંત પુરતી જ હોવી આવશ્યક નથી પણ દેશવ્યાપક બનવી જરૂરી છે, કારણ કે, પ્રજાનાં અને ખાસ કરીને ભાવિ પ્રજાનાં મનોબળ અને શારીરિક સ્વાસ્થ્ય ઉપર જ દેશોન્નતિનો મુખ્ય આધાર અવલંબે છે.

વીલીયમ આર. પી. એમરસન એમ. ડી. એક વિદ્વાન અને વિખ્યાત અમેરીકન ડોકટર છે. તેણે “તંદુરસ્તીની ચિકિત્સા” ઉપર એક સુંદર પુસ્તક લખ્યું છે. તે કહે છે કે ગત સદીથી માનવીની સરેરાશ ઉમર ૨૦ વર્ષની થઈ છે અને તેનું મુખ્ય કારણ એ છે કે બાળમરણ પ્રમાણ વધતું ચાલ્યું છે. જેટલી

શાળાઓમાં બાળકોને તેનું જ્ઞાન આપવું આવશ્યક છે

જાંગીરજી જીજીભાઈ, એલ. ડી. એસ. સી.

આરસી નીચે ન પડી જાય, પણ એવી જ નાની ખીતીઓ પોતાના બચ્ચાંના મોઢામાં ઢીલી અથવા સડેલી છે કે નહિં તે જોવાની તે કદી પણ દરકાર કરતી નથી.

બાળકોને જો ખરી કેળવણી આપવી હોય, તો તેઓને ફુલેલી તલ્લી કેવી થાય, કેમ થાય, શા વડે થાય, તે સીનેમાદ્વારા બતાવો. આંખનાં દુઃખ-દરદનાં કારણો બતાવો, ક્યાં વાંચવું, કેમ વાંચવું, ક્યારે વાંચવું ને જો નહિં શીખવો, તો પછી તેઓ ભુગોળ, ઇતિહાસ ને "ફીઝીકલ કલ્ચર"નાં ચિત્રો જોઇ ક્યાંથી શીખે? તેઓનાં પોતાનાં પેટમાં શું શું છે, તે બતાવો. હોજરી, આંતરડાં અને કલેજાં બધું સ્ક્રીન ઉપર દેખાડો. વધુ મીઠાસ ખાવાથી પેટમાં કેવા લાંબા કરમ થાય, તે પીક્ચર ઉપર બતાવો. વધુ પડતું ખાવાથી પેટમાં અપચો કેમ થાય, બજારનાં બનાવેલાં ભજીયાં, ચટણી ખાવાથી પેટમાં શું શું નુકશાન થાય તેની તેમને ચેતવણી આપો. તેમને ભુગોળ અને ઇતિહાસ શીખવીએ છીએ, પરંતુ એક આખો ઇતિહાસ તો તેઓનાં પેટમાં જ છે.

અલબત્ત એ આનંદની વાત છે કે, નામદાર આગાખાન સાહેબ તરફથી ઇસ્માઇલી કોમની બાનુઓને શારીરિક તેમ જ સંસારી તાલીમ આપવા ઘણી જ સ્તુતિપાત્ર વ્યવસ્થા કરવામાં આવી છે. હેલ્થ સેન્ટરના બાનુ કાર્યકરો ઘેરઘેર જઇ, ચોક્કસ મોહોલ્લાઓની બાઇઓને ભેગી કરી, સંસારી તેમ જ શારીરિક જ્ઞાન આપે છે. એમો હેલ્થ ક્લીનીકની અંદર કેટલાંક ઉમદા જ્ઞાન ઉપરાંત માતાઓને તેમ જ તેઓનાં બાળકોને મફત દવાદારૂ, તેમ જ દુધ વિગેરે અપાય છે તેમ જ બાળકની મફત સારવાર કરવામાં આવે છે.

અંતમાં હું ઇદના મુબારક દિને એટલું જ ઇચ્છીશ, કે આજના શુભ દિનથી બહેનો જો પોતાનો થોડોક કીંમતી વખત, નિશાળે જતી પોતાની ઉછરતી બાળાઓને શારીરિક શિક્ષણ આપવા પખવાડે વાપરશે, તો અલબત્ત જેમ એક કહેવત છે કે 'કુમળો વાંસ વાળો તેમ વળે' તેમ કુમળાં મગજ ઉપર નાનપણ-થી જ એક સારી છાપ બેસાડવા ઉપરાંત, તેમણે પરમાર્થનું કાર્ય કર્યું કહેવાશે. આવાં એક પરમાર્થી કામમાં આ નાચીઝ લેખિકાની કલમ તેમ જ મદદ કોઇપણ વખતે ઉપયોગમાં આવવા સદાય તત્પર રહેશે.

દંત વિદ્યા:

લેખિકા:—મીસ ઓરશેદ

કોઇ કદાચ એમ સવાલ પુછે કે નિશાળમાં દાંત અને મોઢાંની આરોગ્યતાનું જ્ઞાન આપવાની જે બળામણ કરવામાં આવે છે, તેનું શું કારણ હશે? તો એનો જવાબ એ છે કે નિશાળની દંતપરિક્ષા વખતે ઘણાંક ગંદાં મોઢાં જોવાની તકો મળી છે, અને પુરી ખાત્રી થઇ છે, કે એવાં મોઢાઓને પરિણામે બાળાઓના પતિઓને જ નહિં, પણ તેમનાં સમાગમમાં આવતાં બીજા માણસો તેમજ તેઓનાં પેટે અવતરતાં બાળકોને નુકશાન થાય છે. આ મત ખરો છે કે ખોટો, તેની ખાત્રી કરવા, જેનાં મોઢાના દાંત સડી ગયા છે, અને દાંત પર પથરી જામી છે, તેમજ પારા, લોહી અને પરૂથી ઢીલા પડી ગયા છે, જેનું મોઢું સુકાઇ, સોરાઇ ગયું છે, જેનો ચહેરો મરવા પડેલા માણસથી પે વધુ ફીક્કો બની ગયો છે, એવી એક ભવિષ્યની ઓરત અને માતા થનારી, અભ્યાસ કરતી એક બાળાનું ચિત્ર તમારી સમક્ષ કલ્પો. આવી સ્રીનાં મોઢાં મારફતે તેનો પોતાનો તેમ જ પોતાનાં બાળકનો ખોરાક શરીરમાં પ્રવેશ કરે છે.

જે હઝારો બાળકો નિશાળે જાય છે, તેમની જીંદગી પરથી દોરેલાં એ ચિત્ર પર વિચાર કરો, અને પછી કહો, કે આપણી નિશાળોમાં દાંત અને મોઢાનું જતન કરવાની અને તેની દેખરેખ રાખવાની રૂઢી દાખલ કરવામાં આવે તો તે વાજબી છે કે નહિં. બાળકોનાં ભલાં માટેની માતેબર નેમ બર લાવવી હોય તો તેનો એક જ માર્ગ એ છે કે દંતવિદ્યા શિખવવી અને નિશાળોમાં દાંતની મફત સારવાર કરવાની રૂઢી દાખલ કરવી.

નિશાળે જતાં બાળકોના દાંત જો સડેલા જણાય તો તેમાં વાંક કોનો? નાનાં ઉછરતા બાળકના દાંત જો નબળા, દેખાવમાં પીળા અને કોહેલા, સડેલા હોય, તો તેમાં તે બાળક કરતાં તેનાં માબાપની જ તકસીર વધારે ગણાય. નાનાં બાળકના દાંતની જો બરાબર કાળજી અને જતન લીધાં હોય, તો તેનો ઉછરભાવ, સારો અને મજબુત બને છે. આ નાનાં બાળકોને પોતાના દાંત સાફ કરવાની ઘણી જ આળસ હોય છે. તેમાંયે જો સામે ટેબલ પર પાઉં, મલાઇ કે મરકો પડયાં હોય, તો આ બાળકો પોતાનાં બ્રશને પાણીમાં બોળીને પાછાં ખીલી પર ટાંગી દે છે. એક બાળક દાંત સાફ કરી લે પછી તે જોવા, અને તેને સાફ કરવાની ફરજ પાડવી એ કામ માતાનું છે. માતા આરસી ટાંગવા માટે ભીંતમાં ખીલો ઠોકશે, તો તેને ખેંચીને તાણી જોશે કે રખે ઢીલો ન હોય અને

જગતની પ્રથમ વાર્તા

મુળ લેખકઃ—પંડિત સુદર્શન ● અનુવાદકઃ—પ્રેમાંશુ

[પંડિત સુદર્શન ઉર્દુ–હિંદી સાહિત્યના સિધ્ધહસ્ત ગલ્પકાર છે. એમનાં ગલ્પોમાં કલાસૌષ્ઠવ, વાતાવરણની જમાવટ, પાત્રનિરૂપણ, સંવાદની સ્વાભાવિકતા અને આખાં વસ્તુનું ચિત્રદર્શન કરવાની એમને હાથોટી પડી ગઇ છે. એમની વાર્તાઓમાં સંસ્કાર, મનુષ્યજીવનનું સ્પર્શન, સમાજિકતા અને ચારિત્ર્યની ઉદ્દાત ભાવના ગુંથી લેવામાં આવેલી હોય છે અને વાંચકવર્ગ ઉપર તે પોતાની આછી કે ઘેરી છાયા મુકી ગયા વગર રહેતી નથી. તેઓ વાતોનાં હાર્દને સમજે છે અને વાર્તા કહેવાની કળાને પણ સમજે છે. વાર્તા વિશેનું એમનું દ્રષ્ટિબિંદુ સમજવા તેમનો એક લેખ આપવામાં આવે છે અને તે પછી તેમનું ‘જગતની પ્રથમ વાર્તા’ આલેખતું એક વાર્તાચિત્ર આપ્યું છે. આ બન્ને વસ્તુ સરળ છે છતાં એની સરળતામાં પણ કંઇક રહેલું છે એમ જણાયા વગર રહેશે નહિં. અનુ.]

દુનિયા એ વાર્તા છે. એ વાર્તા સર્જનહારે આલેખી છે. વાર્તા સ્વયં એક દુનિયા છે, જેનું સર્જન માનવીએ કર્યું છે. દુનિયાની વાર્તા અને વાર્તાની દુનિયા બન્ને રસમય અને મીઠી છે. મનુષ્યનું હ્રદય એ બન્ને તરફ ખેંચાય છે. આ બન્નેથી જુદાં પડતાં તેની આંખો શોકનાં ઉનાં આંસુ સારે છે.

દુનિયા ક્યારે સર્જાઇ અને તેનો અંત ક્યારે આવશે, એ કોઇ કહી શકતું નથી. વાર્તા ક્યારે શરૂ થઇ અને તેનો અંત ક્યારે આવશે. એ પણ કોઇ કલ્પી શકતું નથી. દુનિયા અસ્તિત્વમાં આવી ત્યારથી વાર્તા પણ અસ્તિત્વમાં આવી અને દુનિયા રહેશે ત્યાં સુધી વાર્તા પણ રહેવાની.

દુનિયા તેના સર્જનહારની વાર્તા છે. તેનું પાત્ર ‘શયતાન’ પણ છે. વાર્તા મનુષ્યની દુનિયા છે. વિભુવરે દેવતાઓને પણ સર્જ્યા છે. સર્જનહાર પોતાની વાર્તાનાં પાત્રોને સારાંરસાં કૃત્યની સ્વતંત્રતા આપે છે અને એ પાત્રોનાં કામને જોઇને વાર્તાકારની સૃષ્ટિ સર્જાય છે. વાર્તાકાર પોતાની સૃષ્ટિના સૃષ્ટિજનોને વચન અને કર્મની સ્વતંત્રતા આપે છે અને તેમને જોઇને સર્જનહારની દુનિયા શિખામણના પાઠો શીખે છે.

સર્જનહારે દુનિયા એવી ઇચ્છાથી સર્જી હતી કે, તેના સર્જેલા મનુષ્યો પ્રેમ, સુમેળ, શાન્તિ અને પવિત્રતાના રાજમાર્ગ ઉપર ચાલશે અને ચાર દિનનાં ચાંદરણાં જેવી દુનિયા માટે પોતાનાં હ્રદયને અને પોતાનાં હ્રદયની ઉર્મિઓને દુષિત થવા નહિં દે, પરંતુ, પોતાના સર્જકની અસલ ઇચ્છાને તેના સર્જેલા માનવીઓ વિસરી જાય છે, અને પોતાના માટે નવા માર્ગો ખોળી લ્યે છે. છતાં પણ પરિણામે સર્જનહારની જ ઇચ્છા વિજયવંતી રહે છે અને દુનિયામાં સદાચારનો પ્રકાશ પ્રદીપતો રહે છે.

વાર્તાકાર વાર્તા લખવા બેસે છે ત્યારે તે એવા આશયથી લખે છે કે તેની વાર્તામાં અંધારાંનાં આવરણ નહિં હોય પરંતુ, તેનાં કેટલાંક પાત્રો તેની ઇચ્છા વિરૂધ્ધ બળવો જગાડે છે અને પોતાના માટે એવો માર્ગ શોધી કાઢે છે કે, જે પ્રકાશથી આરંભાઇને અંધારાંમાં અદ્દશ્ય થઇ જાય છે. પાપકર્મનાં ઘાડાં અંધકાર છતાં વાર્તાકારનો આશય વિજયવંત રહે છે! અને તેની વાર્તામાં આત્માનો પ્રકાશ ઝળકી ઉઠે છે.

દુનિયામાં દુષ્ટ મનુષ્યોનું અસ્તિત્વ છે પરંતુ દુનિયાનો હેતુ દુષ્ટતામુલક નથી. એવી રીતે વાર્તાનાં કેટલાંક પાત્રો ‘દુષ્ટ’ હોય છે છતાં વાર્તાનો હેતુ દુષ્ટતાને આકર્ષક બનાવવાનો કે તેને પ્રાધાન્ય આપવાનો હોતો નથી. કેટલાંક મનુષ્યોની ઇચ્છાશક્તિ નિર્બળ હોય છે. તેઓ દુનિયાનો દુષ્ટાચાર જોઇને દુનિયાને ધૃણાની દ્રષ્ટિએ જોવા માંડે છે અને જંગલમાં અને માનવી નિવાસથી દુર જઇને ‘દુનિયાનો તેમણે ત્યાગ કર્યો છે’ એમ સમજે છે, પરંતુ, એ માત્ર તેમનો ભ્રમ જ હોય છે. તેમનું શરીર, તેમની હસ્તી અને તેમનો આત્મા દુનિયાનો એક અવિભક્ત ભાગ જ છે. પોતાનાં શરીર, પોતાની હસ્તી અને આત્માનો તો કોણ ત્યાગ કરી શકે છે?

કેટલાક શુભવૃત્તિના માણસો વાર્તામાં આલેખેલી દુષ્ટ સૃષ્ટિને જોઇને વાર્તાને પડતી મુકે છે અને વાર્તાનાં પુસ્તકો વાંચવાં બંધ કરી એમ સમજવા લાગે છે ‘હવે આપણે વાર્તાને આપણાં જીવનમાંથી હડસેલી દીધી છે.’ એમાં માત્ર એમની દ્રષ્ટિનો જ દોષ છે. તેમનાં પોતાનાં જીવન અને વાર્તાનાં પાત્રોનાં જીવનની એકએક ઘટના સ્વયં જ એક વાર્તા છે. મનુષ્ય જીવે ત્યાં સુધી તેને પોતાનાં જીવનથી કેમ દુર કરી શકે?

મનુષ્ય બચ્ચું હોય ત્યારે તે મોટાઓની વાર્તાઓ સાંભળે છે. તે વૃધ્ધ થઇ જાય છે ત્યારે નાનાઓને વાર્તાઓ સંભળાવે છે. તે મરણ પામે છે ત્યારે પોતે જ વાર્તા બની જાય છે.

માત્ર આટલું જ કહેવું પુરતું નથી.

આ દુનિયા પણ વાર્તા છે! વાર્તાકાર પણ વાર્તા છે! સર્જનહાર પોતે પણ એક વાર્તા જ છે.

સર્જનહારે દુનિયા સર્જી અને દુનિયાની વાર્તા આરંભાઇ. દુનિયાની પહેલી વાર્તા તે આદમ ને હવ્વાની વાર્તા! એ વાર્તામાં જીવન હતું અને એ જીવનમાં વાર્તા હતી!

સર્જનહારે દુનિયાના પહેલા પુત્ર આદમ અને દુનિયાનાં પ્રથમ પુત્રી બીબી હવ્વાને પોતાની આજ્ઞાનો ભંગ કરતાં જોતાં તેને દુઃખ ઉપજ્યું અને તેણે એ બન્ને ગુનેહગારોને સ્વર્ગનાં–ઇદનનાં ઉપવનથી બહાર કાઢી મુક્યાં.

આદમ ને હવ્વા ચોમેર જોતાં હતાં અને પોતાની મુર્ખતા પર પશ્ચાતાપ કરી ઠંડા નિશ્વાસો ભરતાં હતાં. એ સૌરભભર્યા સમીર! એ ચન્દ્રકિરણોમાંથી ભીંજાયલી રવિશો! એ ફુલડાંની વસત! એ સરિતાઓનું સુધાજલ! એ સ્વચ્છ વાયુના ઝોકા!—એ સઘળું ક્યાં હતું? સંધ્યાના ઘેરાતા પડછાયામાં બન્ને–પુરૂષ ને સ્ત્રી–એક ખડબચડી શિલા પર બેઠાં હતાં. તેમનાં અશ્રુઓ કટંક સ્વરૂપે ઉગી નીકળવા ભુમિની તરસી માટી પર વહી રહ્યાં હતાં. આ એક પહેલવહેલો જ પ્રસંગ હતો, જ્યારે સંધ્યાનાં નીલવર્ણા આકાશે દુનિયામાં કોઇ પ્રાણધારીઓને રડતાં જોયાં હતાં.

સહસા હવ્વા પોતાનાં સ્થાનેથી ઉઠયાં ને આદમ પાસે આવી બેસી ગયાં. તેમણે આદમનાં ઉદાસ મુખારવિંદને પોતાનાં સ્વરૂપવાન હસ્તે પંપાળી તેમને ઉઠાડયા, અને પોતાનાં હ્રદયે ચાંપ્યા. આદમનો વહેતો અશ્રુપ્રવાહ તેમની આંખોમાં સુકાઇ ગયો—એવી ઠંડક, એટલી સુકુમારતા સ્વર્ગ—નંદનનાં ઉપવનનાં કોઇપણ ફુલે, કોઇ પાંદડીયે કે કોઇ ફળમાં નિરખી નહોતી!

પરંતુ, હવ્વાની આંખોમાં ઉન્હાં આંસુઓ અને તેમના હોઠે અદ્યાપિ ઠંડા નિશ્વાસો હતા. આદમે પોતાની મોટીમોટી આંગળીઓ તેમના ઝીણા રેશમી શ્યામવર્ણના વાળ પર ફેરવી પોતાની હાસ્યવેરતી આંખો તેમની રડતી આંખો સાથે મેળવી અને દુનિયાની પહેલી અધીરતાએ તેમને ચુમ્બન આપ્યું. હવ્વાનો શોક તેમને હોઠે વળગી ગયો—એવું માર્દવ, એવું આકર્ષણ, સ્વર્ગનાં દુધ, મધ કે અમૃત, કોઇપણ વસ્તુમાં નહોતું.

હવે તેઓ બન્ને સ્ત્રી પુરૂષ નહોતાં—પ્રેમી, પ્રેમીકા હતાં. ચોમેર રાત્રીની નિસ્તબ્ધતા પ્રસરેલી હતી. એ રાત્રિમાં પ્રેમના બે દીપક પ્રકાશતા હતા. ચોમેર શાન્તિનું વાતાવરણ જામ્યું હતું. એમાં પ્રેમના બે મદભર્યા સરોદ ગુંજી રહ્યા. આ પહેલવહેલો જ પ્રસંગ હતો, જ્યારે આકાશે દુનિયામાં પ્રેમકવિતાઓને વિકસિત બનતી જોઇ.

PANNA IN NEW THEATRES' DOCTOR

VIMAL SARDESAI and USHA MANTRI
in
BRILLIANT PICTURES LTD'S
" MUNICIPALITY "
ISMAILI P PR'SS, BOMBAY

HAPPY NEWS

CHEAPNESS & QUALITY COMBINED

Economy is the talk of the day! If . you want to effect real economy and not a delusive saving, ' visit......

KHOJA DAYABHAI J. THARU TYREWALLA

Opp. Pannalal Terrace, Lamington Road, Grant Road, BOMBAY, 7

For old and new Tyres Tubes and other Requisities of Motors, Buses and Lorries of every kind...Old Motores and Motor Cycles also avialable for sale at reasonable prices. Also Tyres of Bullock Carts Tangas Hand carts with axles, hubs and wheels for use on uneven grounds and hard road.

YOUR VISIT IS EARNESTLY SOLICITED
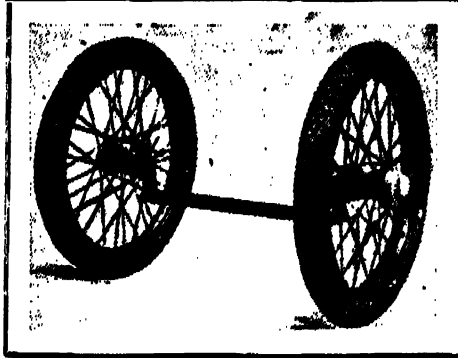
ખુશ ખબર

ચાલુ કરકસરના જમાનામાં નવીન શેાધ

અમારે ત્યાંથી દરેક જાતની મેાટરેાના, મેાટર લેારીઓનાં તેમજ બસેા વગેરેનાં ટાયરેા તથા ટયુબેા, નવા તથા જુના તેમજ જુની મેાટરેા તથા મેાટર સાઈકલેા કીફાયત ભાવે મળશે.

— એ ઉપરાંત —

બલેાક કાર્ટ, ટાંગા, હાથ ગાડી વગેરેના ટાયરેા પણ “એક્ષેલ” “હબ” “વીલ” સાથે તૈયાર મળશે, જે કેાઇપણ ટેકરાઓવાળી અથવા તેા ઉંચી નીચી જમીન પર સહેલાઇથી ચાલે છે.

એક વખત પધારી ખાત્રી કરવા ખાસ વિનંતી છે.

ખોજા ડાહ્યાભાઇ જે. થારૂ ટાયરવાલા

ઠે૦ લેમીંગટન રેાડ, પન્નાલાલ ટેરેસની સામે,
ગ્રાંટરેાડ, મુંબઇ નં. ૭

હરસ મસા

ની મહા ભયંકર–પેાકે પેાક રેાવડાવનારી–અસહ્ય પીડાથી તમારે ૨૪ કલાકમાં મુક્ત થવું હેાય તેા એકવાર અમારી દેશી વનસ્પતિ-માંથી બનાવેલી અત્યંત અકસીર દવા અજમાવી જુએા. ૧૦૦ એકસેા ટકા આરામની ગેરંટી સાથે દવા આપવામાં આવે છે. તમારા હરસ મસા ગમે તેવા જુના કે નવા, દુઝતા કે સુકા હેાય ને બીજી કેાઇ પણ દવાથી ન મટયા હેાય તેા અમેા તેને જડમુળથી નાબુદ કરી આપીશું. ગમે તેવા ધેાધમાર વહેતા લેાહીને એકજ દિવસમાં પડતું બંધ કરી દેવાની તાકાત અમારી દવા ધરાવે છે. મળવાના પૈસા પડતા નથી, જરૂર મળેા.

●——●

બંધ માસીક માંદગીનેા

સચેાટ ઇલાજ ૨૪ કલાકમાં ગુણ આપે છે.

ૠતુ દર્શન કિં. ૪–૧૫–૦

●——●

નર-નારાયણ ઔષધાલય

મારૂતી નિવાસ, ખેતવાડી મેનરેાડ, મુંબઇ
ટેલીફેાન નં. ૪૦૧૨૦

કેક્ષ્ટન કેમીકલ વર્કસનું

કાઉ ટુથ પાવડર

તમારા દાંતને સુંદર અને ચકચકીત બનાવે છે.

●

વેલેાકસ પાવડર

તમારા ચહેરાની ખુબસુરતી વધારવા માટે વાપરેા

દરેક ઠેકાણે મલશે.

CAXTON CHEMICAL WORK'S.
LUCKY MANSION.
MOHAMEDALI ROAD. BOMBAY. NO 3.

સ્ટેાકીસ્ટ:–કરીમભાઇ મહમદઅલી દાહેાદવાલા, સુતારચાલ
અબ્દુલકાદર અમીરૂદ્દીન એન્ડ બ્રધર્સ અબ્દુલ રહેમાન સ્ટ્રીટ

"તો પછી બીજો રસ્તો પણ છે......"

"તે શું?"

"જો, હું મ્હારા પિતાની તીજોરીમાંથી એક હજાર રૂપીયાની રકમ ચોરીને લાવ્યો છું, તે લઇ તું અત્યારે જ દૂર દેશાવર ચાલી જા, આ રૂપીયા વડે તું હારૂં અને ભવિષ્યમાં જન્મ પામનારા બાળકનું પોષણ કરજે, મ્હને અને આ શહેરને તું હંમેશ માટે ભુલી જજે."

"ન જોઇએ, એ ચોરીના રૂપીયા પણ મ્હારા માટે હરામ છે. એક તો તેં મ્હને વ્યભિચારિણી બનાવી હવે મ્હને ચોર પણ બનાવવા છે?"

"તો પછી શું કરવું......"

"મ્હારી સાથે લગ્ન કરવાં......"

"એ કદી પણ બનનાર નથી," તે બોલ્યો: "એક શ્રીમંત પુત્ર પોતાનાં લગ્ન નોકરડી સાથે કરે તે કેમ બને?"

"ઇસ્લામ મઝહબમાં તો સમાનતા છે, ઉંચ નીચના ભેદ નથી."

"તે આ દિલ કબુલ કરતું નથી."

"તું ગુનેહગાર છે, સંગદિલ છે, કાફર છે......" મેં કહ્યું. તે કંઇપણ ન બોલતાં મ્હારા પગ પાસે પડીને રડવા લાગ્યો.

"તો પછી આ ઝહેર પી હું મ્હારાં જીવનનો અંત લાવું છું." થોડી વારે તે રડતાંરડતાં બોલ્યો: "હું ગુનેહગાર છું, જેથી મ્હારે મરવું જોઇએ."

"તું જીવતો રહે;" મેં તેની દયા ખાતાં કહ્યું; "હું ત્હારી આબરૂ બચાવવા આ શહેર અત્યારે જ છોડી જાઉં છું—અને પછી તેના રૂપીયાની પણ દરકાર કર્યા સિવાય, હું તેજ રાત્રે શહેર છોડી ચાલી ગઇ." ભિખારણે પોતાની જીવનકથા આગળ લંબાવતાં કહ્યું, "ત્રણ ચાર માસ હું એક પછી બીજા શહેરમાં ભટકી. મ્હારાં અંગ ઉપર દાગીનો હતો, તે વેચતાં જે રૂપીયા મળ્યા હતા તેનાથી હું મારૂં ગુજરાન કરતી હતી.

થોડા માસ પછી જ્યારે આ બાળકનાં જન્મનો વખત નજીક આવ્યો ત્યારે એક શહેરમાં હું મકાન ભાડે લઇને રહી, એક વૃધ્ધ ચાકરડીને પણ રાખી.

બાળકના જન્મ પછી છ માસ હું ત્યાં જ રહી. પછી બીજે ગામ જતાં રસ્તામાં મ્હારી બચેલી રકમ ચોરાઇ ગઇ. હું ભિખારણ બની અને આજ દશ વરસ થયાં હું ભીખનો જ ધંધો કરૂં છું, અને આપ સખી દિલગુર્દા મુસ્લિમોની દયા ઉપર જીવું છું અને મ્હારા બાળકને પણ જીવાડું છું. એક વાત ખુદાને શાહેદ રાખીને કહું છું કે, હું ભિખારી હાલતમાં પણ પવિત્ર જીવન જીવી છું; મ્હારી જાતને અને મઝહબને હીણું લાગે એવું એક પણ કૃત્ય મેં કર્યું નથી..."

"હવે ત્હારો શું ઇરાદો છે?" કથા પુરી થતાં કાસીમે પ્રશ્ન પુછ્યો: "જેણે તારાં જીવનની ખાનાખરાબી કરી એ શેઠના છોકરાને ત્હારે મળવું છે?"

"મળવાથી શું ફાયદો છે?" તે ઓરત બોલી: "તે મ્હને ઉભી પણ નહિં રાખે..."

"એમ કેમ માની શકાય...?"

"અરે! જો મ્હારો સ્વીકાર કરવો હોત તો, મ્હને ઘરમાંથી દુર કરત?"

"કદાચ પાછળથી તેને પસ્તાવો થયો હોય, તેનો હૃદયપલ્ટો થયો હોય તો બનવાજોગ છે કે, ત્હારો તેમ જ બાળકનો સ્વીકાર કરે..."

"હું નથી માનતી..."

"છેક આશા મુકી દેવા જેવું નથી, કારણ કે તેણે ત્હને કાઢી મુકી, ત્યારે તેનાં માબાપ જીવતાં હતાં, તે પરતંત્ર હતો. અત્યારે તેનાં માબાપ બેહસ્તનશીન થયાં છે, તે સ્વતંત્ર છે."

"શું તેણે લગ્ન કર્યાં નથી?"

"મેં વાત સાંભળી છે કે, હજી તે કુંવારો છે." કાસીમે કહ્યું; "ઠીક છે, એ તો કહે, ત્હારૂં નામ શું છે?"

"મેં મ્હારૂં નામ દસ દસ વર્ષ થયાં કોઇને કહ્યું નથી, આપને પણ કહેવા ઇચ્છતી નથી......"

"ન કહે તો કંઇ નહિં, હું ત્હારૂં નામ જાણું છું......"

"જાણો છો?"

"હા, ત્હારૂં નામ શરીફા છે......"

"બરાબર છે."

"તે મ્હને ઓળખ્યો?

"ના."

"શરીફા! હું જ ત્હારો ગુનેહગાર ખાવિંદ, ત્હારાં જીવનને બરબાદ કરનાર કાસીમ છું. ત્હારા ગયા પછી હું દુઃખી જીવન જીવું છું. ત્હારા ગયા પછી બીજે જ વરસે મેં પણ માતા-પિતા ગુમાવ્યાં. ત્હારી ગામેગામ મેં શોધ ચલાવી. હજી સુધી ત્હારી રાહમાં હું કુંવારો છું. હું ત્હારો અને બાળકનો અત્યારે જ સ્વીકાર કરૂં છું. મ્હારી બાપોની મિલ્કતનો વારસ આ બાળક છે. તું મ્હારી સાચી અને પવિત્ર બોહરદાર છે. શરીફા! હું ત્હારો ગુનેહગાર છું. મ્હને માફ કર," કાસીમે શરીફાના પગ પાસે માથું મુકતાં કહ્યું. બન્નેની આંખમાં હર્ષના આંસુ આવ્યાં.

અત્યાર સુધી દુર બેસીને સારંગી સાથે ખેલ ખેલી રહેલા બાળકે તરત જ શેઅર શરૂ કર્યો.

"ઇદકા દીન હુએ ગલે
આજ લગાલે જાલીમ;
રસ્મે દુનીયા ભી હુએ,
મૌકાભી હુએ, દસ્તુરભી હુએ.

બાળકનો મોકા પરનો શેઅર સાંભળી દશ દશ વરસથી વિખુટાં પડેલાં બે દિલ ભેટી પડયાં અને પછી ત્રણેનાં જીવન હંમેશ માટે સુખી બન્યાં.

(સંપૂર્ણ)

"પરવરદેગાર આપનું ભલું કરે," જમ્મા પછી બંન્નેએ આશિષ આપતા કહ્યું.

"આમીન" કાસીમે જવાબ આપ્યો. ખાલી વાસણો લઇ નોકર હવેલી તરફ ગયા પછી તે ઓરતથી થોડે દુર જમ્મા બેતાં કાસીમે પુછ્યું, "મને મહેરબાની કરીને કહો કે, તમે ક્યાંથી આવો છો, કોણ છો?"

"અમારાં દુઃખી જીવનની કહાણી સાંભળવાથી આપને કંઇ લાભ થનાર નથી, ઉલ્ટું આપ પણ દુઃખી બનશો"

"ઓ અજાણી ઓરત! મ્હારી ફિકર ત્હારે કરવાની નથી, કહે, ત્હારો ઇતિહાસ ટુંકમાં મ્હને કહે, હું તને જરૂર મદદ કરીશ......"

"ભલે સાંભળો, તે ઓરતે બુરખો સરખો કરતાં કહ્યું; "આજે પ્રથમવાર હું મ્હારો દસ વરસનો ઇતિહાસ રજુ કરું છું."

અને પછી એ ભિખારણ ઓરતે પોતાની કહાણી નીચેના શબ્દોમાં શરૂ કરી.

"બારેક વરસ પહેલાં જ્યારે મ્હારી ઉમ્ર પંદર વરસની હતી ત્યારે મ્હારા જન્મદાતા માતા પિતા, પ્લેગના ભયંકર રોગથી આ શહેરમાં મરણ પામ્યાં. મ્હારી માતા આ શહેરના એક અબ્દુલકરીમ શેઠને ત્યાં, ઘરકામ કરતી હતી. ન્હાનપણમાં હું પણ ઘણીવાર એ શેઠને ત્યાં મ્હારી માતા સાથે જતી. મ્હારી જ ઉમરનો એ શેઠનો એકનો એક બેટો હતો. અમે બન્ને ઘણીવાર સાથે રમતાં, હસતાં, બોલતાં......!

માતા પિતાનાં મરણ પછી, દુનીયામાં મ્હારૂં કોઇ સગું રહ્યું નહિં, તેથી અબ્દુલકરીમ શેઠ અને તેની બધી મહોરદારે મ્હને દીકરી તરીકે માની, પોતાના ઘરે આશ્રય આપ્યો. હું ત્યાં ખાતી, પીતી અને રહેતી.

શેઠના છોકરાએ વખત જતાં મ્હારી સાથે ગાઢ મિત્રાચારી કરી. અમે બન્ને વચ્ચે પ્રેમ પ્રગટયો. થોડા વખત પછી એ પવિત્ર પ્રેમે અશુધ્ધ બનીને વાસનાનું રૂપ ધારણ કર્યું.

શેઠના છોકરાએ મ્હારા ભોળપણનો પુરેપુરો લાભ ઉઠાવ્યો, પરિણામે મ્હારી જીંદગી શરમ ભરેલી બની. તેના કહેવાથી હું સમજી શકી કે, છ માસ પછી હું એક બાળકની માતા બનીશ.

આ હકીકતથી મ્હારાં જીવનની મજા ઉડી ગઇ. ખાવું, પીવું અને ઉંઘવું મ્હારા માટે હરામ થઇ પડ્યું. આ વાતની મ્હારા શેઠ શેઠાણીને જાણ થશે તો શું થશે? તેઓ શું કહેશે? એવા વિચાર આવતા હું ઘણીવાર છુપી રીતે ધ્રુસકે ધ્રુસકે રડતી.

એક રાતની વાત છે, જ્યારે હું મધરાતે મ્હારા ઓરડામાં, એકલી પથારીમાં બેસીને, મ્હારાં માતા, પિતા અને હાલતને યાદ કરીને રડતી હતી, ત્યારે તે, શેઠનો છોકરો ધીમે પગલે મ્હારા ઓરડામાં આવ્યો. હું કંઇ બોલું તે પહેલાં તેણે જ વાત શરૂ કરી; "આમ કેટલા દિવસ તું રડશે?"

"જ્યાંસુધી મ્હોતના ફિરીસ્તા મ્હારી રૂહ કબ્જ કરશે ત્યાંસુધી..."

"દુઃખી લોકોને મ્હોત મળવું પણ મુશ્કેલ હોય છે..."

"તો પછી મ્હારા માટે શું રસ્તો છે?" મેં પુછ્યું.

"ત્હારા માટે બે રસ્તા છે પ્યારી!" તે બોલ્યો. "અને એ બંન્ને રસ્તાના સાધનો હું મ્હારી સાથે લાવ્યો છું."

"તે શું?"

"લે આ એક સાધન," તેણે મ્હારા હાથમાં એક નાની શીશી આપતાં કહ્યું; "આ શીશીનું પ્રવાહી તું પી જા. જેથી ત્હારી અને મ્હારી આબરૂ બચી જશે. ત્હારૂં આસાનીથી મ્હોત થશે......"

"શું હું આપઘાત કરૂં?"

"અલબત્ત, બીજો રસ્તો નથી......"

"ઓ વિષયના કીડા!" મેં જરા ગુસ્સામાં આવીને કહ્યું; "મઝહબે ઇસ્લામમાં આપઘાત જેવું કોઇ મોટું પાપ નથી......"

ગુનેહગાર ...

... સ્ત્રીની હૃદયવેદનાનું દર્દભર્યું ચિત્ર

:: લેખક ::

મસ્ત વઝીર

(૧)

પવિત્ર રમઝાન માસનો આજે છેલ્લો દિવસ હતો. સાંજે આસમાન ઉપર હિલાલે ઈદ નમુદાર થયો. મુસ્લીમ પુરૂષો, સ્ત્રીઓ અને બાળકોમાં ખુશાલીના પુકારો થયા, આખા શહેરમાં આનંદનું મોજું ફરી વળ્યું.

મસજીદો અને શ્રીમંતોની હવેલી ઉપર રંગબેરંગી ચેરાગો પ્રગટ્યા. કોઈ સ્થળે પરવરદેગારની શુક્ર ગુઝારી તો કોઈ સ્થળે ગાનતાન શરૂ થયાં.

શહેરના એક શ્રીમંત યુવાન કાસીમે પણ 'ઈદની રાત'ની મોટી ખુશાલી ઉજવવા નક્કી કર્યું હતું. ઘણાં દોસ્તોને આજે તેણે ખાણાં ઉપર નોતર્યા હતા. ખાણાં પછી ગાનતાનનો જલ્સો પણ થનાર હતો.

× × × ×

રાત્રિના દસેક વાગ્યાનો સમય થયો. કાસીમને ત્યાં ગાનતાનનો જલ્સો પુરબહારમાં ચાલી રહ્યો હતો. તે સમયે એ ગાનતાનના ગાઢ અવાજને ભેદીને બહારથી આવેલો સારંગીનો કરૂણ સ્વર સર્વના કાને અથડાયો. સર્વે અજાયબી સાથે બહાર ગેલેરી તરફ જોવા લાગ્યા.

રસ્તા ઉપર ઉભો રહીને સારંગી વગાડનાર એક દસેક વરસની ઉંમરનો કમસીન ભીખારી બાળક હતો. અંધકારમાં પણ તે બાળકની ખુબસુરતી છુપી રહેતી નહતી.

થોડીવારે સારંગીના સુરમાં મસ્ત બનેલા એ બાળકની નજર, ગેલેરીમાંના પ્રેક્ષક વર્ગ તરફ પડી. કંઈક મળશે એ આશાએ તેણે પોતાના કોમળ કંઠથી ગાવાનું શરૂ કર્યું.

“તુમ્હારે યહાં બજે બાજા,
હમારે હાથ ઝોલી હુએ;
હમારા પેટ જલતા હુએ,
તુમ્હારે ઘરમે હોલી હુએ.”

“અહાહા! કેવા કરૂણ શબ્દો!” શેઅર સાંભળી કાસીમથી બોલી જવાયું. તેની આંખો પણ અશ્રુભીની થઈ. ગનાર બાળકે એક બીજો શેઅર ઉપાડ્યો.

“અપને ભી તો હોજાતે હુએ
બેગાને બુરે વકત;
અફસોસ હમારેભી,
હમારે નહિ હોતે.”

એ ભિખારી બાળક વધુ શેઅર બોલવા જતો હતો તેવામાં ઉપરથી કાસીમે આવી તેને આગળ બોલતાં અટકાવતાં કહ્યું: “બસ કર બેટા! ત્હારા કરૂણ શબ્દો, મારૂં દુ:ખી દિલ બરદાસ્ત કરી શકશે નહિં. લે આ રૂપીયો, જા ઘેર જા, બેટા......”

“મુસાફીરોને વળી ઘર કેવું હોય સાહેબ!” એ બાળકે રૂપીયાવાળો કાસીમનો હાથ પાછો ઠેલતાં કહ્યું; “એક રૂપીયાથી મારી જરૂરીયાત મટી શકે એમ નથી. આવતી કાલે ઈદ છે. મ્હારી પાસે પહેરવા કપડાં નથી. મ્હારી પ્યારી અમ્માએ તો, ખોરાકના અભાવે બે દિવસથી માત્ર પાણી પીને રોઝો ઈફતાર કરેલ છે. આજે તો બિચારી ભુખને લીધે એટલી બધી અશક્ત થઈને પડી છે કે, જીવનમાં પહેલી જ વાર મ્હારે એકલા ભીખ માંગવા નીકળવું પડ્યું છે.

“ખરેખર તમારી હાલત બહુ જ દયાજનક છે.” કાસીમે આંખમાં આવેલા અશ્રુપ્રવાહને રૂમાલથી રોકતાં કહ્યું.

“હાલમાં તમે ક્યાં રહો છો?”

“આ શહેરના છેડે આવેલા મુસાફીરખાનામાં, આજ સાંજે જ આવીને રહ્યાં છીએ...

“ઠીક છે.” થોડીવાર વિચાર કર્યા પછી કાસીમે કહ્યું: “તું સામેના બગીચા પાછળ ઉભો રહે. હું મહેફિલને બરખાસ્ત કરી, જરૂરી મદદ લઈ ત્હારી અમ્મા પાસે રૂબરૂ આવું છું...”

“આપનો અહેસાન” બાળક બોલ્યો અને પછી બગીચા તરફ ચાલતો થયો. કાસીમ મકાનમાં ગયો.

(૨)

રાત્રિના અગિયાર વાગ્યા છતાં ઈદની ખરીદી કરનારા લોકોથી વહેપારી બજાર ગાજીગાજી રહ્યું હતું. તે સમયે લોકોની ભીડ ચીરી ત્રણ જણા બહુ જ ઉતાવળે પગલે આગળ જઈ રહ્યા હતા. આગળ કાસીમ અને ભિખારી બાળક હતો, જ્યારે પાછળ એક નોકર ખાણાંનો થાળ ઉપાડીને ચાલતો હતો. થોડી વારે ત્રણે જણા મુસાફીરખાનાના દરવાજા પાસે આવી પહોંચ્યાં.

ભુખથી અશક્ત બનેલી એ બાળકની ખુબસુરત અમ્મા, પોતાના પુત્રની રાહમાં અધીરી બની દરવાજે ઉભી હતી. “બેટા! અત્યાર સુધી ક્યાં હતો!” તેણે પુછ્યું.

“અમ્મા! આ શેઠ આપણા માટે ખાણું લાવ્યા છે......”

“એ કોણ છે?”

“એ ઓળખાણ હું પછી આપીશ.” કાસીમ વચ્ચે બોલ્યો; “પ્રથમ તમે જમી લ્યો, પછી આપણે વાતો કરીશું......”

ઓરત વધુ કંઈ નહિં બોલતાં, પોતાના બાળકનો હાથ પકડી, અંદર પોતાનાં રહેઠાણના સ્થળ તરફ ચાલી, કાસીમ અને નોકર તેની પાછળ ગયા.

લેખકના અંગત ક્ષોભ અને અનુભવને લગતા વિષયની પસંદગી કરવી અનિચ્છનીય છે. કળાકાર ચિતક્ષોભ અથવા વેદનાથી લખતો નથી, એનો અંગત સંપર્કથી અળગો થઈ, અને વાચકો પર પડતી છાપની વાત કરીએ તો અંતરજ્ઞાન દ્રષ્ટિએ, સર્જે છે. કળાકાર થવા માટે સઘળા પ્રકારની લાગણીથી રંગાવું એટલું જ નહિ પરંતુ સઘળું સમજવું પણ જોઈએ; કળાકારની મર્યાદા પોતે જે અનુભવ્યું હોય તે સમજાવવામાં સમાઈ જતી નથી. ઘણાખરા વિવેચકોએ એ સ્વીકાર્યું છે કે, બહિર્મુખ કળા અંતર્મુખ કળા કરતાં મહદતર છે, કારણ કે બહિર્મુખ કળામાં સર્જક અળગો રહીને સ્વરૂપ ઘડતર પર વધુ લક્ષ આપી શકે છે. અંતર્મુખકળામાં તે જાતે જ સંડોવાયલો હોઈ, દ્રષ્ટિભાન ગુમાવી દે છે. શેકસપિયર કે મિલ્ટન એટલા માટે મહાન છે કે શેકસપિયર જાતે ઇયાગો (Iago) જેવો બન્યા વિના ઇયાગો સર્જી શકે છે, અથવા મિલ્ટન સેતાન બન્યા વિના સેતાન સર્જી શકે છે.

અંતર્મુખ વસ્તુઓને બહિર્મુખ બનાવવી એ કળાની સમસ્યા છે. લેખક પોતાના વિષયમાં પરોવાયલો હોય છે કારણ કે તેણે નિહાળેલાં જીવનનું પોતાની દ્રષ્ટિએ દર્શન કરાવવાનું હોય છે. માનવીનાં અંગત જીવનમાંથી સઘળા માનવીનાં જીવન દર્શાવતી મુર્તિ ઘડી કાઢવી એ કળાની સમસ્યા છે. તેથી લેખક પોતાનાં માધ્યમનો સ્વામી હોવો જોઈએ. જો લેખક સુગમ્ય થવાની આવશ્યકતાની અવગણના કરે, તો તેની પોતાની જ અવગણના થવાની તેણે ફરિયાદ ન કરવી જોઈએ. તત્કાળ ચિત્રમાં ઉતારી શકાય એવું દ્રશ્યનું વિગતવાર વર્ણન કરવું લેખકને મુશ્કેલીભર્યું જણાય છે. તે લક્ષણોની સુચિ દ્વારા કલ્પનાને છેતરવાની હિંમત કરી શકતો નથી, અને હલનચલન, ઉપમા, આરોપણ સરખામણી, સુચન અને અન્ય સાહિત્યક પ્રયુક્તિઓ પ્રતિ વળે છે, જે દ્વારા શબ્દો કલ્પનાને અસર કરે છે, અને દ્રશ્ય સંયોજન તેને સહાય કરે છે. તે કદી દ્રશ્યનું આલેખન કરતો નથી, કારણ કે તે લેખક છે; તે પોતાના સાધનો વડે તેનું સર્જન કરે છે, અને એનો હેતુ હંમેશાં વાચકને મંત્રમુગ્ધ કરી તેનો સ્વીકાર કરાવવાનો હોય છે.

કલા મુખ્યત્વે કરી સૈાંદર્ય સાથે સંકળાયેલી હોય છે. સૌંદર્ય કદી સંપ્રમાણતા વિના અસ્તિત્વ ધરાવી શકતું નથી. ભવ્યતા વિરૂપ હોય, સૈાંદર્ય કદી નહિં. સેતાન ગુનાની વિરૂપતા ધરાવતો હોવા છતાં ભવ્ય હોઈ શકે છે, સુંદર નહિ. આખુંયે ‘પેરેડાઇઝ લોસ્ટ” સ્વરૂપની અપુર્વ સિધ્ધિ છે.

કળાદ્રષ્ટિએ પુર્ણ દેખાતાં ચોક્સ સ્વરૂપો સાહિત્યની સુંદર વાનગી ન હોવા છતાં પણ, આ સિધ્ધાંત જુઠ્ઠો પડતો નથી, કારણ કે આ ઉદાહરણો, કલાકાર મેધાવી હોવો જોઈએ એવી ફલિત ધારણાનું ખંડન કરે છે. આથી ડોળઘાલુ કોઈપણ શાખામાં સફળ નિવડતો નથી. કેટલાક જુઠ્ઠા કલાકારો (Pseudo-artists)ના હાથે સ્વરૂપહીન થવાનાં કારણે કલાની સંપુર્ણ સ્વરૂપની માંગણી ઓછી બની જતી નથી.

દેહસૈાંદર્યમાં પ્રતિબિંબિત થયેલું આત્માનું સૈાંદર્ય–એ જ “કળા સ્વરૂપ તરીકે”નો અર્થ છે.

સાહિત્યમાં કળા

કળા માત્ર વ્યકતવ્યશીલ જ નહિ, સંસર્ગસાધક પણ છે!

લેખકઃ—એમ. ડી. દેશાઇ ● અનુવાદકઃ—“જલાજ”

સઘળી કળા, બહિર દ્રષ્ટિએ વિચારીએ તો, સ્વરૂપ જ છે. એનો મુખ્ય ઉદ્દેશ રંજન છે. કળા જીવનમાંથી પ્રાપ્ત થતી હોવા છતાં, તે કદી વાસ્તવિક રૂપે જીવાતાં જીવન જેવી હોતી નથી; તે ચિંતન અર્થે યોજાયેલ જીવનની સાદ્રશ્યતા છે; અને જીવન અને તેની વચ્ચે એટલો જ તફાવત છે કે, તેને શરૂઆત, મધ્યાવસ્થા અને અંત હોય છે. એટલે કે કળા સ્વરૂપની દ્રષ્ટિએ સંપ્રમાણ અને સંપુર્ણ હોય છે. જો સ્વરૂપ ઉણું હોય, જો રજુઆત અનાકર્ષક હોય, તો કલા લોકોને રંજન કેમ પમાડી શકે? અને આમ હોય તો કળા પોતાના ઉદ્દેશમાં સફળતા પ્રાપ્ત કરી શકે ખરી?

કળા એ “ઇચ્છીત પરિણામ ઉપજાવવા માટે નિશ્ચતપણે અને ઇરાદાપુર્વક યોજીયલે ચાતુરી છે.” સાહિત્ય પણ કળા છે. સાહિત્યનો ઉદ્દેશ અવિષ્કરણ છે. પણ શું એટલું જ? લેખન વ્યાપારમાં બે વ્યક્તિઓ હોય છે—કર્તા અને વાચક. આવિષ્કરણ એ આ વ્યાપારની માત્ર એક જ બાજુ છે. પોતાની જાતને વ્યકત કરવી એ, પોતાની જાતને સમજાવવાની સરખામણીમાં, આ વ્યાપારનું ઘણું નાનું અને લગભગ બિનઅગત્યનું અંગ છે. સાહિત્યનું અસ્તિત્વ માત્ર વસ્તુનાં આવિષ્કરણ માટે જ નથી; સાહિત્યનું અસ્તિત્વ એટલી જ સમાન રીતે વ્યકત થયેલી વસ્તુ ગ્રહણ કરવામાં સમાયલું છે એમ કહેવું એટલું જ વાસ્તવિક છે. એટલે કે સાહિત્ય સંસર્ગ સાધે છે.

ભાષા એ સાહિત્યની કળાનું એક માત્ર માધ્યમ છે. લેખક અને વાચક વચ્ચે સ્થપાતા સમાગમમાં આ સમાયલી કળા છે. સાહિત્ય તેથી એવી કળા છે, જે દ્વારા ભાષામાં સમાગમ સધાય છે.

લેખક એક અનુભવ ભાષામાં વ્યકત કરે છે. વાંચક સમક્ષ ભાષા અનુભવની રજુઆત કરે છે. જે અનુભવથી લેખકનું મન ઓતપ્રોત હોય છે, તે અનુભવથી વાચકનુ મન ફરી ઓતપ્રોત થવું જોઇએ. પરંતુ ભાષા અનુભવ કેવી રીતે દર્શાવી શકે? લેખકે પોતાના વાચકોમાં એવી જ લાગણીઓ જગાવવી જોઇએ. તેણે વાંચકોનો અનુભવ પોતાના અનુભવને જેટલી બને તેટલી વધુ નિકટતાથી અનુસરે તે માટે પોતાના શબ્દોથી, તેમની કલ્પના જાગૃત કરી દેવી જોઇએ તેટલું જ નહિ પરંતુ તેણે વાંચકની કલ્પનો કબજો પણ લઇ લેવો જોઇએ. આમ કરવા માટે, તેણે આ શબ્દોને જ એવી રીતે વ્યકત કરવા જોઇએ કે તે પોતાના અનુભવને અનુસરે. તેણે પોતાના શબ્દોને તેના પોતાના અનુભવની સંજ્ઞા જેવા બનાવી દેવા જોઇએ. તેણે વાપરેલી ભાષા પોતાનો અનુભવ ગમે તેટલી સ્પષ્ટતાથી પોતાને સમજાવતી હોય છતાં જો પોતાના વાચકને તે ન સમજાવતી હોય તો તે સાહિત્ય બનવામાં ફળીભુત થતી નથી કારણ કે દર્શન તરીકે તે અફળ નિવડે છે.

આ સાહિત્ય અનુભવ દર્શાવે છે. પરંતુ અનુભવ ભાષામાં ઉત્પન્ન થતો નથી. ભાષાની એવી સંજ્ઞામય સમાનાર્થતામાં લેખકના અનુભવનું રૂપાંતર કરવું જોઇએ કે વાચક ફરી પાછું આ સંજ્ઞાનું, એવા અનુભવમાં રૂપાંતર કરી શકે. તેથી વ્યકત કરી શકે અને રજુઆત બન્ને કરી શકે એવી ભાષાની સર્વ શકિતઓને પોતાની કળામાં કેમ સંયુકત કરવી એ જ સાહિત્યક કલાકારે જાણવું જોઇએ. ભાષા વ્યકતવ્યશીલ હોવી જોઇએ કારણકે લેખકના અનુભવો દર્શાવાતા હોય છે; પરંતુ તે ભાષા અનુભવની રજુઆત કરે તેવી પણ હોવી જોઇએ, કારણકે નહિતર વાચકનાં મનમાં તેનું ચિત્ર ઉભું થશે નહિ. સાહિત્યક કળા તેથી હંમેશાં સુચનસભી અને લેખકને શું કહેવું છે તે દર્શાવનારી હોય છે. જેમ વધુ મુશ્કેલીઓ લેખક વટાવે છે તેમ સાહિત્યક કળાની ઉચ્ચતા ભાષાની સુચનશકિતને બને તેટલી તેજસ્વી, બને તેટલી દુરગામી, બને તેટલી સ્પષ્ટ અને બને તેટલી શુક્ષ્મ બનાવે છે.

× × × × ×

ચિત્રકળામાં, એક જ પળમાં ચક્ષુ નિહાળે છે, મન ગ્રહણ કરે છે; જ્યારે લેખનમાં, લેખક પોતાનો ભાવાર્થ નાની અસરો ઉપજાવી વાચકનાં મનમાં ઉતારી પરિણામ ઉપજાવી શકે. દેખીતી રીતે આને અંગે વાચકને ઘણી ધીરજ ધરવી પડે છે. વાચક પર જેમજેમ અસર થતી થતી જાય છે, તેમતેમ તેણે તેને સુધારવી અને પુનઃવ્યવસ્થિત કરવી પડે છે. વિષય ગમે તેવો મહાન હોય કે ગમે તેવો ગુંચવાયલો હોય છતાં તે માત્ર એ રીતે જ દર્શાવી શકાય. શૈલીની સુગમતા અને ચોકસાઇ ઉપરાંત લેખકની પોતાના વાચકો તરફની ફરજ તરીકે, ક્રમ અને રચના પર ભાર મુકાવો જોઇએ, કેમકે તેઓ તેનાં કથન પર લક્ષ આપી તેને માન આપે છે.

“કળા કે સાહિત્યમાં જે શિષ્ટ (Classical) હોય છે તેની મધુરતા, અતિ સુંદર રીતે કહેવાયલી હોવાનાં કારણે જેનું આપણે ફરીફરીને શ્રવણ કરી શકીએ છીએ, તેવી વાર્તા જેવી હોય છે.”

આપણે શિષ્ટ અને આનંદલક્ષી (Romantic) વચ્ચેની વિલક્ષણતા બતાવીએ છીએ ત્યારે આપણાં મનમાં જે સૌંદર્યની ગુણમતા હોય છે, ખચિત વોલ્ટર પેટર તેનો વિચાર કરતો હતો. એ અર્થમાં ગણીએ તો, બહિર સૌંદર્ય એ સર્વદા શિષ્ટતા (classicism)નું અનિવાર્ય ગુણલક્ષણ છે. સૌંદર્યની વિલક્ષણતાનાં કેટલાંક તત્વોના ઉમેરાથી જ કલાનું આનંદલક્ષી સ્વરૂપ યોજાય છે. શિષ્ટ અને આનંદલક્ષી વચ્ચેની ભિન્નતા એ વલણ વચ્ચેની ભિન્નતા છે. સ્વરૂપ એ શિષ્ટતાનુ પહેલું વિશિષ્ટ તત્વ છે, અને આનંદલક્ષીતા (Romanticism)માં તેની અવગણના કરવાનું કંઇ કારણ નથી. કળા એ ભાવનાનું સ્વરૂપ રૂપે વ્યકત થયેલું સ્થુળરૂપ છે, જેમાં લેખક કે કલાકાર પોતાનાં માધ્યમની જરૂરીયાત અનુસારની પરિસ્થિતિને વશ થાય છે. સ્વરૂપ જ સર્વાંશે મહત્વનું છે.

કળાને સ્વરૂપ રૂપે સ્વીકારતાં, આપણે જે કંઇ આનંદલક્ષી તરીકે ઓળખાય છે તેને ‘કલા’ની સંજ્ઞામાંથી રદ કરતા નથી. એને બદલે આપણે તેને કળાના તત્વ જ તરીકે સ્વીકારીએ છીએ. કારણ કે આત્મા વિના કોઇ સ્વરૂપ હોઇ શકતું નથી. આપણો કહેવાનો અર્થ એ છે કે, સુંદર સ્વરૂપે મુર્ત બનાથી આનંદલક્ષીતા પણ સુશોભિત બને છે. કિટસ, શૈલિ, કોલરિજ એ સર્વ આનંદલક્ષી કવિઓએ સઘળાં અંગ્રેજી કાવ્યોની હારમાં બેસતાં સુંદર સ્વરૂપે મુર્ત થયેલાં સર્વોચ્ચ આનંદલક્ષી કાવ્યો આપ્યાં છે. કિટસનું ‘ઓડ ટુ ધી ગ્રીસીઅન અર્ન’, શેલિનું ‘ઓડ ટુ ધી વેસ્ટ વિન્ડ’, કોલરિજનું ‘ધી એન્શીયન્ટ મેરીનર’, આ કાવ્યો શું અતિ સંપુર્ણ સ્વરૂપના નમુના નથી?

જાણવા માગે છો?" તે પછી તેઓ જાતે જ ઉત્તર આપે છે કે "જગત તો તે જ છે, જેમાં હું પહેલાંથી જીવન ગાળતો આવ્યો છું. પણ શોક અને તેનું શિક્ષણ મારા માટે નવી વસ્તુ છે."

ઓસ્કાર વાઇલ્ડ માનવશોકને ઉર્મિઓની પરિપક્વતાનું અંતિમ સ્વરૂપ સમજે છે. તેમની માન્યતા પણ એવી છે કે દરેક પ્રકારની કળાની કસોટી કરવાનું યંત્ર પણ માત્ર શોક જ છે.

એક બીજાં સ્થળે તેઓ કહે છેઃ "કેટલીક વેળા તો માત્ર શોક જ મને જીવનનું એક નિર્મળ સત્ય હોય એમ લાગે છે અને એ સિવાય બીજું કંઇ હું જોઇ શકતો નથી."

શોકની હિલ્લુરીમાં ડુબીને પ્રત્યક્ષ શોકમુર્તિ બની જવા ઇચ્છતો હોય એવા મનુષ્યનું શોક વિશેનું નિરીક્ષણ કેટલું બધું ઉડું અને મહાન હોવું જોઇએ! એક બીજાં સ્થળે એમણે કહ્યું છે કે, "જીવનનો મર્મ શોકમાં જ સમાયલો છે."

આપણે અત્રે એ સ્મરણમાં રાખવાની આવશ્યતા છે કે, ઓસ્કાર વાઇલ્ડને સહસા શોકના આદર્શનું આત્મભાન પ્રેરણા સ્વરૂપે થયું નહોતું, બલ્કે એકધારા મનન ને ચિંતનને અંગે તેઓ એ નિર્ણય ઉપર આવ્યા હતા. જીવનની આરંભિક અવસ્થામાં એમનું દ્રષ્ટિબિંદુ વિલાસપ્રિયતાનું હતું અને એમણે એ રીતે જ જીવન ગાળ્યું હતું, પરંતુ, તેમને વાસ્તવતાનાં દર્શન જીવનની એ કેડીમાં લાધ્યાં નહોતાં. તેમનાં માનસિક વિકાસે અંતે જીવનની વાસ્તવિકતાનું પ્રાપઃદર્શન કરાવ્યું અને તેમને સમજાયું કે, "શોક એક સંકલતાબધ્ધ શોકઘેરી પળોમાં જીવી રહયો છે. ઉલ્લાસ અને વિલાસનું સાધન સ્વરૂપવાન શરીર સુધી જ મર્યાદિત છે, પરંતુ, શોક એ સ્વરૂપવાન આત્માઓ માટે ઉત્પન્ન કરવામાં આવ્યો છે." એ વિશે તેઓ કહે છેઃ—"આ નવું જીવન (શોકની વાસ્તવિકતાનાં દર્શન થયા પછી) માત્ર મારાં જ માટે નવજીવનનો સંદેશ નથી, બલ્કે આ તો મારાં પાછળનાં (વિલાસ ને ઉલ્લાસપ્રિયતાના) જીવનની એક રચનાત્મક સંકલના છે, જે એક ઉત્ક્રાંતિનું સ્વરૂપ જ છે."

તેઓ કહે છે,—"મને પુર્વેનું વિલાસપ્રિય જીવન ગુમાવી દેવા માટે જરાય શોક થતો નથી. હું એ જીવનને તેનાં અંતિમ પગથિયાં સુધી પહોંચાડી શક્યો છુંઃ જગતમાં કોઇ એવો આનંદ નથી જે મેં ભોગવ્યો ન હોય. મે મારા આત્માના હીરને સુરા અને સુંદરીને અર્પણ કર્યું હતું, પરંતુ જીવનના એ ક્રમને ચાલુ રાખવામાં ભુલ જ થતે, કારણ કે, તે એ પ્રકારે મર્યાદિત થઇ જતે. મને તો વિકાસ સાધવો હતો. રંગ ને સુવાસની બીજી બાજુમાં પણ મારા માટે જીવનદ્રષ્ટિ પડી હતી."

ઓસ્કાર વાઇલ્ડે રંગને સુવાસની બીજી બાજુ પણ ખુબ લક્ષપુર્વક જોઇ અને તેનાં દર્શન વડે પોતાનાં જીવનને એમણે પરિપુર્ણ કર્યું. હવે જગતમાં એ માટે અધિક અવકાશ નહોતો. જગત તો માત્ર એક બાજુ જ નિહાળતાં નિહાળતાં રીઢું બની ગયું છે. અહિં તો માત્ર એવા જ લોકો માટે અવકાશ રહેલો છે, જેઓ જીવનનો એક હેતુ સમજે છે—ઉલ્લાસ અથવા સતત વેદના.

જગતને એ પ્રકારે સકુંચિત નિરખતાં જીવન ઉપર ઓસ્કાર વાઇલ્ડને અધિક મોહ રહ્યો નહિ.

ઓસ્કાર વાઇલ્ડના મૃત્યુ પછી પણ એમની પ્રજાએ એમની સાથે સારૂં વર્તન ચલાવ્યું નહિ. તેમની મૃત્યુયાત્રામાં માત્ર સાત માણસ જ હતા અને તેમાનાં પણ સઘળા તેમની આરામગાહ સુધી ગયા નહિ. તેની આવશ્યકતા પણ નહોતી, કારણ કે, ઓસ્કાર વાઇલ્ડ પરિપુર્ણતાનાં સ્થાને પહોંચી ગયા હતા. તેમનુ શરીર પણ જડ વસ્તુઓનો સ્પર્શ કરવા ચાહતું નહોતું. તેમને તો એકલા જ પ્રવાસ કરવાની જરૂર હતી.
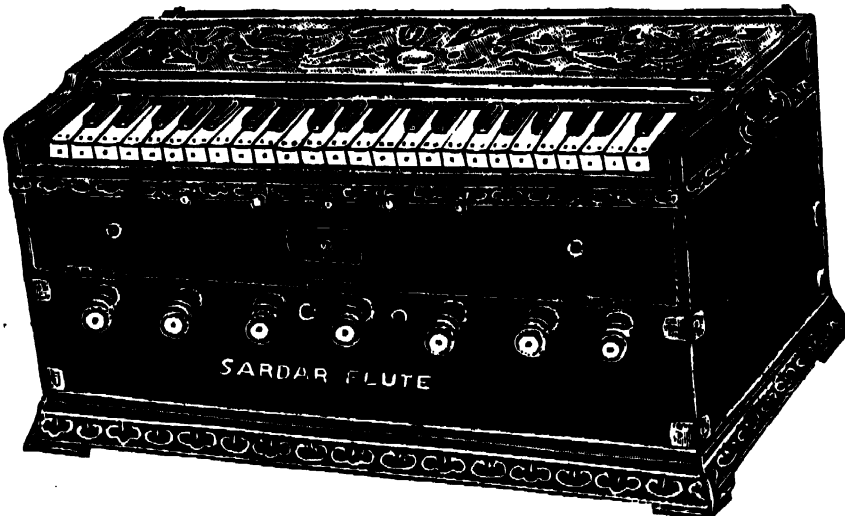
અંતિમ દિવસોમાં ડગમગી જાય છે, એમાં જીવનશક્તિ રહેતી નથી અને જેનાં યંત્રભાગો બગડી ગયા હોય એવાં એક ઘડીયાળ જેવું જીવન તે ગાળતો હતો જેમાં આગળ ચાલવાનું બળ રહ્યું નહિં હોય.

ઓસ્કાર વાઇલ્ડનાં વ્યક્તિત્વનું હીર આ યુગમાં પણ આવરણયુક્ત રહી શક્યું નહિં. એમાં હજી જીવનઅગ્નિ સળગતો હતો અને હજી આકર્ષવા અને આકર્ષાઇ જવાની શક્તિ જીવંત હતી. અલબત એમાં એક વિશેષતા આવી ગઇ હતી અને તે અન્તરવેદનાની હતી. તેમની પ્રકૃતિ વ્યાકુળતાથી પરિચિત હતી. પુર્વે એ વ્યાકુળતા પ્રેમની હતી હવે તે વેદનાની બની ચુકી હતી. તે હવે એવા ગીતગાતી હતી, જેમાં જીવંત લાગણી હતી, દર્દ હતું, સ્પર્શ હતો અને વાસ્તવિકતા પણ હતી. પ્રથમ કરતાં એમનાં જીવનનો આ યુગ વધારે સફળ હતો. ઓસ્કાર વાઇલ્ડનો આત્મા જગતની અંધકારમય બાજુથી પરિચિત થઇ ચુક્યો હતો. અને એક મનુષ્ય જીવનનાં 'પ્રકાશિત' અને 'અંધકારમય' અંગોથી માહિતગાર ન થાય ત્યાંસુધી તે સંપુર્ણ થઇ શકતો નથી.

પ્રજાએ એક ઘણા જ નિંદ્ય આરોપસર ઓસ્કાર વાઇલ્ડ સામે મુકદમો ચલાવ્યો અને તેમને બે વર્ષનો જેલનિવાસ મળ્યો. ઓસ્કાર વાઇલ્ડ સાથનું તેમની પ્રજાનું આ વર્તન એક પ્રકારનો અત્યાચારજ હતો, પરંતુ, પોતાના જીવનની ઉજળી બાજુના અનુભવથી જ તે મગ્ન રહેતા હતા પોતાનાં જીવનનાં અંત સુધી તેમણે એ માર્ગે જ ગમન કર્યું હોત અને તેમનાં વ્યક્તિત્વની બીજી બાજુ પરથી આવરણ ઊંચકાયું ન હોત અને તેમનાં વેદનાભર્યાં જીવન પરથી તેમના શોકાન્ત દ્રષ્ટિબિન્દુ જાણી શકાયા નહોત. વસ્તુતઃ વેદના ને શોકે ઓસ્કાર વાઇલ્ડને એક જીવનની અન્ને બાજુથી પરિચિત બનાવ્યા અને એમનું વ્યક્તિત્વ પુર્ણતા પામ્યું.

જીવનના પુર્વાર્ધમાં કલા વિશે એમની દ્રષ્ટિ એ હતી કે, કલા કેવળ કલાને ખાતર જ છે. ધર્મ અને નૈતિક દ્રષ્ટિબિન્દુ ધરાવનારા વિરૂધ્ધ તેઓ હંમેશાં વિવાદ કરતા હતા. વિદ્યા અને સાહિત્યની કોઇપણ પ્રકારે મર્યાદા બાંધવી ઉપયુક્ત નથી એમ તેઓ માનતા હતા. એમનું મંતવ્ય હતું કે કોઇપણ પ્રકારના વિક્ષેપ કે અવરોધ વગર સ્વતંત્રતાપુર્વક જે કળાનુ સર્જન થાય છે, તે ઉત્તમ પ્રકારનું સર્જન છે.

ઓસ્કાર વાઇલ્ડનાં કલાસૌન્દર્ય અને કલ્પનાસૌન્દર્યનો ઉત્તમ નમુનો રજુ કરતી એક કૃતિ 'સલોમી' છે. ઓસ્કાર વાઇલ્ડને પણ તે ખુબ પ્રિય હતી અને તેઓ એનાં કલ્પનાસૌન્દર્યમાં તરબોળ રહેતા હતા. એક દિવસે તેમણે પોતાના એક મિત્રને કહ્યું:

" તે તદ્દન તાદ્રશ્ય અને સૌન્દર્યની મુર્તિ નથી એમ તમે માનો છો ? –હા, તદ્દન તાદ્રશ્ય અને રત્નોથી વિભુષિત થયેલી ! એનાં રત્નો, એ સૌન્દર્ય–મુર્તિના વાળ, તેનાં કાંડાં, તેના બાવડાં, તેનાં ગળાં અને રૂપાળાં મસ્તકની ચારે કોર લટકી રહ્યાં છે અને તે પોતાનાં અવર્ણનીય તેજથી તેની નિર્દોષતાને વધારે પ્રકાશિત બનાવી રહ્યા છે."

ઓસ્કાર વાઇલ્ડ પોતાનાં એ જીવનકાળમાં કષ્ટ અને દુઃખ પ્રત્યે સહાનુભુતિ દર્શાવવાનાં કાર્યને સાધારણ પ્રકારની સહાનુભુતિ સમજતા હતા. તેઓ ઉચ્ચ પ્રકારની અને ઉત્તમ સહાનુભુતિ, જે મનુષ્ય બીજાના ઉલ્લાસ ને વિલાસમાં સહભાગી થઇને દર્શાવે છે, તેને સમજતા હતા. કોઇનાં દુઃખ કે કષ્ટ પ્રત્યે દર્શાવેલી સહાનુભુતિ તેના દુઃખનાં આત્મભાનને ઓછું કરી દે છે, પરંતુ તેના અસ્તિત્વને ભુંસી નાખી શકતી નથી. અન્ય બાજુએ બીજાં એનાં સુખમાં સહભાગી થવાથી તેનાં સુખ ને ઉપભોગની વૃધ્ધિનું કારણ બને છે. ઓસ્કાર વાઇલ્ડ સાથે એમનો પ્રાણ પણ યુવાન હતો, ત્યારના યુગની આ વાત છે. જીવનની વાસ્તવતાનું તેમને દર્શન થયું નહોતું, પરંતુ, ઓસ્કાર વાઇલ્ડ ઉપર દુઃખ ને કષ્ટ તુટી પડયાં ત્યારે જીવનની મહદ વાસ્તવિકતા તેમણે જાણી લીધી. એ વાસ્તવિકતા શું હતી ? શોક માત્ર શોક જ !

ઓસ્કાર વાઇલ્ડના જીવનમાર્ગમાં શોક આવીને ઉભો રહેતાં તેમણે તેને ઠોકર મારી નહિ, પણ હસતાં મુખે તેને આવકાર આપ્યો અને શોકથી ઉત્પન્ન થતી ઉર્મિઓનો રસાસ્વાદ ભોગવ્યો. તેમને હવે એવું આત્મભાન થવા માંડયું કે અત્યારપર્યંત તે જીવનની એક જ દ્રષ્ટિથી રસ મેળવતા હતા, જે વાસ્તવિક રીતે જીવનનું અપુર્ણ સ્વરૂપ હતું. શોકમાં માનવની પુર્ણતા રહેલી છે. ઓસ્કાર વાઇલ્ડે શોકમાં પણ એટલો રસ કેળવ્યો જેટલો 'સાલોમી'ની ઉલ્લાસપ્રિયતામાં કેળવ્યો હતો. તેમણે ગંભીરતા સાથે 'શોક'નાં તત્વનો અભ્યાસ કર્યો. તેઓ કળાને કળા ખાતરના સિધ્ધાંતને નિહાળતા હતા, તેમ શોક પ્રત્યે પણ નિહાળવા લાગ્યા. આ વસ્તુ ઓસ્કાર વાઇલ્ડની એક વિશેષતા છે અને એમના આદર્શમાં એક સ્થાયી સ્થાન ધરાવે છે. એક મનુષ્ય જગતનાં દુઃખ કષ્ટથી વ્યાકુળ થઇ કુદરતના શોકનો પક્ષપાતી બને એ સ્વાભાવિક છે, પરંતુ, જો તેને અંગે તેનાં હૃદયમાં વેદના જન્મતી ન હોય તો તે પોતાના માર્ગ પર સ્થાયી રહી શકતો નથી. દુઃખ દર્દની કૃત્રિમ કેડીથી ગુજર્યા પછી તે ફરી એ જ વિલાસપ્રિયતાનો ભોગ થઇ પડે તો કાંઇ આશ્ચર્ય નહિં.

ઓસ્કાર વાઇલ્ડ એવા મનુષ્ય ન હતા. તે શોકનો ભોગ બન્યા, પણ તે વ્યાકુળ થયા નહિ. તેમણે પોતાનાં વ્યક્તિત્વને અણનમ રાખીને શોકનું નિરીક્ષણ કર્યું. શોક ઉદ્દેશ વિના નથી એની એમને ખાતરી થઇ શોક જ વાસ્તવિકતા છે અને વાસ્તવિકતા સિવાય જગતમાં જે કંઇ છે, તે ભરોસાપાત્ર નથી. અત્રે માત્ર શોકને જ સ્થાયીત્વ છે. તે એવા નિર્ણય ઉપર શી રીતે આવ્યા ? એ એમનાં જ મુખે સાંભળવું ઘટે છે. તેઓ પોતાના જેલનિવાસ દરમ્યાન લખે છેઃ—

(જેલનિવાસના) એ બે વર્ષ દરમ્યાન મારી પ્રકૃતિ ભિન્નભિન્ન પ્રકારની લાગણીની અસર ધારણ કરતી રહી. અણઘડ નિરાશા, જેને જોઇને પત્થર પણ પીગળી જાય એવો શોકનો આઘાત, આંધળો રોષ, તિરસ્કાર, લોહીના આંસુ, રડતી વ્યાકુળતા, અબોલી નિરાધારતા, અવર્ણનીય કષ્ટ—એમ શોકની પ્રત્યેક સ્થિતિનો હું ભોગ બની ચુક્યો છું. 'શોક સ્થાયી, અસ્પષ્ટ અને અંધકારમય અને તેની પ્રકૃતિ નાશવંત છે' એવી વર્ડઝવર્થની આ પંક્તિનો અર્થ તેના કરતાં પણ હું વધારે જાણું છું. મારી માનસિક સ્થિતિ ઘણીવાર એવી પણ થઇ પડી છે કે શોકના સ્થાયીત્વ માટે હું આનંદ દર્શાવતો હતો, પરંતુ, મારા શોકનો કંઇ હેતુ નથી એ માટે મને ખેદ ઉત્પન્ન થતો હતો. હવે મારાં હૃદયનાં ઉંડાણમાંથી એક સુક્ષ્મ સાદ એવો સંદેશ આપી રહ્યો છે કે જગતમાં કોઇપણ વસ્તુ અને ખસુસ કરીને શોક અર્થહીન નથી. એ સાદ મારી પ્રકૃતિમાં એ છુપા ભેદની જેમ છુપાયલો છે. "અને એ સાદ અતિશય વિનમ્ર અને કુણો છે."

ઓસ્કાર વાઇલ્ડની દ્રષ્ટિમાં શોકની એ વ્યાખ્યા હતી. એક સ્થાને એ કહે છેઃ—"એ જ સહુથી છેલ્લી અને સહુથી ઉત્તમ વસ્તુ છે. એ વસ્તુ હવે મારી સ્વાધીનતામાં છે. મારાં સમસ્ત જીવનનાં મંથન પછી હુ એ નિર્ણય ઉપર આવ્યો છું. એક ઉર્મિનાં તાઝાં પોષણના આરંભની આ સ્થિતિ છે. મારી પોતાની પ્રકૃતિ જ એમાંથી જન્મી છે અને એ જ પ્રસંગ એના પ્રાકટયનો ઉત્તમ પ્રસંગ હતો. તેની પહેલાં કે તેની પછી એ જુસ્સો કદીપણ પ્રકટ થઇ શકતે નહિં. જો કોઇ મનુષ્ય એ માટે કોઇ ભવિષ્યવાણી કરતે તો હું તે માની પણ શકતે નહિં. જો મને વિનમ્ર પ્રકૃતિના થવાનું કહેવામાં આવતે તો હું ઇન્કાર જ કરતે. હવે મને એ વસ્તુ મળી ગઇ છે અને હું તેને સુરક્ષિત રાખવા ચાહું છું."

શોકનું આત્મભાન થયા પછી ઓસ્કાર વાઇલ્ડને લાગ્યું કે આ મહાન સત્યને પોતાના પંડ સુધી જ મર્યાદિત રાખવાથી એ મનુષ્યસમાજ અને માનવતા પર ભારે અત્યાચાર કરેલો કહેવાશે. આ સત્યનો પ્રચાર કરવાના હેતુ માટે જ તેમણે જીવતા રહેવાનું પસંદ કર્યું છે. એતો કહે છેઃ—"જો હું એ કામ કર્યા વિના મરી જાઉં તો એ એક કરૂણ ઘટના બનશે. મારાં દ્રષ્ટિબિન્દુ પ્રમાણે કલા અને જીવન વિશેનાં નવાં રહસ્યોની વૃધ્ધિ થઇ છે અને જે મારા માટે નવું છે એવા જગતની ખોળ કરવા હું જીવતો રહું એવી મારી તીવ્ર ઇચ્છા છે. તે પછી તેઓ પ્રશ્ન કરે છે કે "એ જગત કેવું છે, એ આપ

ઇન્ં ઓરીદો ઇલ્લલ ઇસ્લાહં મસ્તતંઅંતો

અમે ઇસ્લાહ (સુધારણા) કરવા સિવાય બીજું કંઇ ઇચ્છતા નથી; જ્યાં સુધી કે અમારાથી બની શકે. (સુરે હુદ, ૧૧–૮૮)

સવ્વાલ ૧ લી હી. સ. ૧૩૬૦	ઇદ અંક ઓન. અધિપતિ: અલીજાન મિસકીન	૨૩ મી અકટોબર, ૧૯૪૧

આઇરિશ નાટયકાર ને વાર્તાકાર

ઓસ્કાર વાઇલ્ડનું શોકાન્ત દ્રષ્ટિબિન્દુ

● ●

અનુવાદકઃ—'ગુલરેઝ ગુજરાતી'

●

આયર્લાંડના વિચારક અને સાહિત્યકાર ઓસ્કાર વાઇલ્ડનાં નામથી હિંદુસ્તાનનો સાહિત્ય સમાજ પરિચિત છે. એમની નવલિકાઓ અને નાટકો પ્રાયઃ હિન્દુસ્તાનની ભિન્નભિન્ન ભાષાઓમાં અનુવાદિત થઇ ગયાં છે.

ઓસ્કાર વાઇલ્ડના સાહિત્યનો પ્રધાન ગુણ માનવ લાગણીને ઉત્તેજીત કરવાનો છે. એ ઉત્તેજીતતા સરળતાથી સામાન્ય મનુષ્યના અનુભવમાં આવે છે અને તેમાં વેદના અને સ્પર્શન હોય છે. નાનાનાના થોડાક શબ્દોમાં જીવનનું વાસ્તવિક દર્શન કરાવવાની શક્તિ કોઇ મોટા સાહિત્યકાર અને કવિનું જ કામ હોઇ શકે છે.

ઓસ્કાર વાઇલ્ડ આપણને એની સાહિત્યક કલાથી જ આકર્ષતા નથી, એમનું વ્યક્તિત્વ, એમનાં માનસિક વહેણ, એમનો આદર્શ અને બાહ્ય પરિવર્તન સાથે એમના માનસિક પરિવર્તનો પણ રસ ઉત્પન્ન કરે છે. એમનાં વ્યક્તિત્વમાં આકર્ષણ શક્તિ હતી, પ્રભાવોત્પાદક પરિબળ હતું. જે કોઇ એમનું એકવાર મિત્ર બનતું તે પછી મિત્ર બની રહેવાનું જ પસંદ કરતું.

ઓસ્કાર વાઇલ્ડને જીવનની જુદીજુદી કેડીઓમાં ઘુમવાનો બહુ ઓછો જ સમય મળ્યો હતો. એમની જીવનલીલા માત્ર ૪૬ વર્ષમાં જ સંકેલાઇ ગઇ હતી. આટલા અલ્પ સમયમાં પણ એમનાં વ્યક્તિત્વ અને સાહિત્યસર્જને જે પ્રભાવ ઉત્પન્ન કર્યો તે વડે આજે પણ જગત રસ માણે છે.

ઓસ્કાર વાઇલ્ડે પોતાનાં જીવનનો ઘણોખરો ભાગ વિલાસવૃત્તિને પોષવામાં ગાળ્યો હતો. એમના એ સમયના જીવનકાળમાં એમણે જે સાહિત્ય પીરસ્યું એમાં યૌવનની મસ્તી અને વિલાસની છાયા પ્રધાન અંશે તરી આવે છે એમને જીવનમાં રસ હતો. જીવનને રસાસ્વાદ માણવાનું તેઓ એ યુગમાં એક સાધન સમજતા હતા. સંસારત્યાગી જીવનની તે અવહેલના કરતા હતા. એમની દ્રષ્ટિમાં જીવનનો એક માત્ર ઉદ્દેશ પ્રેમ અને ઉલ્લાસ માણવાનો હતો.

આપણે એ યુગના ઓસ્કાર વાઇલ્ડના વિચાર અને જીવનદ્રષ્ટિને લક્ષમાં લઇએ છીએ તો ઓસ્કાર વાઇલ્ડનું 'શોકાન્ત દ્રષ્ટિબિન્દુ' તેથી જુદા જ પ્રકારનું દ્રષ્ટિએ પડે છે. ઘણે ભાગે તો એ આપણા માન્યામાં પણ આવતુ નથી. એ યુગના 'ઓસ્કાર વાઇલ્ડ' આપણને શોકાતુર અને ગ્લાનિયુક્ત નહિં પણ ઉલ્લાસી અને વિલાસી દેખાય છે. પોતના વિશે તેઓ સ્વયં લખે છેઃ "મારા યુગના સંસ્કાર અને વિચારની પુજનીય પ્રતિમા હોઉં એવી વ્યક્તિ તરીકેનું હું સ્થાન ધરાવતો હતો. મારાં યૌવનના પ્રથમ જ તબકાથી હું એમ સમજવા લાગ્યો હતો અને બીજાઓને પણ એમ સમજાવવામાં હું સફળ થયો હતો. એવું સ્વયંપ્રકાશિત અને સ્વુઉપેક્ષનીય સ્થાન ધરાવનારા જગતમાં બહુ જ ઓછા જ મનુષ્ય હોય છે. સામાન્ય રીતે કોઇ સમાલોચક અથવા ઇતિહાસકાર આ વાસ્તવિકતાનું દર્શન ત્યારે જ કરાવે છે, જ્યારે એવી વ્યક્તિ અને તેનો યુગ ભુતકાળની વસ્તુ બની જાય છે. મને એ વસ્તુનું આત્મભાન થયું અને બીજાઓને પણ એવુ આત્મભાન કરાવ્યા વિના હું રહ્યો નહિં. બાયરન પણ એવી એક માનસિક પ્રતિમારૂપ હતો. એ માત્ર ઉર્મિપ્રધાન હતો, પરંતુ મારી કલ્પના સ્થાયી, ઉચ્ચ, મહદ અને વિશાળ હતી.' પરંતુ, એ શબ્દો વદનાર આ જુવાન અને વિલાસી ઓસ્કાર વાઇલ્ડનો આત્મા પોતાનાં જીવનના

BIBBO IN GREAT INDIA'S **INTEZAR**
AT NISHAT TALKIES.

MANORMA IN PANCHOLI ARTS' **KHAZANCHI**
A FAMOUS PICTURES LTD.'S RELEASE.

ISMAILI P. PRESS. BOMBAY,

perceived and recently he went to the extent of saying that "If he had the power to do so, he would take the funds of all these institutions and amalgamate them into one Indian educational trust."

It is really deplorable that from the sectarian educational centres infection has spread to other walks of life; and not only the press and politics but even the domain of sport has been invaded by communalism. There are communal contests, communal sham fights, communal cricket triangular, quadrangular and pentangular tournaments run on communal basis. That is not all. There are Hindu and Islamic gymkhanas.

One practical difficulty arising from the association of educational questions and problems particularly of Indian history tend to be discussed from a sectarian point of view. Things are viewed from a certain angle of vision in the course of which or on account of which no dispassionate study of facts, perhaps no appreciation of merit, is possible. Hence the communal outlook in books of history now current at the Universities, Colleges and Schools.

One of the earliest recommendations of the Education Experts Committee of the League of Nations was that the text-books of history used in schools and colleges should be revised so as to eliminate all traces of racial bitterness. Here in India almost the whole literature of history available awakens or tends to awaken and inflame communal bitterness. A resolution to this effect was moved a few months back in the U. P. Legislative Council; and it was resolved that the books of history should be revised. But nothing practical has been done as yet. The Indian Universities authorities have been expected to take this matter up and drive out communal bitterness. But I have come across instances to the contrary. Recently I read in the papers how the higher study of Medieval India has been eliminated from the M. A. History syllabus of the Lucknow University. Should this be viewed as wilful suppression or a mere omission I do not wish to discuss. Medieval Indian History is undoubtedly the groundwork of modern Indian cultural life and must not be viewed as an exclusively Muslim legacy.

The communal bend or trend in Indian educational policy has been noticed even by some fair-minded Englishmen. Recently the Governor of Bombay referred to this when in the course of his Convocation Address at the Bombay University he emphasized the dangers of parochialism at the Universities or the encouragement of purely local interest where that was likely to interfere with the more important and more generous ideal of cultural importance, or scholarship and learning.

I beseech you all in the name of fairness to consider why almost in every part of India since the Montague-Chelmsford reforms of 1920 communal bitterness between the Hindus and Muslims has been intensified. The blame is put sometimes on democracy, sometimes on the illiterate classes and masses. But the fact is that we—the product of sectarian universities and denominational schools and colleges—have not sufficiently learnt citizenship, philanthropy and fellow feeling.

The problem that I have placed before you and which I beg to emphasize in the end is how to direct teaching at our Schools, Colleges and Universities so as to eliminate sectarian and communal feelings which if persisted in might lead to political chaos in this country.

Now, I will close, but not without invoking the spirit of the two great Akbars; first the spirit of Akbar the Great, the Mughal Emperor of India and secondly the spirit of the great poet Akber Ilahabadi. If Akbar the Great were called back to life, do you think he would be pleased to see our sectarian universities and a thousand denominational colleges and schools working in separate and rival groups. To him the idea of separate Muslim and Hindu schools was unthinkable. To him Hindus and Muslims were the two lungs of Mother India. And Akbar Ilahbadi long ago deplored the impact of communalism on education.

Communalism has at last invaded the domain of knowledge. And the methods which had been confidentially employed in the course of centuries in the past out of regard for Hinduism and the Hindus, have come to be grossly misunderstood: as a result Hindi has fallen out with Urdu.

A Root Cause of Communal Bias

By: Dr. MAHDI HUSAIN M.A., PH.D. LITT.

AGRA COLLEGE, AGRA.

We are passing through the most vital period of Indian history in which Indian Universities are playing or will have to play a very important and decisive part. In the last quarter of a century there has been great development of University education in India and while this has created many problems, the inauguration of communal or sectarian universities combined with the foundation of many denominational colleges in this province and all over the country has made those problems more difficult and complicated.

"The Central Hindu College of Benares" says Mr. Farquhar, "was founded with the object of defending and strengthening Hinduism. And because it taught and teaches Hinduism, a desire arose to take the forward step of creating a Hindu University which should arrange curricula, hold examinations and confer degrees. By that means and in that way, it was argued, not the actual work of teaching only but the aims of education, the subjects taught and the standard demanded would be under Hindu control." Thus was reared a Hindu University at Benares which roused the Muslims and they followed suit. They proposed a Muslim University at Aligarh where there already existed a College—the Mohammadan Anglo-Oriental College. Then arose denominational colleges and even schools in quick succession.

It is perhaps believed that sectarian universities and denominational colleges are the protective bulwork of the sect and community to which they belong. This may or may not be true. But it is true that the sectarian outlook in education that they tend to create and the sectarian feeling and policy in educational matters which is the necessary concomitant of sectarian universities and denominational colleges is contrary to the spirit of University culture and is likely to stand in the way of every movement for the increasing of friendliness and harmony among the various communities of India. Sectarian Universities though confined to two places as local Universities have acquired the character and force of territorial organizations by means of denominational schools and colleges which overspread the country. And they will be held responsible by the future historian for the idea now germinating that if the Hindus and Muslims have Universities of their own why not the Sikh? and why not others? This was the danger which Mr. Bhulabai Desai

of His Highness, Mehemet Said, I command the waters of the Mediterranean to enter Lake Timsah, by the grace of God."

In Paris, cheers were led by the Empress, but in London there was anger. It seemed as if Lord Palmerston was to be beaten at last.

Now there were more struggles. Money began to run short. Loans had to be issued. More and more workmen were employed. At one time there were said to be sixty thousand labourers engaged, but they did not all work together; there were twenty thousand actually at work, the same number being recruited, and twenty thousand on their way back to their homes after having completed their term of labour.

For seven years more the work continued. Then the Canal was declared ready to be opened by the Empress Eugenie.

Ferdinand de Lesseps worked for years with his headquarters at Ismailia. He lived in a room as small and almost as bare as a monk's cell. A few weeks ago I visited this little room, where everything is just as it was: nothing at all has been touched. There is a little iron bedstead with a pink cotton counterpane. There are faded blue wallpaper and cheap lace curtains. There is nothing luxurious in the room, and if any of the stories were true that Ferdinand de Lesseps had received huge sums of money from the Viceroy of Egypt, none could have gone into his own pocket.

In January, 1862, de Lesseps heard that Prince Said was seriously ill. The Frenchman was at work on the Canal when the news reached him. He rode hard through the night to try to reach Cairo, but when he reached the capital his friend was dead. Prince Said and Ferdinand de Lesseps had known each other for twenty-five years. There had been moments of difficulty between the two men, but de Lesseps never forgot that it was Prince Said who enabled him to put his project into operation. Prince Said was succeeded by Ismail Pasha.

It was to the Empress Eugenie that Ferdinand de Lesseps told the story of his struggles; he related how the very dredgers which had to clear the way were brought across the desert on the backs of camels, piece by piece. Every drop of water for the thousands of labourers had also to be carried on the backs of camels. There were outbreaks of cholera in the labour camps. There were all kinds of labour difficulties, and yet the Canal was complete and ready for the inauguration on November 17th, 1869. Lesseps was behind his working schedule by nearly a year, but he had underestimated his difficulties, just as he had failed to estimate correctly the amount of working capital needed.

During the last three years of the work, there was great activity. New towns were built, also factories and railway stations. Egypt had never known anything so stupendous. Then, when all was finished, England agreed that the Canal could **be built.**

Perhaps not since the legendary days of the "Arabian Nights" had there been such scenes in Egypt as there were when the Empress Eugenie went to open the Canal. She came in her royal yacht. Other crowned heads also were present. There was the Emperor Francis-Josef of Austria, who was nearly drowned because of the great storm which raged in the roads off Port Said. There were also the Crown Prince and Princess of Prussia, the Crown Prince of Holland, and many diplomats and notables, but no important English representative was there. Official England was still sulking about the Suez Canal.

There were fifty men-o'-war, thirty ordinary ships, and thousands of small boats and dhows. On shore, flags of all nations were flown. And when all was ready for the ceremony, there was a hitch. A ship had run aground in the Canal, and for a while it seemed that the ceremony would have to be adjourned. Once again Ferdinand de Lesseps rose to the occasion, and gave orders that the ship was to be blown up with dynamite. A thousand Egyptian sailors were rushed to the spot where the ship was aground, there was a mighty explosion, and the Canal was clear for traffic.

But there was more trouble ahead. The Suez Canal Company had troubles of its own, but they were as nothing compared to the financial difficulties of Prince Ismail, who had now been made Khedive of Egypt. He was in desperate need of money, and at last he decided to mortgage his shares in the Suez Canal. There were nearly 177,000, shares which were brought to London in zinc-lined crates.

One foggy afternoon in November, 1875, a hansom cab came jog-trotting along Whitehall Gardens and stopped before a certain house. In a room on the ground floor a gentleman with black hair was waiting. The man in the hansom cab got out. He was Mr. Frederick Greenwood, the Editor of the *Pall Mall Gazette*. The man waiting for him was Mr. Disraeli.

"Dizzy" had already heard from his friends, the Rothschilds, that the Khedive was ready to part with his shares. Mr. Greenwood had heard the news from a German banker. He had carried the information to Lord Derby, who was not enamoured of the scheme, so Mr. Greenwood went to call on Mr. Disraeli, and Disraeli saw the great advantages that could be reaped if he was able to raise the money.

Parliament was not in session, but "Dizzy" managed to borrow the money from Baron Nathaniel de Rothschild, obtaining the controlling interest in the Suez Canal Company.

What Disraeli really accomplished is a question which is often asked. Queen Victoria's favourite statesman obtained the controlling interest in a commercial company operating a canal which is about eighty-eight nautical miles long, a "ditch" which brings the East three thousand miles nearer to Europe. Despite the aerial communications of to-day, the Suez Canal remains the "vital artery" it was when Disraeli's foresight gave us a lifeline **to India.**

thought the right moment had come, but always something happened which made him change his mind.

One day in the desert, when de Lesseps had given a particularly dazzling performance on a horse, much to the astonishment of the Prince's suite, the Frenchman thought that it was now or never. He had seen a rainbow in the sky that morning, and being of a very superstitious nature, he took that as an omen. He went to the Prince and sat beside him on a divan. He talked about the Sues Canal. Prince Said listened attentively. In a moment, his mind was made up. "I shall do it," he said.

But bitter disappointments were in store for Ferdinand de Lesseps. The concession to build the Canal had been obtained with comparative ease, but there was one clause in the concession which made all the difficulties: it said that the Canal was not to be undertaken until the Sultan of Turkey had given his permission.

There started then many years of intrigue—intrigue which led Ferdinand de Lesseps from Cairo to Constantinople, to Vienna, to Paris, to London, and to and fro from capital to capital, eating his heart out, fighting, begging, pleading, but all in vain. Ferdinand de Lesseps' one implacable enemy was the dour Lord Palmerston, Prime Minister of England. He pooh-poohed the whole Suez Canal scheme; he referred to it as a swindle, and warned his compatriots against putting money into the Frenchman's "bubble." In Vienna, Prince Metternich was slyly behind Ferdinand de Lesseps; the wily old Austrian diplomat tried to make trouble, but there was trouble enough without Vienna adding to it. In Constantinople the Sultan tried to please every-body. He would say neither yes nor no.

The Empress Eugenie played a great part in the building of the Canal, because she, who was a kinswoman of Ferdinand de Lesseps and had a romantic attachment for him, persuaded the Emperor to force the issue with the Sultan, who was still holding back from ratifying the concession Prince Said had granted the Frenchman.

While Lord Palmerston was doing his best to wreck the scheme, the Prince Consort heard that Ferdinand de Lesseps was in Englend. By this time the Frenchman had obtained a certain amount of backing. Business men in the provinces had come to believe that, despite Loard Palmerston's opinions, there might be something in the plan for which de Lesseps was begging support. The Prince Consort persuaded Queen Victoria to invite the Frenchman to Windsor. Loard Palmerston was tremendously angry, but de Lesseps went to Windsor and was received kindly by the Queen. The Prince Consort showed the greatest interest in the Frenchman's scheme.

In Paris the Empress Eugenie was doing her best to persuade the Emperor of the French to push on with de Lesseps' scheme. It seemed that matters were at a dead-lock. England was maintaining her opposition, and the Sultan of Turkey was afraid to defy England and ratify the concession. Prince Said had become frightened because he thought that England would be angry with him.

It seemed that de Lesseps had now practically no friends at all, except the Empress Eugenie. The Emperor, at her instigation, gave orders to the French Consul in Egypt that he should afford all possible support to de Lesseps, and having made peace with Austaria, pressed the Austrians to take Egypt and so annoy England. Austria declined the suggestion, but agreed to support the project for the building of the Canal.

The Company had been formed, but de Lesseps adjourned the first meeting of shareholders because he had not yet firmly secured the support of the Emperor of France. Once that support was secured he went ahead. It must be understood that work was actually started long before de Lesseps had any right to start. The Frenchman defied not only the Sultan of Turkey, but England herself. He recruited twenty thousand labourers. They were called "forced labourers," but they were really nothing else but slaves. This was perhaps not quite so startling at that time as it may sound to-day, because forced labour in the Near East was, even during the early days of Queen Victoria, quite an accepted institution. There were protests, but de Lesseps went ahead with his slaves. He had waited so long to build his Canal, and he was no longer young. He wanted to have his work completed before it was too late.

In Paris the Empress was doing all she could to help him, and she promised that as soon as the Canal was ready, she would go in person to Egypt to declare it open.

On November 18th, 1862, the first section of the Suez Canal was completed. This section was from Port Said to Lake Timsah, a distance of approximately forty-five miles, or half the length of the Canal.

Ferdinand de Lesseps himself performed the opening ceremony. He exclaimed: "In the name

traces of the Amr Canal, one of the several which hundreds of years previously had been dug and abandoned. Bonaparte ordered that all sections of the canal which could be found were to be excavated and linked together by new sections which his military engineers would build, quickly, he hoped, so that the invasion of India might be brought nearer "England's doom was nigh," he said.

All the plans were made for thousands of natives to start wark on the Canal. Napoleon Bonaparte set out for Cairo, but on his way he was met by a messenger who told him that Turkey had declared war on France. The Turkish Army was already marching. The Turkish fleet had joined the British fleet. And so the Suez Canal, so far as Napoleon was concerned, had to remain nothing but a dream.

In 1832, thirty-four years after Napoleon had abandoned his quest, Ferdinand de Lesseps arrived in Alexandria, where he had been appointed Vice-Consul. De Lesseps was then twenty-seven years of age. Owing to an outbreak of cholera in the ship, de Lesseps was unable to go straight to his post; he had to stay some time in quarantine and while idle he read some French books. One of the books sent to him by the French Consul was Lepere's treatise. De Lesseps looked through the book. He became interested; he became more and more interested. He read the book to end, then read it again. He made up his mind that here was a great idea; here was something worthy of a Frenchman's idea, to build a Suez Canal, to begin where Napoleon Bonaparte had left off.

Mathieu de Lesseps, the father of the young diplomat, had served in Egypt for many years, and had left many friends behind him when he returned to France. One of his friends was the all-powerful Mehemet Ali, a very colourful personage. Mehemet Ali was a tobacco merchant who came to Egypt from Macedonia. After making a certain amount of money in the tobacco business, Mehemet Ali drifted into the Army, and very soon became a great soldier.

Mehemet Ali was the Pasha of Egypt. The country belonged to Sultan of Turkey, to whom Mehemet Ali owed allegiance. When Ferdinand de Lesseps called on Mehemet Ali, he was received as a very welcome guest. "Look at me," said the Pasha. "As you see me, I am the man your father made."

Mehemet Ali lived in the great Palace with many wives and a large harem. He had no fewer than fifty children. He liked to talk to de Lesseps about Napoleon Bonaparte. He had been born the same year as the Little Corporal, and it pleased him to think that they were both influenced by the same star. Yet the old man had one great sorrow; he had been forced to fight against his hero. The old Pasha and the young Frenchman used to talk, but de Lesseps was afraid to broach the subject nearest to his heart: the building of Suez Canal.

Ferdinand de Lesseps was clever enough to make a close friend of one of Mehemet Ali's sons, Prince Said. The young Prince was very corpulent, and this was not to his father's liking. Mehemet Ali made his son go without food and treated him with great harshness. When he was in the depths of despair, Prince Said stole away and visited de Lesseps, who treated him with the utmost kindness and, in secret, gave him food. These ties of friendship were to bring the young Frenchman great aid in the future.

Ferdinand de Lesseps remained in Egypt for five years; then he was removed to other posts in Europe and pursued his career in the diplomatic service until he came to grief in Rome. Then he returned, in sudden disgrace, to France, and went to stay with his mother-in-law to help her to manage her estate.

During the intervening years, de Lesseps worked hard on his scheme to build the Canal. Mehemet Ali abdicated and was succeeded by one of his sons. De Lesseps wrote to Egypt and asked his friend the Dutch Consul if the moment was opportune to bring out his scheme for the Suez Canal. The Dutchman replied that the moment was certainly not opportune. De Lesseps went on hoping that one day something would happen to enable him to tell the world what splendours might come from the building of the Canal.

Then one day a letter arrived from Cairo to tell him that his old friend, Prince Said, had now succeeded his brother on the throne and hoped that de Lesseps would come and visit him. In great glee, the Frenchman set out on his second journey to Egypt.

Ferdinand de Lesseps tells in his autobiography how he felt when he landed the second time as an honoured guest. Prince Said sent his own servants to wait upon the Frenchman; he had not forgotten the days when he was a hungry boy and when de Lesseps was so kind to him. De Lesseps waited for the moment when he could lay before his old friend a memorandum he had prepared on the subject ot the Suez Canal. Every now and again he

WHO STARTED THE SUEZ CANAL?

By: H. J. GREENWALL

The world probably owes to Napoleon the fact that there is a Suez Canal to-day. For though the quest for a canal across the Isthmus of Sues is an ageless story—some of the Pharaohs planned and even dug—it was Napoleon who took the decisive action which led to the great achievement.

It was he who invaded Egypt for the purpose of making Suez a stepping-stone for the invasion of India. Fate and fortune did not favour Napoleon in this instance. But as a direct result of his enterprise Ferdinand de Lesseps was, thirty years later, inspired to begin operations.

The link between Napoleon and de Lesseps was another French-man, Lepere, who on the orders of Napoleon wrote a book. This book, a treatise on the possibility of building a canal across the Isthmus, fell into the hands of de Lesseps, when in 1832 he was a young French diplomat in Alexandria, and this formed the germ of an idea which was ultimately crowned with success.

In 1798 Napoleon received orders to go to Egypt and to smash the English. Then he was to have the Canal built, and when this was accomplished, he was to make an attempt to invade India.

After many difficulties, Napoleon's army managed to reach Cairo. Here was much work to be done, but once this was accomplished Napoleon began writing letters to Josephine begging her to join him. She would not. Napoleon, in a moment of pique, became enamoured of the wife of one of his lieutenants, and his dalliance with her caused him to delay his plans for the invasion of India, and not for several weeks did he decide to set out for Suez and plan the Canal. With a column of troops, the Little Corporal marched across the desert and eventually arrived at Suez, a loathsome village where there was nothing but dirt and disease and miserable natives who had been robbed and plundered for years. Napoleon's troops accupied the Biblical land of Goshen.

To-day, a hundred and forty three years since Napoleon went to Suez, the port is a prosperous city. When Napoleon saw it, it was nothing but a deserted harbour; sand had drifted in from the Red Sea; no ship could approach the harbour any more. For three centuries it had been so but before that Suez had been relatively rich. Bonaparte turned diplomat, and called the headmen os Suez to him and promised them better times.

While Napoleon was talking to the chiefs, professors were digging, trying to find something which might remain of the ruined canal built by the Pharaohs. The professors found nothing. There and then, Napoleon ordered Lepere to start work on his treatise; but Lepere worked too hurriedly, and he made a great mistake. He thought that the Red Sea was thirty feet higher than the Mediterranean. In point of fact, the two seas have approximately the same level. The importance of the mistake lies in the fact that if, as Lepere thought, there was a difference of thirty feet between the two levels, locks would have to be built, and this would have immensely complicated the digging of the Canal. About 1825, an English-man, Lieutenant Waghorn, found that Lepere was wrong.

Curiously enough, there is no record whatsoever of how Lieutenant Woghorn made this discovery. Public opinion then was apathetic, and few cared whether Lepere was right or wrong.

Bonaparte left Lepere working out his report on the projected canal, and with the *Savants* whom Napoleon's soldiers had named "the Egyptian donkeys," Bonaparte set out for the desert to look for traces of ancient canals. The professors were sceptical; Bonaparte insistent. The soldier proved to be right; he found what he was looking for,

Prayer is the application of want to Him who alone can relieve it, the voice of sin to Him who alone can pardon it. It is the urgency of poverty, the prostration of humility, the fervency of penitence, the confidence of trust. It is not eloquence, but earnestness, not figures of speech, but compunction of soul.—H. Moore

Wheresoever the search after truth begins, there life begins. Wheresoever that search ceases, there life ceases.—Ruskin

No man can hinder our private address to God: every man can build a chapel in his breast, himself the priest, his heart the sacrifice, and the earth he treads on the alter.—J. Taylor

Do you wish to find out the really sublime?
Repeat the God's Prayer.—Napolean Bonaparte

Our prayers should be for blessings in general, for God knows best what is good for us.

Had I been a nightingale, I should have sung the songs of a nightingale, or had I been a swan the songs of a swan., but being a reasonable being, it is my duty to hymn God.

The God's prayer contains the sum total of religion and mo„als.—Willingdon

Mercy is an attribute to God Himself, and earthly, power doth show then likest God's when mercy seasons justice.—Shakespeare

A heather Philosopher once asked a Christian —"Where is God?" The Christian answered—"Let me first ask you—Where is he not"?—Frances

Ringing, singing on its way,
The World revolved from night to day,
A voice, a chime,
A chant sublime,
Of peace on earth, good-will to men.-Longfellow

The first duty of every man in the world is to find his true master and for his own good submit to him, and to find his true inferior, and for that inferiors good conquor him.—Ruskin

I found Him in the shinning of the stars.
I marked Him in the Flowering of His fields.
Thou wilt not leave us in the dust:
Thou madest man, he knows not why,
He thinks he was not made to due:
And thou hast made him. Thou art just.-Tennyson

The gift of prayer is not always in our power.
—Lessing
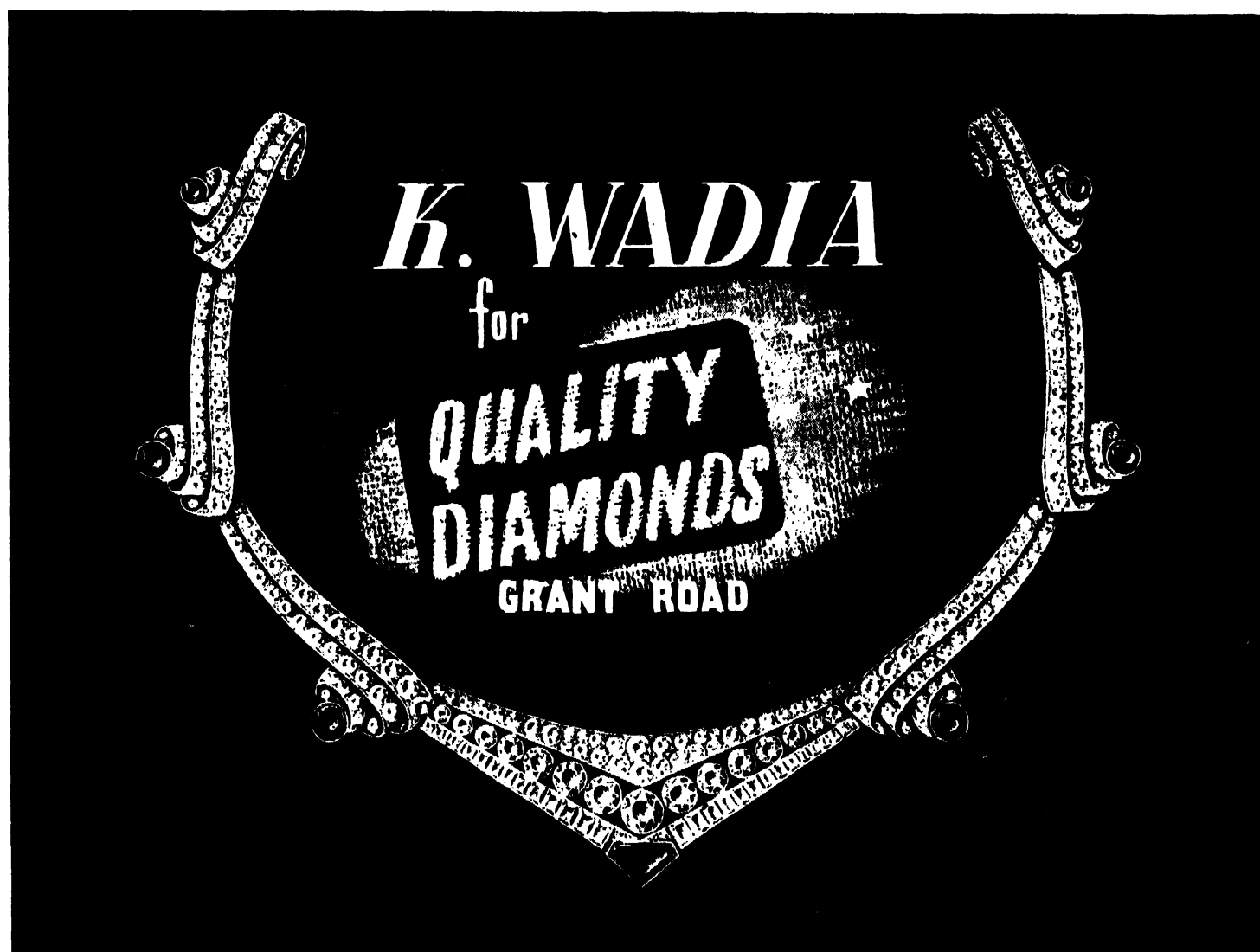
GOD AND PRAYERS

SELECTED BY:

JAMSHED MERWANJI DARUVALLA

No creature can be satisfactory and permanent substitute for God., but God can be more than a satisfactory and permanent substitute for every creature.—Dr. Davis

Farewell? Farewell? but this I tell
To thee, thou wedding-guest,
He prayeth well who loveth well,
Both man, and bird, and beast.—Coleridge

In the morning this is a golden key to open the heart for God's service, and in the evening it is iron lock to guard the heart against sin.-Secker

Heaven is the magazine wherein God puts
Both good and evil, prayer's the Key that shuts
And opens this great treasure: 'tis a key
Whose words are *Faith*, and *Hope*, and *Charity*.

Father of light and life? thou God Supreme?
O teach me what is good? teach me Thyself?
Save me from folly, vanity, and vice,
From every low pursuit? and feed my soul
With knowledge, conscious peace, and virtue pure,
Sacred, substantial never fading bliss.-Thomson

When prayer mounts upon the wing of fervour to God, then answers come down like lightning from God.—W. Secker

He that cometh to God, must believe that He is, and that He is a rewarder of them that deligently seek him.—St. Paul

God is near you, is with you, is within you, a sacred Spirit dwells within us, the observer and guardian of all our evil and our god......there is no good man without God.—Seneka

Let every man study his progress, and read his duty in his petitions. For the body of our prayer is the sum of our duty., and as we must ask of God whatsoever we need, so we must labour for all that we ask.—Beyard

Nor to thyself the task shall be
Without reward, for thou shalt learn
The wisdom early to discern
True beauty in utility.—Longfellow

In all things the world, the men who look for crooked will see the crooked, and the men who look for the straight, will see the straight.—Ruskin

The greater thy business is, by so much the more thou hast need to pray for God's goodspeed and blessing upon it, seeing it is certain nothing can prosper without his blessing. The time spent in prayer never hinders, but furthers and prospers a man's journey and business., therefore, though thy haste be never so much or thy business never so great, yet go not about it, nor out of thy doors, till thou hast prayed.—Bishop Bayley

It is better to walk in the dark with God,
Than to walk alone in the light,
It is better to walk with Him by faith
Than walk alone in sight.
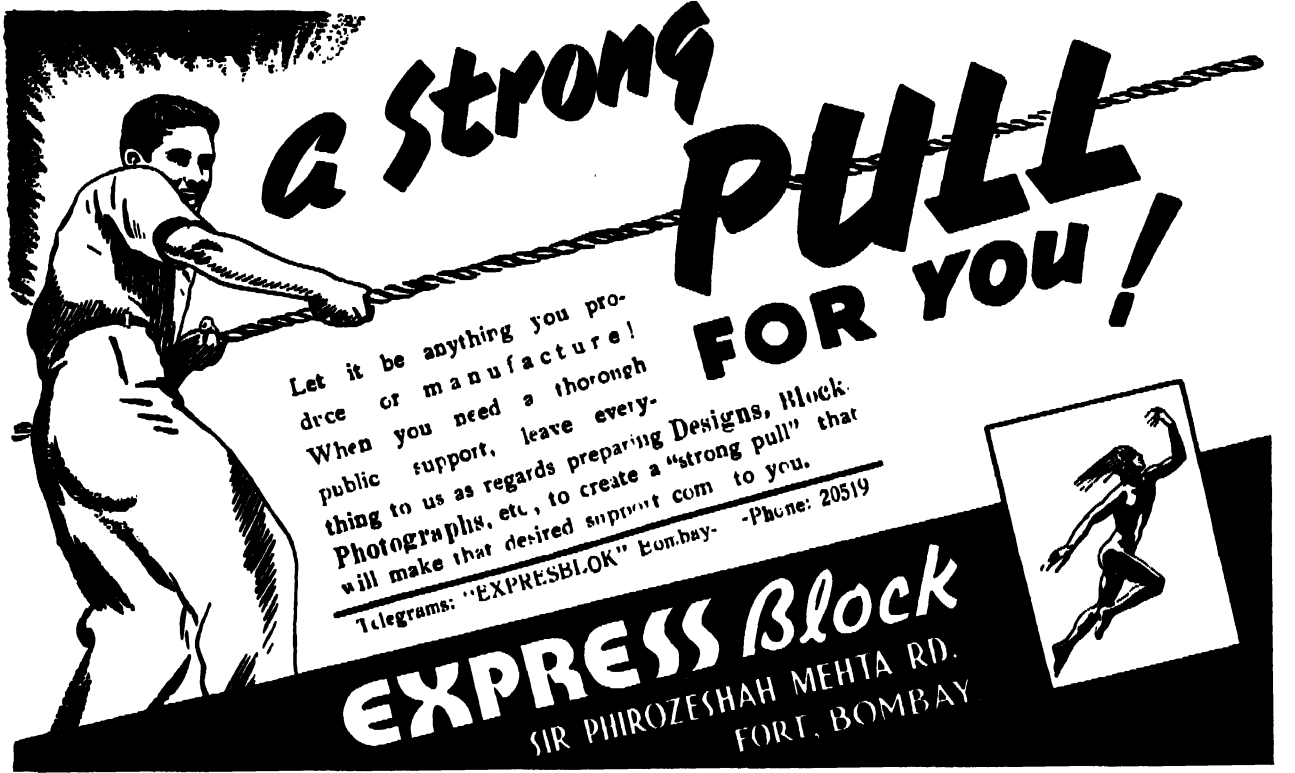
Prayer ardent open heaven, lets down a stream
Of glory on the consecrated hour
Of man, in audience with the Deity.,
Who worships the great God, that instant joins
The first in heaven, and sets his foot on hell.
—Young

More things are wrought by prayer., than this world dreams of. Wherefore let thy voice rise like a fountain for me night and day.—Tennyson

It is not truth nor philosophy to say that prayer alters nothing, that the laws of nature are fixed, and that entreaty cannot change them. The laws of nature are fixed on purpose to be used for the granting of prayer. Any man can use the laws of nature to grant the requests of his child. Does he say that God, who made those laws cannot do as much with them as he can?—Beecher

a Strong PULL FOR YOU!
Let it be anything you produce or manufacture! When you need a thorough public support, leave everything to us as regards preparing Designs, Block Photographs, etc, to create a "strong pull" that will make that desired support com to you.
Telegrams: "EXPRESBLOK" Bombay- -Phone: 20519
EXPRESS Block
SIR PHIROZESHAH MEHTA RD.
FORT, BOMBAY

SURAJMAL LALLUBHAI
& CO
jewellers
PHONE: 22236

RAMOLA in Fazli Bro's Ltd's MASOOM
A Superme Film Distributors Release

RANJIT STAR

MADHURI

IN

SASURAL

AT OPERA HOUSE

ISMAILI P PRESS, BOMBAY, 9.

ing. No longer did the Emperor commission his staff of artists to produce gigantic illustrated manuscripts The artists ceased to be a department of Government as they had formed during the lifetime of Akbar. Jehangir's practice was to take his artists about with him in his travels to Lahore and Kashmir, and whenever he saw a rare flower, or a bird of brilliant plumage, or considered an incident worthy of being recorded, the artists were summoned and a painting ordered to be made. A large number of such paintings—some of which are of an extremely high merit—were incorporated as illustrations in the memoirs of the Emperor. For Jehangir was following the example of his great-grandfather, Babar, in keeping a diary of events, and the memoirs of Jehangir are extremely interesting. One passage from the memoirs of Jehangir may be quoted:

"On the tenth of the month of Dai in the neighbourhood of the Pargana of Rahimabad the huntsmen brought in news of a lion. I ordered Iradat Khan and Firdai Khan to take with them some of the guards and surround the woods and mounting an elephant I followed them and went towards the hunt. From the number of trees and the thickness of the jungle it could not well be seen. Driving the elephant forward the lion's flank came into view and with one wound from my gun he fell and gave up his life. Of all the lions I have shot from the time I was a prince until now, I never saw a lion like this for size and majesty and the symmetry of its limbs. I ordered the artists to take its portrait according to its real form and body.'

Portrait painting too reached a very high standard in the reign of Jehangir. We have portraits of Jehangir himself showing how he looked at every age from the time he came to the throne till his death. There is one famous portrait of Jehangir made late in life, perhaps a couple of years before his death. It is an incomplete sketch; but the Emperor's character is placed before us with a master's skill: the upturned eyebrow, the cruel mouth, the strong neck, the glint in the eyes. It is clear that the artist did not feel called upon to flatter the Emperor, and this redounds to the credit of Jehangir. Portraits, not only of the Emperor, but of most of the great noblemen of the Empire, still exist, making us familiar with the faces of a large number of the ministers and generals of Jehangir and of the nobles who assembled in the Diwan-i-Khas during the reign of his son.

The reign of Shah Jehan was a period of great artistic effort in the Mughal Empire. During the half century of peace and prosperity that had preceded the accession of Shah Jehan to the throne, untold wealth had accumulated at the capital of the Mughal Empire. The Fort of Agra, the Taj and innumerable lesser buildings were constructed. Shah Jehan was, however, not as interested in painting as his father or grandfather, and from the end of his reign the art of painting declined. A new technique, the Siah Qalam was, however, developed and perfected in his reign. The Siah Qalam, as its name implies means drawing in black outline only, and we have a large number of portraits of great beauty painted during the reign of Shah Jehan in black outline and ornamented with a touch of gold.

With the accession to the throne of the strict Aurangzeb, painting was almost banished from the Mughal Court. There are, it is true, a number of excellent portraits of Aurangzeb, yet neither the standard nor the volume of the painting of the two previous reigns was maintained. With the death of Aurangzeb, the Mughal Empire crumbled up. The decay of power in the Court affected the arts as much as anything else. Nevertheless, the Delhi style of painting has continued almost to the present day. In these later times artists had been confining their attempts to the copying of old Samters. But even the old masters were not always available to them, as the Imperial libraries had been looted time after time, and their choicest gems carried away to different parts of India and a large number distributed amongst the collections of Europe. Even during the lifetime of Aurangzeb the main interest for the student of painting lies not with "Mughal painting," but with the schools of painting developed at the Courts of the Rajput princes and in the Punjab and Kashmir valleys, which have come to be known as "Rajput" schools. These styles of painting are so distinctive both in their origins and development that they do not fall within our present subject.

taswir. His Majesty, (that is Akbar) from his earliest youth, has shown a great predilection for this art, and gives it every encouragement, as he looks upon it as a means, both of study and amusement. Hence the art flourishes, and many painters have obtained great reputation. The works of all painters are weekly laid before His Majesty by the Daroghas and the clerks: he then confers rewards according to excellence of workmanship, or increases the monthly salaries. Much progress was made in the commodities required by painters, and the correct price of such articles were carefully ascertained. (This is characteristic of Akbar, Akbar the artist does not forget that he is also Akbar the man of business.) The mixture of colours has especially been improved. The pictures thus received a hitherto unknown finish. Most excellent painters are now to be found, and master-pieces, worthy of a Bihzad, may be placed at the side of the wonderful works of the European painters who have attained world-wide fame. The minutenesss in detail. the general finish, the boldness of excution etc, now observed in pictures, are incomparable; even inanimate objects look as if they had life. More than a hundred painters have become famous masters of the art, whilst the number of those approaching perfection, or of those who are middling, is very large. This is especially true of the Hindus: their pictures surpass our conceptions of things. Few, indeed, in the whole world are found equal to them.

"The number of master-pieces of painting increased with the encouragement given to the art. Persian books, both prose and poetry, were ornamented with pictures, and a very large number of paintings was thus collected. The Story of Hamzah was represented in twelve volumes, and clever painters made the most astonishing illustrations for no less than one thousand and four hundred passages of the story. The Chingiz-nama, the Zafar-nama, this book, the Razm-nama, the Ramayan, the Nal Daman, the Kalila and Daimna, the Ayar-i-Danish, etc., were all illustrated. His Majesty himself sat for his likeness, and also ordered to have the likeness taken of the grandees of the realm. An immense album was thus formed; those that have passed away, have received a new life, and those who are still alive, have immortality promised them.

"In the same manner, as painters are encouraged, employment is held out to ornamental artists, gilders, line-drawers, and pagers.

"Many Mansabdars, Ahadis, and other soldiers, hold appointments in this department. The pay of foot soldiers varies from 1200 to 600 dams."

Akbar died in 1605 A. D., and for twenty-two years after 1605, Jehangir was Emperor at Delhi. During his reign Mughal painting reached its zenith. This was due not only to Jehangir's own aesthetic sense, but also to the legaey of the well organised and well trained staff of artists, that his father had left. There was also a change in the subject of the pictures and in the method of work-

Humayun was followed on the throne of Delhi by the four Emperors,—Akbar, Jehangir, Shah Jehan and Aurangzeb. The first, Akbar, was not only a great general, a great administrator and a great politician, but also the real creator of the Mughal school of painting. All that Akbar did was systematic and sustained and in his characteristic manner he set about organising and training his staff of Court artists. The artists brought by Humayun from Persia formed the nucleus of the school. A separate building was allotted to the artists, where they daily assembled to work. In accordance with the Hindu element, he selected what he could find of indigenous talent, and placed it under the guidance and supervision of the masters whom his father had brought from Persia. To become an artist in those days was no easy matter. An aspirant to the profession of painting had first to learn how to polish ordinary paper with a smooth stone, till its surface became like a mirror and was ready to receive the painting. Then the colours had to be prepared, the different ingredients mixed and ground, till they were reduced to a suitable consistency, and gum added so that they might stick to the surface of the paper. Finally camel and foxes hair was collected and brushes and pens of different fineness made.

From its very commencement the painting at the Mughal Court was definitely Indian, and in no sense can it be called Persian. This is notwithstanding that its two chief masters were two Persians, Mir Sayyid Ali and Khwaja Abdus Samad. Akbar cast the spell of his own personality on the art of which he was the patron. There still existed in Hindustan and Rajputana painters of a school that had produced the frescoes of Ajanta. The force of Akbar's character fused Persian technique and tradition with this local school and evolved the Mughal school of painting. The paintings produced in Akbar's time were vigorous, and, though inferior in finish to those made during the reigns of his son and grandson, of equal artistic merit. The commissions set by Akbar to his staff of painters were colossal, and much collaboration in painting became necessary and was practised. Certain artists painted only the figures, others the faces, others the fore and back-ground. A point of great interest in the early painting of Akbar's time, is the visible effort of Hindu artists to express themselves in the Persian technique and of the imported artists to Indianise their style. These efforts were not always completely successful. The gulf between the Indianised Persians and the Persianised Indians continued almost to the end of Akbar's reign. It was only in the reign of Jehangir that the Mughal style developed itself into a harmonious whole.

Abul Fazl the famous minister and friend of Akbar, and author of the Ain-i-Akbari, a book giving an account of the life and times of Akbar, has devoted a chapter to calligraphy and painting, and what he writes of painting is of great interest:

"Drawing the likeness of anything is called

phere of Persia and the atmosphere of Mesopotomia. The formal symmetry, the bold thick lines full of expression, the movement in the composition, the dull but deep colours of the Mesopotamian school of painting give place to bright blues and light greens, a fairy like treatment of trees, conventional rocks and mountains, and buildings more like jewel boxes than things of bricks and tiles.

Bihzad was really the culmination of the school of painting that is known by his name. With the death of Sultan Husain Mirza, another dynasty, that of the Safavids, came into power and ruled at Isfahan for nearly two centuries and a half. The reign of the Safavids corresponds with the rise of Shi'ism and mysticism in philosophy and poetry began to make its influence felt on painting. The Safavid style of painting is marked by its richness of colour and wealth of drawing. Though the technique and motifs are the same, yet the new style is very different from the puritan style of Bihzad. It was in this overluxuriance that Persian painting ultimately found its grave. For a century or more Persian painters continued to produce pictures of more or less artistic merit, but its downward course had commenced with the introduction of this style of painting.

These two styles of Persian painting, the style of Bihzad which immediately preceded and the Safavid which was contemporaneous with Mughal painting had great influence on the art of the Court of Delhi. So much so, that the Mughal style was long considered to be merely a sub-school of the Persian schools of painting. But more careful study shows that while there is a superficial similarity, the spirit of Mughal painting had its birth in influence other than those exerted by the styles practised on the other side of the Hindu Kush ranges.

The word Mughal is very loosely applied, but the painting at the Court of the Timurid and Safavid Sultans of Persia is not called Mughal. In strictness the Court and the school of painting at Delhi are the Mughal Court and the Mughal school of painting. About the year 1525 A. D. when Bihzad was dying, Zahiruddin Babar, that prince of adventures, swept down from Kabul with a handful of followers and captured the throne of Delhi. Babar was succeeded on the throne by his son Humayun who was to have his own adventures. Humayun had hardly ascended the throne when he was defeated by the Afghan, Sher Shah, and had to fly to Persia to the Court of Shah Tahmasp, the second Safavid. In what proved to be his interregnum, while he was waiting for an opportunity to reconquer the throne of Delhi, Humayun made friends with the artists at the Court of Shah Tahmasp, and in particular with two painters, Mir Sayyid Ali and Khwaja Abdus Samad, who followed him to India when fifteen years later he regained the kingdom of Delhi. These two: Mir Sayyid Ali and Khwaja Abdus Samad, were the first masters of the school of Mughal painting in India.
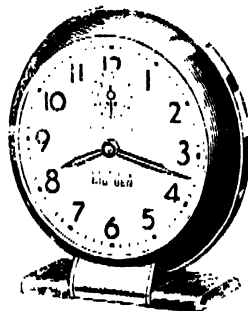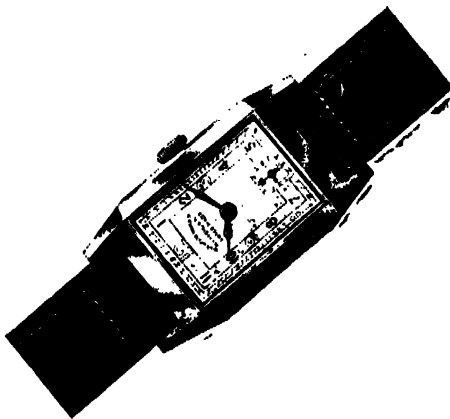
space has been filled. These similarities confirm the close affinity between Byzantine art and the Arab art of Mesopotamia. The paintings which form the illustrations of the Hariri are crude and rough, but there is much in them of interest (apart from their similarity to Byzantine art) and worthy of admiration. There is vigour in the drawing; the lines are bold; and there is expression in the faces and gestures.

There is little painting preserved of this comparatively early period of Islam, and whatever there is, is crude and rough in comparison with examples of subsequent ages. It is now impossible to definitely determine whether, at the Court of Bagdad, painting ever became more refined and elaborate than in these illustrations of Hariri's travels. But artists of Bagdad may have produced, their work except for these few examples has perished. The Hariri manuscript was prepared sometime about the year 1225 A. D. Twenty-five years later, the Islamic world was over whelmed by a calamity which has perhaps no parallel in the history of the world. Urged by some obscure impulse, the Central Asian tribes known as the Tartars or Mongols, suddenly burst southwards under the leadership of their Khans, the most famous of whom was Chengiz. Plundering, burning and destroying, they turned Persia into a desert and captured Bagdad. In a day its palaces and bazaars were looted and razed to the ground, the libraries containing thousands of books and the works of all the great writers of the world, burnt, and the Bagdad of Haroun-ar-Rashid turned into the Bagdad of today with its swamps and malaria.

The culture of Bagdad was destroyed, but Persia with its more fertile soil evolved a new culture. For about a hundred years it remained a part of the Mongol dominions, and from this time onwards all connection between the main current of Islamic painting and Byzantine painting was cut off, and the dominating influence on Eastern Islamic art was the influence of China. About the year 1370 A. D., there arose a mighty figure amongst the Mongol chiefs in Prince Timur or Tamerlane (a Turk by race), from whom the line of Mughal Emperors of Delhi takes its descent. Timur's Empire stretched from the Mediterranean to the shores of the Pacific and from India to the confines of European Russia. We have no records as to whether Timur himself took any active interest in painting, but we know that at his capital Samarqand, he gathered together the greatest poets, architects and artists of the Eastern world, and made Samarqand a city worthy of being the capital of his vast empire. After Timur's death his empire was divided amongst his sons who continued to patronise the arts. The height of the Mongol style of persian painting was reached at the Court of Sultan Husain Mirza, Timur's great-grandson. The reign of Sultan Husain Mirza, who ruled at Khorasan during the last quarter of the 15th Century, is comparable with that of Queen Elizabeth of England. At his Court there assembled great poets, great philosophers, and great historians—above all Bihzad, the painter, than whom no person has exercised greater influence on the art of his own age.

Between the style of painting represented by Bihzad and the Mesopotamian school of painting as illustrated by the Hariri manuscripts there is a great difference, a difference that the mere lapse of three hundred years could not have produced. Much no doubt may be explained by the fact that Mesopotamian painting was under the influence of the art of the Eastern Roman Empire, while the Mongol school of painting derived its technique from and copied the motifs of Chinese painting. But the difference is really the difference between the atmos-

Mughal Painting And Its Origins

By: S. F. B. TYABJI, M.SC., LL.B.

Mughal painting has now become a well known expression having a definite meaning to European critics interested in Eastern art. It signifies the painting of the school developed and practised at the Court of the five Mughal emperors: Humayun, Akbar, Jehangir, Shah Jehan and Aurangzeb, and subsequently at and near Delhi almost to the present day. Perhaps no facet of the culture that was evolved at the Mughal Court is so interesting, and so immediately repays study, as this style of painting. Not only has it all the strength and weakness of Mughal culture, but it also faithfully mirrors the vicissitudes in the fortunes of its Imperial patrons who reigned at Delhi, Agra and Lahore. Mughal painting was long considered to be a mere offshoot of the Persian school, and in German and French books it is still described under the chapter headed 'Persian painting.' But though it is now generally accepted that the Mughal style cannot be regarded merely as a provincialised form of Persian painting, and recognized that the orginality and force of character of the Emperor Akbar was to a large extent responsible for its creation, it is still both interesting and instructive, and, to obtain a proper perspective, almost necessary, to know something of earlier Islamic art, and to acquire at least a casual acquaintance with the paintings of Isfahan, Samarqand and Khorasan.

Mughal painting had many difficulties and impediments of its own to surmount; but there were two impediments which it shared with the art of painting all over the Islamic world. Orthodox Islam had followed Judaism in setting its face against pictorial representations of any kind. It was, therefore, impossible for painting to receive in any Islamic country that patronage and encouragement on which it thrived in other countries. But even with those sultans and patrons who interpreted the law of the Quran in a more liberal or a less rigid spirit, the art of calligraphy was considered a nobler and finer art, and in their estimation and favours painting took only a secondary place. As a result of this original injunction against painting, and its subsequent subordination to calligaphy, painting, was almost exclusively confined to the illustrating of inanimate or imaginary subjects; and portrait painting was evolved almost for the first time at the Court of Jehangir.

Painting was first practised in Islamic countries in Mesopotamia when Bagdad was still the capital of Islam. Mesopotamian painting had little or no influence on Mughal painting. Yet a slight digression may be permitted to describe the art that was practised during the reign of the Abbaside Caliphs. One of the best known examples of this, the earliest stage of Islamic painting, is the Hariri manuscript in the National Library at Paris, which describes the travels and adventures of one, Al Haris. They are very similar to those of Sindbad, the Sailor. The manuscript was probably inscribed and its pictures painted in Bagdad, some six hundred years after the death of the Prophet. Within a few years of his death, which took place in the year 632 A.D., Mesopotamia, Syria, Egypt and Persia had been over run by Arab generals, and the frontiers of the Eastern Roman Empire were reached. From 750 A. D., to 1250 A. D., when the Abbaside Caliphs, amongst whom was the famous Haroon-ar-Rashid, reigned at Bagdad, there was almost uninterrupted and intimate contact between Bagdad and Byzantium, the seat of the Eastern Roman Empire. From Byzantium the Arabs got not only the learning and philosophy of the Greeks, but also their first lessons in the art of painting. And this is abundantly clear from the illustrations in the Hariri manuscript. For instance, those who have seen the Byzantine mosaics in the Cathedral of St. Mark at Venice, will find a similarity in these drawings and the mosaics, particularly in the flowing treatment of the drapery, in the rounded features and easy attitudes of the subjects, and in the symmetry with which

H. H. THE AGA KHAN AND SEPARATION OF SIND

By: MAHOMED HASHIM GAZDER, M.L.C., B.E., A.M.I.E. (KARACHI).

Looking at the present political situation in Sind and the disintegration of the Muslim political parties as well as want of cohesion amongst the Muslims, the following article written some time before by Mr. Gazdar shows under what circumstances its separation from the Bombay Presidency was decided. Great hopes were entertained that the Sindhis—Muslims and Hindus both, once the problem was finally settled would try their utmost to make it an ideal atonomous province and do all in their power for its future progress and welfare and how these hopes have not been fully realized is a matter that can well be imagined than described.—*Editor.*

At the time when I first entered politics, the Muslims of our province were confronted with a gigantic problem. It loomed so large on the political horizon that it eclipsed all others. Naturally I soon found myself in the whirlpool of the controversy that was being raged round the problem of separation of Sind from the Bombay Presidency.

There were two schools of thought on the question of Sind separation. As those who advocated it were chiefly Muslims and those who opposed it were Hindus, unfortunately the question of Sind separation assumed a communal colour. It would merely be the statement of truth that the Muslims of Sind are backward in every respect as compared with their Hindu brethren. The result was inevitable: the clamour of Muslims for separation appearing as a mere feeble voice, while Hindu opposition was persistent, systematic, and well organised and financed in a measure beyond anticipation.

Long and bitter were those days of uncertainty for Muslims. Fears were freely expressed by Muslim leaders that Hindu opposition would triumph, and the future prosperity of autonomous Sind would remain a grand but unfulfilled dream.

With eyes of entreaty and solicitude Muslims of Sind began to scan the horizon for some such Muslim leader who would carry the struggle for separation to a succesful close. We had not to wait long. His Highness the Aga Khan was appraised of the benefits that would accrue to Sind after separation. He gave the problem a close and careful consideration. Finally we learnt to our great relief and good fortune that he was convinced beyond the shadow of doubt that separation of Sind would spell its future progress and prosperity to all Muslims and Hindus alike.

Ever since that day we knew that our cause was in safe hands. The most startling propaganda of the anti-separationists failed to unnerve us. If I may be permitted to take the reader behind the scenes of the Sind Azad Conference, I would tell him that during the private sittings of the Working Committee each and every Sindhi Muslim leader expressed his belief that as long as the Aga Khan was working for separation we had no cause to worry. Then came that day of rejoicing when Sind Separation was accepted in principle and subsequently confirmed by Parliament.

Small wonder then that I was anxious to meet that person who alone can be said to have won for us provincial independence. This opportunity came when I was in Bombay attending the Legislative Council sessions. Muslim members of the council were giving a dinner in honour of the Aga Khan. This was the first occasion when I came into personal contact with him. But that was enough to leave a life long impression on my mind. I atonce realised that I was face to face with a great personality who can discuss with perfect ease any topic under the sun with a knowledge of the subject that is almost uncanny and his great talents as statesman are unsurpassed.

I took the very first opportunity of thanking him for his untiring efforts for separation. I said that we Sindhis would be pleased and proud if he came to our province as its first Governor. The reply was brief but full of meaning. For, said the Aga Khan: "My friend ! I have no desire to be a Governor; but I am a Governor-maker." That was my first meeting with him. I have had my good fortune since then, because I have met him on several occasions and every meeting with him has increased my great respect and regard for him as a leader of all India in general and Muslims in particular.

'AL-ISLAH'

I DESIRE NOTHING BUT REFORM SO FAR AS I AM ABLE—Al-Coran

1st Sawwal 1360 A.H.

IDD NUMBER

23rd October 1941

Hon. Editor: ALIJAN MISKIN

ISLAM

WHEN hearts made soft by love
Shall turn again to prayer,
There comes a heavenly solace
To those in dark despair.

With heartfelt prayer and patience
We reach that home of peace,
To dwell in Unity with God
Whose love doth never cease.

Such is the Muslim's faith
In God, our blessed Protector,
Our all-sufficient God of love,
Our Lord, our great Creator.

MOBARIKAH ALICE WELCH

All praise is due to Allah,
Lord of the Worlds,
The Merciful, the Compassionate,
Lord of the Day of Judgment,
Thee only do we serve;
Thee only do we ask for help,
Guide us in the perfect path,
The path of those,
whom Thou do'st bless;
Not the path of those,
who meet Thy wrath;
Nor those, who go astray.

WILLIAM BASHIR-PICKARD, B.A. (CANTAB.)

HUSNABANU In Sudersan's SAJJAN

NATIONAL'S STAR

SARDAR AKHTAR

IN

ITS FORTHCOMING

NAI ROSHNI

ISMAILI P. PRESS, BOMBAY, 9

Combine the two and your theatre will have the distinction of offering the most brilliant pictures and the finest lifelike sound reproduction . . Let these two outstanding developments by RCA build bigger box office "takes" for you.

Exclusive Authorised Dealers for
Madras Presidency, C. P. & C. I. & Bombay Presidency

FAMOUS PICTURES LIMITED

BOMBAY BHUSAVAL BANGALORE

Photophone Equipments Ltd.,

PHOTOPHONE HEADQUARTERS,
9, MARINE LINES, BOMBAY.